مستنصر حسین تارڑ
بے عزتی خراب
PDFBOOKSFREE.PK

بے عزتی خراب

مُستنصر حُسین تارڑ

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

فہرست

میرے والد صاحب کی پھولوں والی پہاڑی

کشمیر کے لیے میں ان دنوں بہت دُکھی ہوتا ہوں......

عجیب بدقسمت خطہ ہے کہ جنت نظیر کہلاتا ہے......اسے ایران خورد کا نام دیا جاتا ہے......اس کی خوبصورتی بے مثل ہے......سرزمین بھی خوبصورت اور لوگ بھی ایسی رنگت اور نین نقش کے......کوہ قاف کے باشندے بھی رشک کریں لیکن اس کے نصیب بُرے ہیں......دو ملکوں نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا رکھا ہے اور وہ انا اور ہٹ دھرمی کے شکنجے میں آیا ہوا سانس بھی نہیں لے سکتا......آہستہ آہستہ مر رہا ہے......جھیل ڈل میں لنگر انداز ہزاروں ہاؤس بوٹس ویران پڑی ہیں......کاروبار ٹھپ ہو چکے ہیں......معیشت برباد ہو چکی ہے......ہر جانب ہندوستانی فوج کے پہرے ہیں اور کوئی ایک گھرانہ ایسا نہیں جس کا کوئی نہ کوئی فرد آزادی کے لیے شہید نہ ہوا ہو......عجیب خطہ ہے۔

میرا جی چاہتا ہے کہ میں آج اس کا سفرنامہ بیان کروں......میں صرف پانچ برس کا تھا جب میں کشمیر گیا تھا......ایک بار دیکھا تو دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہی رہی......میرے والد محترم زراعت کے کاروبار سے منسلک تھے......سری نگر کے قریب انہوں نے پھولوں کے بیج تیار کرنے کا ایک فارم بنا رکھا تھا اور وہ موسم گرما وہیں گزارتے تھے......ایک مرتبہ میرے ماموں جان نے چند دوستوں کے ہمراہ کشمیر جانے کا پروگرام بنایا تو میں نے بہت ضد کی کہ مجھے بھی ساتھ لے چلیں...... پانچ برس کی عمر کیا ہوتی ہے لیکن میرے ذہن کے پردے پر کچھ تصویریں نقش ہیں جو میں آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔

سیالکوٹ سے نندا بس سروس کی ایک بس سری نگر جا رہی ہے جس کا ڈرائیور سکھ ہے......جموں کا شہر گزرتا ہے جو بہت گرم اور ویران سا ہے۔

درّۂ بانہال کے دامن میں بس کے تمام مسافر رات گزارتے ہیں' اگلے روز ہماری بس درّۂ کی پُر پیچ سڑک پر بلند ہو رہی ہے...... شنید ہے کہ اب وہاں ایک سرنگ تعمیر کردی گئی ہے اور وادیٔ کشمیر تک پہنچنے کے لیے درّۂ بانہال کا راستہ متروک ہو چکا ہے...... درّے کو عبور کر کے جب ہم دوسری جانب پہنچتے ہیں تو نظروں کے سامنے ایک بہت ہی وسیع سرسبز و شاداب ملک دکھائی دیتا ہے جو بالکل ہموار ہے...... سڑک کے دونوں جانب دُور تک سفیدے کے درخت ہیں جن کے درمیان میں ہماری بس چلتی جا رہی ہے...... ٹھنڈک ہے...... بادل ہیں اور میرے ماموں مجھے ایک سویٹر پہنا دیتے ہیں...... پچھلے پہر ہم ایک عجیب دلنشین شہر سری نگر پہنچتے ہیں' جو ایک وسیع جھیل کے کنارے آباد ہے...... مکان زیادہ تر لکڑی کے ہیں...... جھیل ڈل میں خوش نظر شکارے تیرتے ہیں اور ایک جزیرے پر مہاراجہ کا محل دکھائی دے رہا ہے...... جھیل کے کناروں پر لکڑی کے بڑے بڑے مکان لنگر انداز ہیں' جنہیں ہاؤس بوٹ کہتے ہیں...... ایک مقام پر جھیل میں سے ایک چھوٹی سی ندی نکل رہی ہے جو دریائے جہلم کا آغاز ہے۔

ہم اپنے فارم پر جاتے ہیں اور وہاں جہاں تک نظر جاتی ہے' وہاں تک ڈہلیا کے پھولوں کی ایک فصل ہے اور وہ اتنے بڑے بڑے ہیں کہ ایک پانچ سالہ بچہ اگر صرف ایک پھول تھامتا ہے تو اس کے بازو بھر جاتے ہیں...... فارم کا ہندو منیجر ہمیں کشمیری چائے پلاتا ہے اور پھر ایک گلدان میں دو پھول سجا کر کہ اس میں صرف دو ہی سما سکتے ہیں' مجھے پیش کر دیتا ہے۔

جھیل ڈل میں ایک شکارا تیرتا جا رہا ہے...... شالیمار باغ کی جانب...... میرے ماموں اور ان کے دوست شکارے کے درمیان میں اس کی چھت تلے بیٹھے خوش گپیوں میں محو ہیں اور میں اس کے آخر میں شکارے کی نوک پر بیٹھا مزے سے آم کھا رہا ہوں...... جھیل کا پانی اتنا شفاف ہے کہ اس کی تہہ میں اُگے ہوئے بوٹے اور بیلیں دکھائی دے رہی ہیں...... میں آم کی گٹھلی پانی میں پھینکتا ہوں تو ان بوٹوں اور کنول کے ڈنٹھلوں کے درمیان میں پوشیدہ سینکڑوں سرخ رنگ کی مچھلیاں نکلتی ہیں اور گٹھلی کے گرد ہو جاتی ہیں اور اسے تہہ تک نہیں جانے دیتیں...... اب یہ میرے لیے ایک کھیل ہے...... میں آم کے چھلکے پانی میں پھینکتا ہوں تو وہ سینکڑوں مچھلیاں ہمارے شکارے کے پیچھے پیچھے چلی آتی ہیں۔

جھیل کی سطح پر ہزاروں گلابی کنول کھلے ہیں...... ان کے پتوں کے تھال پانی پر بچھے ہیں اور ہمارا شکارا ان میں سے راستہ بناتا تیرتا جاتا ہے...... میں ذرا جھک کر ایک کنول پیالے کو ہاتھ ڈالتا ہوں...... اسے بمشکل توڑتا ہوں پھر کنول کے ایک بڑے پتے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑتا ہوں اور یہ نہیں جانتا کہ اس کا ڈنٹھل جھیل کی تہہ تک جاتا ہے...... یکدم ایک جھٹکا سا لگتا ہے اور میں جھیل میں گرتے گرتے بچتا ہوں یا شاید گر جاتا ہوں اور مجھے نکال لیا جاتا ہے' مجھے اچھی طرح یاد نہیں...... ماموں مجھے سرزنش کرتے ہیں اور اپنے پاس بٹھا لیتے ہیں...... مجھے سمجھ نہیں آتی کہ اگر یہ کنول جھیل کی تہہ میں سے آ رہے ہیں تو وہیں کیوں نہیں کھل گئے' اوپر سطح پر آ کر کیوں کھلے ہیں۔

شالیمار باغ میں فوارے چل رہے ہیں...... گھنے درخت اور پھول ہیں...... تختہ در تختہ وہ باغ جھیل کے پانیوں تک پہنچ رہا ہے لیکن مجھے اپنے لاہور کا شالیمار زیادہ اچھا لگتا ہے...... زیادہ خوبصورت لگتا ہے' اگرچہ وہ اس کی نقل ہے۔

کوئی مقام چنن واڑی نام کا ہے...... ہم ایک لکڑی کے دو منزلہ مکان میں ٹھہرے ہوئے ہیں...... صبح سویرے مکان سے نکل کر میں اخروٹ کے ایک گھنے درخت پر ایک بندر کی طرح چڑھ جاتا ہوں اور کچے اخروٹ چھیل کر ان کا گودا کھانے لگتا ہوں جو بے حد مزیدار ہے...... واپسی پر ماموں جان جھڑکتے ہیں کہ کہاں چلے گئے تھے اور اخروٹ کھا کر آئے ہو؟ میں ڈرتے ہوئے جھوٹ بولتا ہوں کہ نہیں ماموں جان......! اور وہ ایک تھپڑ رسید کر دیتے ہیں کہ جھوٹ بولتے ہو...... اخروٹ کے کچے چھلکے نے میرے ہونٹوں کو رنگ دیا ہے...... یہ دنڈی کا وہ سنگ ہے جسے ہونٹوں پر مل کر گاؤں کی ٹمیار تعویذوں والا نوجوان موہ لیتی ہے۔ ماموں جان مجھے گل مرگ لے کر نہیں جاتے اور میں پنجاب ہوٹل کی کھڑکی سے جھیل ڈل کو دیکھتا رہتا ہوں۔

وہ مجھے پہلگام لے جاتے ہیں جس کی تیز ندی پر ابھی تک برف کا ایک پُل ہے...... ہم گھوڑوں پر سوار اسے پار کر کے اوپر ایک جنگل میں جاتے ہیں جہاں ایک بہت بڑے اور گہرے کنوئیں کے قریب ایک بوڑھا رہتا ہے جو بتاتا ہے کہ یہاں اس کا گھر تھا اور ایک رات ایک دھماکہ ہوا اور پورا گھر زمین میں دھنستا ہوا غائب ہو گیا...... میں اس کنوئیں

میں ایک پتھر پھینک کر آواز کا انتظار کرتا ہوں...... آواز نہیں آتی۔

اور جب ہم لاہور واپس آتے ہیں تو یہاں اتنی گرمی ہے کہ تانگوں کے گھوڑے مر رہے ہیں' تالاب سوکھ گئے ہیں...... درجنوں افراد جن میں بچے بھی شامل ہیں' ہلاک ہو گئے ہیں اور میں گرمی سے نڈھال اپنے بدن پر نکلے ہوئے گرمی دانے کھجاتا روتا ہوا کہتا ہوں...... ''مجھے کشمیر واپس جانا ہے۔''

اور اب ایک ایسا قصہ جو ہمیشہ مجھے آبدیدہ کر دیتا ہے...... میرے والد رحمت خان تارڑ ایک مرتبہ کشمیر جا رہے ہیں...... ایک پہاڑی کے قریب بس چائے کے لیے رُکتی ہے...... وہ پہاڑی ویران ہے...... میرے والد زمین کے عشق میں مبتلا مٹی کرید کر سونگھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ مٹی زرخیز ہے' یہاں پھول اُگ سکتے ہیں...... اگلے برس وہ مختلف پھولوں کے بیجوں کی ایک پوٹلی اور ایک کُھرپا ساتھ لے جاتے ہیں...... بس اسی مقام پر رکتی ہے تو وہ چائے پینے کی بجائے اس پہاڑی پر کُھرپے سے جگہ جگہ مٹی کھودتے ہیں اور وہاں بیج دباتے چلے جاتے ہیں...... بس کا سکھ ڈرائیور انہیں پاگل سمجھتا ہے کہ یہ دراز قامت' سرخ و سفید' نیلی آنکھوں والا نوجوان کیا کر رہا ہے...... وہ بار بار ہارن بجاتا ہے کہ نیچے آ جاؤ' دیر ہو رہی ہے اور وہ نوجوان اشارے کر رہا ہے کہ ابھی آتا ہوں...... والد صاحب وہ تمام بیج پوری پہاڑی پر بو کر نیچے آ جاتے ہیں...... والد صاحب کا کہنا ہے کہ جب اگلے برس وہ وہاں سے گزرے تو پوری پہاڑی پر رنگ برنگے پھول لہلہا رہے تھے اور وہ اس گل و گلزار سے ڈھکی ہوئی تھی۔

ہمیشہ سے یہ میرا خواب رہا ہے کہ میں پھر کشمیر جاؤں اور اس پہاڑی کو دیکھوں...... کیا اب بھی وہاں میرے باپ کے ہاتھوں کے لگائے ہوئے پھول بہار پر ہیں یا بارود کی بُو نے انہیں مار ڈالا ہے۔

بہت عرصہ پہلے جب میں نے یہ قصہ اپنے محترم بزرگ اور دوست ادیب جناب غلام الثقلین نقوی کو سنایا تو وہ آبدیدہ ہو گئے' کیونکہ ان کا تعلق بھی کشمیر سے تھا...... انہوں نے لکھا ''ممکن ہے کہ امید کی ایک کلی اب بھی اس پہاڑی پر زندہ ہو اور کیا یہ ممکن نہیں کہ مستنصر حسین تارڑ میرا بازو تھام کر مجھے اس پہاڑی تک لے جائیں اور ہم اس ایک

کلی کی خوشبو سونگھ سکیں' ان کے والد کی روح ان کے استقبال کے لیے وہاں موجود ہو گی اور درّۂ بانہال پر میرے والد کی روح میرے انتظار میں اور ہم سب مل کر اس کھوئی ہوئی جنت میں داخل ہوں گے اور پھر تارڑ اس صدی کا سب سے بڑا سفرنامہ تحریر فرمائیں گے...... کیا یہ ممکن ہے؟''

یہ ممکن نہ ہوا کیونکہ غلام الثقلین نقوی پچھلے برس انتقال کر گئے لیکن اب بھی یہ میرا خواب ہے کہ میں والد صاحب کے پھولوں والی پہاڑی تک پہنچوں...... وہاں نقوی صاحب کی روح بھی موجود ہو اور پھر ہم سب مل کر اس کھوئی ہوئی جنت میں داخل ہوں...... کیا یہ ممکن ہے؟

کون زیادہ بولتا ہے... عورتیں یا مرد؟

پہلے تو دبئی کی جانب سے ایک نہایت خوشگوار عدالتی فیصلے کی خبر آئی جس میں بتایا گیا تھا کہ وہاں کی ایک عدالت نے نظریۂ ضرورت کے تحت بیویوں کو زدوکوب کرنے کی اجازت دے دی ہے اور اب کنگروؤں کے دیس آسٹریلیا سے ایک ایسے عدالتی فیصلے کی نوید آئی ہے جس نے مردوں کے دل باغ باغ کر دیئے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ایک خاوند نے عدالت میں اپنی بیوی کے خلاف ایک درخواست دی کہ یہ نیک بخت بے حد باتونی ہے...... بولنے پر آتی ہے تو سارا سارا دن بولتی رہتی ہے اور مجھے اس کے بولنے پر اعتراض نہیں لیکن یہ زبان بے حد نامناسب استعمال کرتی ہے یعنی گالیاں وغیرہ بھی دیتی ہے...... ویسے بہت اچھی ہے اور میں اسے طلاق نہیں دینا چاہتا صرف اس کی زباں بندی چاہتا ہوں' چنانچہ مؤقر عدالت نے فیصلہ دیا کہ آئندہ ایک برس تک یہ خاتون اپنا منہ بند رکھے اور صرف شدید ضرورت کے تحت بولے...... یعنی مجھے بھوک لگی ہے' کھانا دو یا مجھے اپنی ماں کے پاس جانا ہے وغیرہ...... فیصلے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ زباں بندی پر پوری طرح عملدرآمد کرنے کے لیے اگر خاتون کے منہ پر ٹیپ چسپاں کر دی جائے تو کوئی حرج نہیں۔

پاکستان میں بھی عورتیں بہت بولتی ہیں اور اگر یہاں بھی اس آسٹریلوی فیصلے کو لاگو کر دیا جائے تو خواتین کی اکثریت کے منہ پر ٹیپ چسپاں نظر آئے...... اگرچہ یہاں خواتین کو یہ شکایت ہے کہ مرد زیادہ بولتے ہیں...... کیا تہذیب یافتہ ہونے کے لیے زیادہ باتیں کرنا شرط ہے یا کم بولنے والی اقوام زیادہ ترقی کرتی ہیں۔

ویسے یورپ میں بھی زیادہ ترقی یافتہ اقوام جرمن' انگریز اور سویڈش وغیرہ کم بولتے

ہیں اور ہسپانوی اور اطالوی تو بول بول کر دماغ کھا جاتے ہیں شاید اسی لیے ترقی نہیں کر سکے۔

البتہ مشرق میں زبان زیادہ چلتی ہے...... داستان گو اور کہانیاں سنانے والے ہمارے ہاں ہی پائے جاتے تھے لیکن ایک زمانے میں انہی سے عقل و دانش سیکھی جاتی تھی اور دُور دیس کی خبریں حاصل ہوتی تھیں۔ اب بھی ہمارے بلوچ بھائی جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو سب سے پہلے کہتے ہیں "سائیں! حال دیجئے۔" اور سائیں وہاں سے شروع کرتے ہیں جہاں سے ان کی آخری ملاقات ہوئی تھی اور اس وقفے کے دوران رونما ہونے والے تمام واقعات پیدائش' موت' جھگڑے' بیاہ شادیاں اور بیماریاں تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ یہ بیان کر کے پھر وہ دوسرے فریق سے کہتے ہیں کہ "سائیں! اب اپنا حال دو" اور وہ سائیں بھی ایک طویل داستان شروع کر دیتا ہے...... میں ایک بلوچ دعوت میں بھوک سے تقریباً فوت ہونے کو ہوا تھا کیونکہ چھ سات بلوچ باری باری اپنا حال بیان کرتے رہے تھے اور جب مجھ سے پوچھا گیا کہ سائیں اب آپ حال دو...... تو میں نے کہا تھا "میرا تو حال برا ہے...... اب پلیز کھانا کھلا دیں۔" ویرانوں اور صحراؤں میں یہ "حال" دراصل معلومات اور خبریں پہنچانے کا ایک وسیلہ ہے...... یعنی وہاں کا میڈیا ہے...... اخبار' ریڈیو اور ٹیلیویژن ہے۔

ویسے میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو سمجھتے ہیں کہ خواتین زیادہ باتیں کرتی ہیں...... مرد حضرات بھی ان سے کچھ کم نہیں...... بس ففٹی ففٹی سمجھ لیجئے...... مثلاً میرے ایک جاننے والے ہیں جو شاید...... اور اس کا کوئی ثبوت تو نہیں ہے لیکن امکان غالب ہے کہ صرف سوتے ہوئے ہی چپ ہوتے ہیں ورنہ مسلسل باتیں کرتے ہیں...... ان سے غلطی سے پوچھ لیا جائے کہ اشفاق بھائی آپ نے بوٹ بہت اچھا پہن رکھا ہے تو وہ اپنی زندگی کے پہلے بوٹ سے بات شروع کریں گے جو انہوں نے نرسری میں داخل ہونے پر پہنا تھا اور پھر ان تمام بوٹوں سے ہوتے ہوئے جو انہوں نے ریٹائرمنٹ تک پہنے تھے اور ان تمام موچیوں اور شو سٹورز کے تذکرے کے ساتھ جہاں سے یہ بوٹ خریدے گئے تھے...... بالآخر شام تک اپنے موجودہ بوٹ تک پہنچیں گے اور اس دوران پانی پیتے ہوئے یا کھانا کھاتے ہوئے بھی وہ اپنی بوٹ داستان میں خلل نہیں پڑنے دیتے۔

اسی طرح پارک میں چنیوٹ کے ایک شیخ جی سیر کرنے کے لیے آتے ہیں...... نہایت بھلے آدمی ہیں لیکن لطیفے سنانے کے شوقین ہیں اور ان کا لطیفہ اتنا طویل ہوتا ہے کہ پانچ کلومیٹر کا ٹریک ختم ہوجائے گا لیکن ان کے لطیفے کا انجام نہیں آئے گا اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر خوش قسمتی سے لطیفہ اسی صبح ختم ہوگیا ہے تو نہایت بھولپن سے کہیں گے۔ ''اوہو تارڑ صاحب! یہ تو میں نے کوئی اور لطیفہ سنا دیا ہے...... اب سنئے وہ والا جو دراصل میں سنانا چاہتا تھا۔'' چنانچہ اب ان کے دوست تھوڑے سے بدتمیز ہوگئے ہیں اور جونہی وہ لطیفہ سنانے کا اعلان کرتے ہیں ہر جانب بھگدڑ سی مچ جاتی ہے...... لوگوں کو کام یاد آنے لگتے ہیں...... بچوں کو سکول چھوڑنا یاد آجاتا ہے یا اوہو شیخ جی میرا خیال ہے میں کار کا ایک دروازہ کھلا چھوڑ آیا ہوں ابھی چیک کر کے آتا ہوں اور بے چارے شیخ جی منتیں کرتے ہیں کہ نہیں نہیں آج چھوٹا سا لطیفہ سناؤں گا اور پھر کوئی نہ کوئی دوست ان پر ترس کھا کر رک جاتا ہے اور بعد میں اپنے آپ پر ترس کھاتا ہے۔

لیکن یہ بیان باتوں کا کچھ یکطرفہ ہو رہا ہے...... کچھ خواتین کا بھی تذکرہ ہو جائے جو باتیں کرنے میں ید طولیٰ رکھتی ہیں...... اسی پارک میں ہمارے ایک دوست اداکار کی بیگم آتی ہیں...... پھرکی کی طرح پورے پارک کی خواتین میں گھوم جاتی ہیں اور پل بھر میں سب کو خبر ہوجاتی ہے کہ کن بیگم صاحبہ کی شوہر سے کھٹ پٹ ہوئی ہے...... کس کے بیٹے کی منگنی کہاں ہوئی ہے اور کیوں ٹوٹ گئی ہے...... کس کے میاں نے کل دوپہر کے کھانے پر بھنڈیاں کھانے سے انکار کر دیا تھا اور کس نے آج اپنی بہو کا سوٹ پہنا ہوا ہے۔

ایک اور جوڑا ہے...... میاں دراز قد ہیں اور بیگم نسبتاً چھوٹے قد کی ہیں...... بیگم منہ اٹھا کر میاں سے مسلسل باتیں کرتی چلتی جاتی ہیں اور میاں سامنے دیکھتے رہتے ہیں...... میں نے آج تک ان کے میاں کو کوئی بات کرتے یا آنکھیں جھکا کر انہیں ایک نظر دیکھتے نہیں دیکھا...... وہ ان کی مسلسل باتوں سے ہی اندازہ لگا لیتے ہیں کہ بیگم پیچھے نہیں رہ گئی ساتھ ساتھ چلی آتی ہے...... ایک خاتون کا کہنا ہے کہ پارک میں داخل ہوتے ہوئے اگر ان کا میاں ان کے دائیں جانب چلنے کی بجائے غلطی سے بائیں جانب چلنے لگے تو وہ اس کا بازو پکڑ کر فوراً دائیں جانب لے آتی ہیں کیونکہ سر اٹھا کر میاں کی جانب دیکھتے ہوئے باتیں کرنے سے ان کی گردن اسی زاویے پر سیٹ ہوگئی ہے اور اسے بائیں جانب گھمانا ممکن نہیں رہا۔

پرانے زمانے میں خصوصی طور پر دیہات میں باتیں کرنا عورتوں کی واحد تفریح ہوا کرتی تھی...... میں نے اگر کہانی بیان کرنا یا کرداروں کی تفصیل بیان کرنا تھوڑا بہت سیکھا ہے تو اپنی بڑی خالہ جان سے سیکھا ہے...... ان سے اگر پوچھ لیا جاتا کہ خالہ جان آپ کو چوہدری قادر بخش کی ساتویں بیٹی کی شادی یاد ہے تو وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتیں اور تیس برس پیشتر چوہدری قادر بخش کی ساتویں بیٹی کی شادی کی تفصیل یوں بیان کرتیں جیسے ان کے سامنے اس کی فلم چل رہی ہو...... دولہا والوں کی جانب سے آنے والی سو ڈیڑھ سو خواتین میں سے ہر ایک نے کون سے گہنے پہنے ہوئے تھے...... لباس کس رنگ کے تھے...... ان کی جانب سے جو مٹھائی آئی تھی اس میں چینی کی شرح کتنی تھی اور باراتیوں نے کتنے من دودھ پیا تھا اور ان میں سے کتنے فوری طور پر کھیتوں کی جانب بھاگے تھے کیونکہ کسی لڑکی نے شرارت سے دودھ میں جمال گھوٹا ملا دیا تھا...... یہی خالہ جان جب ہمیں ملنے کے لیے لاہور آتیں تو اکثر آدھی رات کے وقت انہیں کچھ ہول سا اٹھتا اور وہ میری والدہ کو جھنجھوڑ کر اٹھاتیں اور کہتیں ''نواب بیگم اٹھ...... باتیں کریں'' اور والدہ بھی نہایت اشتیاق سے فوراً اٹھ بیٹھتیں اور جب ہم اگلی صبح بیدار ہوتے تو وہ باتیں کر رہی ہوتیں۔

میں نے کچھ دیر پہلے اپنی بیگم سے پوچھا۔ ''کیوں بھئی مرد زیادہ باتونی ہوتے ہیں یا عورتیں......؟'' وہ کچھ بولی نہیں میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''کیا بہری ہوگئی ہو...... سنتی نہیں؟'' تو اطمینان سے کہنے لگی۔ ''پچھلے اکتیس برس میں تم نے مجھے جتنے سفرنامے، کالم، کہانیاں اور ناول سنائے ہیں تو میں نے بہری ہی ہونا تھا۔''

تو پھر کیا فیصلہ ہوا کہ مرد زیادہ باتیں کرتے ہیں یا عورتیں......؟

میرا بھی ایک جشن منا دے!

ان دنوں لاہور میں جسے بھی فون کریں معلوم ہوتا ہے کہ جشن منوانے گیا ہوا ہے۔

ایک صاحب مجھ سے ایک کتاب ادھار لے کر گئے تھے اور اس مقولے پر عمل کرتے ہوئے کہ جو کتاب ادھار دیتا ہے وہ بیوقوف ہوتا ہے اور جو کتاب ادھار لے کر واپس کر دیتا ہے اس سے بڑا بیوقوف ہوتا ہے۔ انہوں نے بڑا بیوقوف بننے کی بجائے میری کتاب ہضم کر لی۔ چنانچہ میں نے تنگ آ کر ان کے گھر فون کیا تو ان کی بیٹی سے بات ہوئی۔ میں نے کہا۔ ''بیٹی جی! ابو جی سے بات کرا دو۔''

''ابو جی تو جشن منوانے گئے ہوئے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''جشن؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''کس قسم کا جشن؟''

''پتہ نہیں انکل...... ان کو امریکہ والوں نے دعوت دی تھی کہ آپ آئیں ہم آپ کے ساتھ جشن منانا چاہتے ہیں...... انہوں نے تو اخبار میں بھی خبر لگوائی تھی آپ نے نہیں پڑھی......؟''

''نہیں بیٹے۔'' میں نے اپنی کم علمی کا اظہار کیا۔ ''لیکن ان کے ساتھ کس سلسلے میں جشن منایا جا رہا ہے......؟''

''یہ بھی پتہ نہیں انکل...... بس یہ پتہ ہے کہ امریکہ اور یورپ سے جو شاعر وغیرہ پاکستان آتے رہتے ہیں ناں تو ابو ان کی دعوتیں کرتے تھے۔ چڑیا گھر لے کر جاتے تھے اور دوستوں سے کہہ کر اخباروں میں تصویریں چھپواتے تھے تو انہوں نے دعوت دی تھی کہ ادب کی ترویج کے لیے جو آپ کی گرانقدر خدمات ہیں ان کے سلسلے میں ہم آپ کے ساتھ جشن منائیں گے۔''

کچھ اسی طور پاک ٹی ہاؤس میں میز پر چائے کے برتن لگاتے ویٹر میرے کان میں سرگوشی کرتا ہے۔ ''چوہدری صاحب...... وہ جو سامنے والی ٹیبل پر نہیں بیٹھتے تھے مرزا صاحب...... آج کل امریکہ گئے ہوئے ہیں ان کے ساتھ جشن منایا جا رہا ہے۔''

''کون سے مرزا صاحب؟'' میں ذرا پشیماں ہو کر پوچھتا ہوں کہ میں کسی مرزا صاحب کو نہیں جانتا۔

''وہ سامنے والی میز پر بیٹھتے تھے...... شاعری بھی کرتے تھے...... امریکہ میں کوئی ایسا چکر چلایا کہ انہوں نے بلا لیا...... سنا ہے انہیں پانچ ہزار ڈالر کا انعام بھی مل رہا ہے جو شاعرِ شکاگو ان کو ذاتی طور پر دیں گے۔''

میں اپنے آپ کو کوستا تھا کہ تف ہے مجھ پر کہ ادب کا طالب علم ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں اور اس شاعر بے بدل کے نام تک سے آگاہ نہیں جس کے ساتھ امریکہ میں جشن منایا جا رہا ہے' ابھی میں اپنے کو کوسنے سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ ویٹر نے ایک اور سرگوشی کی۔ ''چوہدری صاحب آپ کے ساتھ جشن کوئی نہیں مناتا؟ آج کل تو اس ادیب کی کوئی عزت ہی نہیں جس کے ساتھ جشن نہ منائے جائیں۔ کچھ بھاگ دوڑ کریں امریکہ نہ سہی ادھر سعودی عرب اور قطر وغیرہ میں تو کام بن ہی جائے گا......''

چند روز پیشتر ایک ادبی رسالے کی خاتون مدیرہ کے ہاں رات کا کھانا تھا...... اور وہ بھی یہی شکایت کر رہی تھیں کہ ان دنوں جسے فون کریں اطلاع ملتی ہے کہ ان کا تو امریکہ میں جشن ہو رہا ہے۔

پہلے تو کبھی میرے ذہن میں اس قسم کا خیال نہیں آیا تھا لیکن پے در پے اس قسم کی خبروں سے میرے اندر ایک احساس محرومی نے جنم لیا کہ کہیں مجھ پر وہ وقت نہ آ پڑے جب لوگ مجھ پر انگلیاں اٹھانے لگیں کہ دیکھو یہ وہ ادیب جا رہا ہے' جس کے ساتھ آج تک ایک جشن بھی نہیں منایا گیا۔ مرے کو مارے شاہ مدار کے مصداق اس جلتی پر تیل انتظار حسین نے ڈال دیا...... انتظار صاحب یوں بھی جلتی پر تیل ڈالنے میں ایکسپرٹ ہیں۔ ایک محفل میں کہنے لگے۔ ''تارڑ صاحب آپ پاکستان میں کیا کر رہے ہیں۔ آپ کے ساتھ کوئی جشن نہیں منایا جا رہا؟'' میں نے کہا۔ ''انتظار صاحب آپ بھی

تو ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیکار بیٹھے ہیں۔ آپ ہمارے سینئر ہیں آپ کا کچھ نہیں ہوا تو ہمارا کیا ہوگا۔"

"بھئی اس میں سینئر جونیئر کا کوئی سوال نہیں اور نہ ہی اچھے یا برے ادیب ہونے کا سوال ہے۔ بلکہ سرے سے ادیب ہونے کا بھی کوئی سوال نہیں' کیونکہ ایں سعادت بزور بازو است۔"

چنانچہ انتظار صاحب کے ساتھ اس گفتگو کے بعد تو میں دن رات اس آگ میں جلنے لگا کہ ہائے کوئی آئے اور مجھے جشن منانے کے لیے لے جائے بے شک بھائی پھیرو ہی لے جائے۔ اپنی اس حالت کو دیکھ کر مجھے ایک دوست یاد آئے جو بڑی سنجیدگی سے اپنے دیگر دوستوں سے فرمائش کرتے تھے کہ "یارو! تم کہیں میری لَو میرج کروا دو۔" ہم انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے کہ حضور لَو میرج کروائی نہیں جاتی' ہو جاتی ہے۔ آپ کو اگر میرج کروانی ہی ہے تو اپنے والدین اور عزیزوں سے رجوع کیجئے لیکن وہ یہی رٹ لگاتے رہتے کہ نہیں میں ارینجڈ میرج نہیں کرواؤں گا کہ اس میں کوئی رومانس نہیں ہے۔ میری تو لَو میرج کروا دو۔ کسی طرح بھی کروا دو...... چنانچہ میں نے ارادہ کر لیا کہ اپنے قریبی دوستوں سے گزارش کروں گا کہ میرا کہیں جشن منوا دیں۔ اُن سے گزارش کی تو انہوں نے بھی ٹکا سا جواب دیا...... ایک دوست کہنے لگے کہ...... "میاں اس کے لیے بھی لَو میرج کی طرح خود ہی کوشش کرنی پڑتی ہے اور تمہارے یہ لچھن ہی نہیں رہے شروع سے......"

"ہاں...... بس نادانی ہو گئی اب پچھتا رہا ہوں۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب ادب کے ایک بیوپاری نے مجھے فون کر کے کہا تھا کہ بھئی ناروے سے کسان کھاروی آئے ہوئے ہیں' تین روز لاہور میں قیام رہے گا باقی سب کھانے تو بک ہو چکے ہیں صرف ایک ناشتہ بچا ہے وہ تم کر لو...... میں نے بیوقوفی کی اور کہا کہ یار میں تو ان حضرت کے نام سے بھی واقف نہیں انہیں اپنے گھر میں کیسے بلا لوں۔ اس پر وہ یار بہت ناراض ہوئے اور کہنے لگے میں نے تو دوستی نبھانے کی خاطر یہ ناشتہ تمہارے لیے سنبھال رکھا تھا ورنہ لوگ تو سفارشیں کر رہے ہیں کہ ہم حضرت کسان کھاروی کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ تم ناشتہ کر دیتے تو اگلے برس ٹکٹ آ جاتا اور جشن کا اہتمام بھی ہو جاتا......"

اس پر وہ قریبی دوست متاسف ہوئے۔ "تم نے اس قسم کی مزید حماقتیں بھی کی ہوں گی۔"

"ہاں ایک اور حماقت یاد آتی ہے......" میں شرمندگی میں گویا ڈوب گیا۔ "ایک اور صاحب لندن میں مقیم ایک متمول "ادیب" کے پاکستان میں واحد نمائندے تھے۔ انہوں نے آفر لگائی کہ آپ ان کی کتاب پر ایک مبسوط مقالہ تحریر کیجئے ہم آپ کو لندن کی سیر کرا دیں گے جہاں اس کی افتتاحی تقریب ہو رہی ہے۔ میں نے وہ کتاب پڑھی تو اتنی بیہودہ تھی کہ مجھے مالیخولیا ہو گیا چنانچہ انکار کر دیا......"

"اور اب پچھتاتے ہو؟" میرے دوست نے چہک کر کہا۔

"ہاں......!"

"اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت......"

تو صاحبو! اب میں پچھتا رہا ہوں اور چڑیاں امریکہ میں جشن منوا رہی ہیں...... جدہ' قطر' شکاگو اور نیویارک میں جشن منائے جا رہے ہیں۔ مجھے تو عدنان سمیع کا وہ گانا یاد آ رہا ہے کہ تیری اونچی شان ہے مولا...... میری عرضی مان لے مولا' مجھ کو بھی تو لفٹ کرا دے۔ کوٹھی بنگلہ کار دلا دے...... کیسے کیسوں کو دیا ہے۔ ایسے ویسوں کو دیا ہے۔ مجھ کو بھی تو لفٹ کرا دے۔

تو اب اپنا جشن منوانے کی ایک ہی صورت ہے کہ یہ گانا الاپنے لگوں۔ البتہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ الاپنے لگوں...... اس کی معنویت پر غور کیجئے گا۔

۔ تیری اونچی شان ہے مولا...... میری عرضی مان لے مولا...... میرا بھی تو جشن کرا دے۔ چار نہیں تو ایک کرا دے۔ کیسے کیسوں کا کیا ہے۔ ایسے ویسوں کا کیا ہے۔ میرا بھی اک جشن کرا دے۔

※※※※※※※※※※

آج کل کتے پر کتا ایجاد ہو رہا ہے!

مجھے یقین نہ آیا کہ یہ وہی بیگ صاحب ہیں۔
اگر یہ بیگ صاحب ہیں تو یہ کس قسم کے بیگ صاحب ہیں۔
یقیناً یہ بیگ صاحب ہی ہیں لیکن یہ کس قسم کی گفتگو کر رہے ہیں۔

کیونکہ وہ کمپیوٹر' انٹرنیٹ' ای میل' وائس چیٹ وغیرہ کے بارے میں ایک ایکسپرٹ کی مانند گفتگو کر رہے تھے اور گفتگو کرتے کرتے تھکتے نہ تھے۔ وہ سانس لینے کے لیے رُکے تو میں نے موقع غنیمت جانا اور فوراً دخل در کمپیوٹر ہو گیا۔ "بیگ صاحب ذرا رُکیے۔ آپ تو دنیا میں ہونے والی ہر نئی ایجاد کے خلاف تھے یہاں تک کہ ٹیلیفون کے بھی خلاف تھے۔ آج آپ کو کیا ہو گیا ہے آپ اتنی ٹیکنیکل گفتگو کر رہے ہیں اور نہایت پر جوش انداز میں کر رہے ہیں...... آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

وہ ذرا شرمندہ ہوئے اور کہنے لگے۔ "میں نے اپنا نظریہ بدل لیا ہے۔"
"اتنا زیادہ بدل لیا ہے کہ کمپیوٹر کو بھی پسند کرنے لگے ہیں؟"
"کمپیوٹر تو میری جان ہے تارڑ صاحب۔"

واقعی بیگ صاحب نے اپنا نظریہ بدل لیا تھا۔ اور وہ نظریہ کیا تھا جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ ہر نئی ایجاد کے خلاف ہونا...... اپنے گھر اور اپنے بچوں کو جہاں تک ممکن ہو ہر نئی ایجاد سے بچانا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہر میکانکی شے انسان کو قدرت سے دُور لے جاتی ہے۔ اس کی انسانیت کو کم کر دیتی ہے۔ بندوق وغیرہ کو انہوں نے بڑی مشکل سے قبول کیا تھا' ورنہ کہتے تھے کہ اصل مردانگی تلوار سے لڑنا ہے۔ اور یوں' مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی' پر شدت سے یقین رکھتے تھے۔ گھر میں ایئر کنڈیشنر نہیں لگوایا تھا کہ اس میں

سونے سے زکام ہو جاتا ہے اور پٹھے کمزور ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی موسم تخلیق کرتا ہے۔ اس کی بجائے خس کی چکوں کو ترجیح دیتے تھے اور گرمیوں کی دوپہروں میں ان پر پانی ڈالتے تھے اور پھر جلدی سے کمرے میں جا کر سو جانے کی کوشش کرتے تھے۔ اولاد ذرا بڑی ہوئی تو انہوں نے زبردستی ایک کمرے میں ایئر کنڈیشنر لگوا لیا لیکن بیگ صاحب اس کمرے میں نہ جاتے تھے اور خس کی چکوں پر ہی قناعت کرتے تھے۔ یہ نہیں کہ بیگ صاحب بالکل قدامت پسند تھے اور جدید معاشرے کو ناپسند کرتے تھے۔ نہیں، وہ ایک کامیاب بینکر تھے اور نئے دور کی معاشیات پر گہری نظر رکھتے تھے لیکن کسی بھی نئی ایجاد پر وہ بدک جاتے تھے اور اسے قبول کرنے سے انکاری ہو جاتے تھے۔ ایک عرصے تک اپنے باورچی خانے میں مصالحہ پیسنے کے آلات کو بین کیے رکھا اور بیگم کو ہر کھانے کے لیے کونڈی میں مصالحہ کوٹنے پر مجبور کیا کہ بجلی کے آلات سے ذائقہ جاتا رہتا ہے۔ ان کی مانند بیگم بھی جب عمر رسیدہ ہوئیں تو انہوں نے ایک روز کونڈی ڈنڈہ ان کے سامنے رکھا اور کہا کہ قدرتی ذائقے کا اتنا ہی شوق ہے تو مصالحہ خود کوٹا کرو۔ انہوں نے بڑے شوق سے یہ چیلنج قبول کیا لیکن دو تین بار یہ ڈیوٹی دینے کے بعد ریٹائر ہو گئے اور کچن میں بجلی کے آلات استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ البتہ مائیکرو ویو چولہے پر پابندی جاری رکھی لیکن نئی ایجادات سے مسلسل الرجک رہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ کسی بھی نئی ایجاد پر مجھ سے خفا ہو جاتے اور مجھے کٹہرے میں کھڑا کر دیتے، جیسے یہ سب میرا قصور ہو...... کچھ عرصہ پہلے جب "ورچوئل پیٹ" نامی ایک کمپیوٹرائزڈ کتا ایجاد ہوا جس کا سائز چاندی کے بڑے روپے جتنا ہوگا تو بیگ صاحب مجھ پر برس پڑے۔ "بھئی یہ کیا بے ہودہ شے ایجاد کر دی ہے تم نے۔ کئی رنگ کے ساتھ کتے کی شکل والا کمپیوٹر سا بنا ہوا ہے۔ اب اسے ایک پالتو کتے کی مانند پورے وقت پر کھانا کھلاؤ، سلاؤ، دودھ پلاؤ، پانی کرواؤ...... اگر دیر سویر ہو جائے تو بیمار ہو جاتا ہے اور دو دن کھانا نہ کھلاؤ تو فوت ہو جاتا ہے۔"

"بیگ صاحب...... ایک کمپیوٹر کو آپ کھانا کیسے کھلا سکتے ہیں یا پھر پانی کروانا تو مشکل نہیں ہوگا؟"

"اوہو تارڑ صاحب...... سچ مچ یہ کام تھوڑے کرنے ہیں۔ صرف بٹن دبانے ہیں پورے وقت پر کہ لو جی دودھ پلا دیا...... لو جی سلا دیا...... اور اگر یہ باقاعدہ نہ کیا جائے تو وہ مردہ ہو جاتا ہے۔ سنا ہے یورپ اور امریکہ میں بوڑھوں نے اسے بہت پسند کیا کہ وہ ترسے ہوئے ہوتے ہیں رفاقت کے۔ چھوٹی بچیوں کو دیا جا رہا ہے کہ یوں کل کلاں انہیں بچے پالنے میں آسانی ہوگی۔ یہ پالتو کتے کروڑوں کی تعداد میں فروخت ہو رہے ہیں۔ تم بتاؤ اس ایجاد سے انسانیت کو کیا فائدہ ہوا؟"

"یہ ایجاد میں نے کی ہے؟" میں نے بھنا کر کہا۔

"تم ہمیشہ دفاع جو کرتے رہتے ہو ایسی بیکار ایجادوں کا......" وہ ناراض ہو کر چلے گئے۔

تقریباً دو ماہ پیشتر پھر شکایتوں کا ایک پلندہ لے کر وارد ہو گئے "لو کتے پہ کتا ایجاد ہو رہا ہے۔ یہ جاپان والوں کو کیا ہو گیا ہے؟"

"اب کیا ایجاد ہو گیا ہے بیگ صاحب؟"

"روبو پپ ایجاد ہو گیا ہے یعنی روبوٹ کتے کا بچہ...... اس کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟"

"بیگ صاحب میں نے کیا فرمانا ہے۔ آپ فرمائیے کہ یہ کیا ایجاد ہو گیا ہے؟"

"کتے کا بچہ اور کیا...... کہتے ہیں کہ جدید ٹیکنالوجی کا شاہکار ہے...... سائز بھی کتورے جتنا ہے...... اور اسے بھی خاندان میں ایک پالتو جانور کی طرح رکھا جا سکتا ہے...... نہ یہ آپ کے سلیپر چباتا ہے...... نہ ہمسایوں کو کاٹتا ہے اور نہ ہی ڈرائنگ روم کے قالین پر پیشاب کرتا ہے اور ظاہر ہے نہ ہی بچے دیتا ہے۔ یہ ایک عقلمند سپر کھلونا ہے جسے آپ اپنی مرضی کے مطابق کھیلنا سکھا سکتے ہیں۔ یہ آپ کو پہچان سکتا ہے۔ تالی بجائیں تو آپ کے پاس آ جاتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرائیں تو پیچھے چلا جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ غصے میں ہے۔ تنہا محسوس کر رہا ہے، بھوکا ہے۔ خوش ہے یا سونا چاہتا ہے۔ چوکیداری بھی کر سکتا ہے۔ اگر کوئی غیر کمرے میں داخل ہو تو بھونکنے لگتا ہے۔ رقص کر سکتا ہے اور اگر دس منٹ تک اس سے بات نہ کریں یا آنکھوں پر کپڑا ڈال

دیں تو سو جاتا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ کروڑوں ڈالر خرچ کر کے اگر روبو پپ ایجاد کر لیا گیا ہے تو کیا اس سے کم خرچ یہ طریقہ نہ تھا کہ گھر سے باہر نکل کر کسی آوارہ کتے کو پکڑ لائیے۔ وہ بھی یہ سب کام کر سکتا ہے۔ اب فرمائیے...... ذرا دفاع کیجیے اس ایجاد کا۔"

میں کیا دفاع کرتا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لی کہ جناب کوشش کروں گا کہ آئندہ جاپانی مزید کتے نہ ایجاد کریں۔ اور کمپیوٹر وغیرہ پر مزید تحقیق نہ کریں۔

تو انہی بیگ صاحب نے اپنا نظریہ بدل لیا تھا...... بڑے شدّومد سے نئی ایجادات کا دفاع کر رہے تھے۔ تعریف کر رہے تھے کہ بس یہی تو انسانیت کی معراج ہیں...... اور تو اور باورچی خانے میں مائیکروویو چولہا بھی لے آئے تھے اور معلومات حاصل کر رہے تھے کہ یہ روبو پپ کہاں سے ملتا ہے چنانچہ مجھے پوچھنا پڑا کہ بیگ صاحب اس تبدیلی قلب اور تبدیلی نظریہ کا کیا سبب ہے؟

ہنسے بھی اور تھوڑے سے شرمندہ بھی ہوئے اور کہنے لگے۔ "بس بیٹی نے راہِ راست پر ڈال دیا ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

کہنے لگے۔ "آپ جانتے ہیں پچھلے دنوں اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی کی تھی آپ بھی شریک ہوئے تھے۔ اس کا خاوند امریکہ میں انجینئر ہے۔ وہ دونوں شادی کے فوراً بعد وہاں چلے گئے۔ گھر ویران ہو گیا۔ ہم دونوں میاں بیوی بے ترتیب سے ہو گئے۔ سارا دن ایک دوسرے سے جھگڑتے یا پھر اسے فون کرتے رہتے۔ آدھی کمائی فون کارڈز کی نظر ہو گئی۔ تب میرا بیٹا! مجھ سے چوری چھپے کمپیوٹر خرید لایا۔ جس کے ساتھ ایئر فون اور ایک چھوٹا سا کیمرہ بھی تھا۔ اب ہم روزانہ اس کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔ کمپیوٹر پر اس کی تصویر بھی آتی ہے۔ جسے دیکھ کر جان پڑ جاتی ہے۔ وہ بھی ہمیں اپنے کمپیوٹر پر دیکھتی ہے۔ ایک ایک چیز بتاتی ہے کہ آج کہاں گئے۔ کیا کھایا۔ موسم کیسا ہے۔ جو کچھ خریدتی ہے وہ دکھاتی ہے کہ دیکھئے آج ہم نے جو گرز خریدے ہیں۔ ہم پورے ساڑھے پانچ بجے شام کمپیوٹر کے گرد بیٹھ جاتے ہیں کہ اس وقت وہاں صبح کے ساڑھے آٹھ بج رہے ہوتے ہیں اور وہ اپنے خاوند کو دفتر روانہ کر کے ناشتے کے بعد اطمینان سے ہم سے باتیں کرتی ہے۔ اکثر اوقات چولہے پر

ہانڈی چڑھا دیتی ہے اور اپنی ماں سے پوچھتی ہے کہ امی پیاز براؤن ہو گئے ہیں تو اب کیا کروں گوشت کتنی دیر اور بھونوں...... نمک مرچ کتنا ڈالنا ہے۔ یہ لاہور میں اس کی ماں بتا رہی ہوتی ہے اور ادھر حلیم فلوریڈا میں تیار ہو رہی ہوتی ہے۔ یعنی ہمارے اور اس کے درمیان براہِ راست ٹرانسمیشن جاری ہوتی ہے۔ میں تو ان نئی ایجادات کا قائل ہو گیا ہوں جنہوں نے اولاد اور ماں باپ کے درمیان فاصلے ختم کر دیئے ہیں۔ اب تو میں الیکٹرانک کتے کا بچہ بھی حاصل کروں گا تاکہ ہم دونوں میاں بیوی فرصت کے اوقات میں اس سے کھیلا کریں بلکہ دو تین کتے کے بچے خریدوں گا تاکہ ذرا رونق رہے...... تمہارے لیے بھی ایک لے آؤں؟"

ہمارا دل نہ دکھایا کریں

میرا دل بہت دُکھتا ہے...... پہلے بھی دُکھتا تھا لیکن اب زیادہ دُکھتا ہے۔ جب یورپ اور امریکہ میں آباد پاکستانی برادران چند روز کے لیے پاکستان آتے ہیں اور مجھ ایسے لوگوں کو ڈانٹ کر چلے جاتے ہیں۔ اپنا غصہ مجھ پر اتارتے ہیں...... یہ کیسا ملک ہے...... یہ تم اس ملک کو کیسے چلا رہے ہو...... کبھی جمہوریت آ جاتی ہے اور کبھی فوج آ جاتی ہے...... کرپشن زوروں پر ہے۔ ہر شخص بے ایمان ہو چکا ہے' کوئی محکمہ کام نہیں کرتا' اقلیتوں کے ساتھ کیسا سلوک کر رہے ہو...... فرقہ واریت کو کیوں ہوا دے رہے ہو' ہم جو دوسرے ملکوں میں رزق روزگار کے لیے مقیم ہیں اور پاکستانیت کے علم بلند کئے ہوئے ہیں ہمیں بڑی شرمندگی ہوتی ہے۔ پاکستانی ہونے پر شرم محسوس کرتے ہیں اور صرف اس لیے کہ تم لوگوں نے اس ملک کا ستیاناس کر دیا ہے۔ یہ ملک اب رہنے کے قابل نہیں رہا...... یہ پاکستانی برادران مجھے ڈانٹ ڈپٹ کر کے اپنا غصہ اتار کر پھر سے اپنے اپنے آرام دہ ملکوں کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ بدتہذیبی میں چند روز بسر کر کے اپنی پاکستانیت ثابت کر کے' مجھے نالائق ثابت کر کے تہذیب یافتہ معاشروں میں واپس چلے جاتے ہیں۔

میں ان کی ڈانٹ ڈپٹ سے تنگ آ چکا ہوں...... پچھلے دنوں بھی میرا دل بہت دُکھا' لیکن اس کی تفصیل بتانے سے پیشتر میں ایک قصہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ شاید میں اسے پہلے بھی بیان کر چکا ہوں لیکن یہ اس لائق ہے کہ اسے پھر سے بیان کیا جائے۔

آج سے تقریباً پچیس برس پیشتر میں سڑک کے راستے یورپ سے واپس پاکستان آ رہا تھا۔ ہم ایک کھٹارہ بس میں ہرات سے کابل آ رہے تھے' جی ہاں یہ ان دنوں کا قصہ ہے جب افغانستان ایک پُرامن اور آباد ملک تھا۔ دنیا بھر کے سیاح اُدھر کا رُخ کرتے

تھے...... کابل کے ہوٹلوں میں جگہ نہیں ملتی تھی۔ سیاح بندے میر کی شفاف جھیلوں میں نہاتے تھے۔ بامیان کے مجسمے دیکھنے جاتے تھے۔ کابل کے عجائب گھر میں افغانستان کے شاندار ماضی کے شواہد دیکھتے تھے اور اس کے بے مثال موسموں سے لطف اندوز ہوتے تھے...... ہرات سے آنے والی بس میں گرمی بہت تھی ہم ایک ویران اور خشک صحرائی خطے میں سے گزر رہے تھے اور ہم سب بے حد پیاسے تھے لیکن راستے میں پانی کا نام و نشان نہ تھا۔ تب میرے برابر میں بیٹھی ہوئی ایک امریکی سیاح لڑکی نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور کہنے لگی "تم جانتے ہو اس وقت میری سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟ ایک یخ اور ٹھنڈی ٹھار بوتل سیون اپ کی...... اور اگر یہ مجھے مل جائے تو اس کے لیے اس وقت پچاس ڈالر تک ادا کرنے کو تیار ہوں۔"...... میں نے کہا کہ اس وقت تو شاید یہ ممکن نہیں لیکن جب آپ طورخم عبور کر کے میرے ملک پاکستان میں قدم رکھیں گی تو وہاں سیون اپ کے علاوہ دنیا بھر کے مشروب ملیں گے...... جوس ملیں گے اور ٹھنڈے ٹھار ملیں گے...... وہ بی بی کہنے لگی۔ "ہم لوگ براہِ راست بائی ایئر دہلی جا رہے تھے جانے کس کم بخت نے ہمیں بائی روڈ جانے کا مشورہ دیا...... ہمارا تو ستیاناس ہو گیا ہے۔ سفر کرتے کرتے...... یوگوسلاویہ کے بعد ڈھنگ کا کھانا نہیں کھایا...... تہران میں سیب کھانا چاہتی تھی تو وہ نہیں ملے...... ہم تو اس دن کو کوستے ہیں جب ہم نے بائی روڈ آنے کا فیصلہ کیا تھا......" اس پر میں نے اسے بتایا کہ تم فکر نہ کرو پاکستان پہنچنے پر اس قسم کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ ہر قسم کا مشروب ملے گا۔ ہر قسم کا پھل میسر ہو گا اور جس قسم کی خوراک تم پسند کرو گی وہ آسانی سے دستیاب ہو گی......"

اس پر اس خاتون نے اپنے ساتھیوں کو متوجہ کیا اور کہا "ہے گائز...... یہ شخص بے حد محب الوطن بننے کی کوشش کر رہا ہے اور ثابت کر رہا ہے کہ دنیا کی ہر شے اس کے پاکستان میں مل جاتی ہے......"

اور میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ نہیں بی بی ایسا نہیں ہے۔ میں اس قسم کا محب الوطن ہرگز نہیں ہوں جو اپنے سوا ہر کسی کو غدار گردانتے ہیں۔ پاکستان کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں۔ نظریۂ پاکستان کے ٹھیکیدار بنتے ہیں۔ میں تو صرف حقائق بیان کر رہا ہوں۔" لیکن سچی بات ہے ان امریکی اور یورپی سیاحوں نے جو کچھ میرے بارے میں کہا

اس میں تضحیک کا عنصر بھی شامل تھا کیونکہ وہ مجھ پر یقین نہیں کرتے تھے...... کبھی پوچھتے اچھا تو وہاں چینی کھانے بھی مل جاتے ہیں۔ تمہیں پتہ ہے برگر کیا ہوتا ہے؟ وہاں ٹرین سروس ہے یا ابھی تک اونٹوں سے کام چلاتے ہو...... بہرحال اگلے روز جب ہم طورخم کے راستے پاکستان میں داخل ہوئے اور سامنے ایک کھوکھے میں وہ تمام مشروبات تھے جنہیں میرے ساتھی سیاح خوابوں میں دیکھتے تھے۔ انہوں نے کوشش کی کہ اپنے تھیلوں میں یہ مشروبات بھر لیں 'سٹاک' کر لیں تب میں نے انہیں بتایا کہ پاکستان میں جہاں جہاں یہ بس رُکے گی وہاں ہر مقام پر کھانے اور پینے کی اشیاء میسر ہوں گی...... پشاور کے عام ہوٹلوں میں کھانوں کی فراوانی دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ ان میں سے کچھ میرے ساتھ لاہور چلے آئے اور یہاں گوالمنڈی میں انہوں نے کتوں اور مالٹے کے ڈھیر فٹ پاتھوں پر فروخت ہوتے دیکھے اور پھر انہوں نے مجھ سے معذرت کی اور کہا کہ واقعی یورپ سے لے کر یہاں تک کسی اور ملک میں خوراک اور پھل کی اتنی کثرت نہیں...... پانی بھی مزیدار ہے اور لوگ راہ چلتے چائے کا پوچھتے ہیں' زبردستی کھانا کھلا دیتے ہیں...... پاکستان اتنا زبردست ہوگا' یہ ہمارے گمان میں بھی نہ تھا۔

یہ قصہ میں نے صرف اس لیے بیان کیا ہے کہ ہم نے اپنے ملک کی قدر نہیں کی...... پڑوسی ملک میں' میں نے بچوں کو کیلے کے چھلکے کھاتے دیکھا ہے...... لاکھوں لوگوں کو فٹ پاتھ پر زندگیاں بسر کرتے دیکھا ہے۔ ہم میں بے شمار خامیاں ہیں تنگ نظری اور تعصب ہے اور میں نے ایک بار لکھا تھا کہ ہم لوگ تین چیزیں نہیں چلا سکتے۔ ایک گھڑیال...... دو پانی کی سبیل اور تین...... ملک! لیکن اس کے باوجود یہ ایک شاندار ملک ہے...... اس لیے جب یہ کہا جاتا ہے کہ بس جی یہ ملک ختم ہونے کو ہے...... ٹوٹنے کو ہے...... تو مجھے دکھ ہوتا ہے۔ یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے یا ہو رہا ہے اس کے ذمہ دار ہم خود ہیں' کوئی دوسرا تو نہیں۔ لیکن میں نے کالم کے شروع میں یہ عرض کیا تھا کہ میں پاکستان میں پاکستانیوں کی ''بیرونی مداخلت'' کو پسند نہیں کرتا...... پچھلے دنوں جو میرا دل دکھا اس کا سبب ایک ایسے ہی پاکستانی تھے...... کسی حد تک میرے جاننے والے ہیں۔ ڈاکٹری کے پیشے سے متعلق ہیں اور ایک مدت سے امریکہ میں مقیم ہیں...... انہوں نے فوری طور

پر مجھے کٹہرے میں کھڑا کر دیا اور یہ ثابت کیا کہ دیارِ غیر میں مقیم پاکستانی بے حد دردمند اور عقلمند ہیں اور پاکستان میں مقیم پاکستانی نہایت سنگدل اور نالائق ہیں۔ اس دوران انہوں نے پاکستان پر اپنے احسانات کا تفصیلی ذکر کیا کہ فلاں موقع پر ہم نے اپنے کام کاج سے چھٹی کی اور جلوس نکالا...... فلاں حادثے کے بعد ہم نے چندہ جمع کر کے پاکستان بھجوایا...... ہم اس ملک کے لیے دن رات فکرمند رہتے ہیں اور آپ لوگوں کو احساس ہی نہیں...... آپ کچھ کیجئے ورنہ یہ ملک ٹوٹ جائے گا۔

جب میں ان کی ڈانٹ ڈپٹ سے عاجز آ گیا تو میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب...... ہم پاکستان میں رہنے والے پاکستانی آپ کے بے حد احسان مند ہیں کہ آپ ہمارے لیے فکرمند ہیں اور اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ وقت نکال کر ہمارے لیے جلوس نکالتے ہیں...... ہم واقعی بے حد نالائق ہیں اس لیے میری درخواست ہے کہ آپ امریکہ واپس نہ جائیں یہیں پاکستان میں رہ کر ہماری رہنمائی بھی کریں اور اس ملک کی قسمت بھی سنوار دیں۔''

کہنے لگے۔ ''تو میرا دماغ خراب ہے جو اس ملک میں رہوں...... وہاں میری لاکھوں ڈالر کی پریکٹس ہے یہاں آ کر بھوکا مروں...... ویسے بھی میں صرف دس دن کی چھٹی پر آیا ہوں۔''

''تو پھر ہمارا تو دماغ خراب ہے جو ہم اس ملک میں رہتے ہیں...... اور یقین کیجئے ہم بھوکے نہیں مرتے...... آپ براہِ کرم واپس جا کر اپنی لاکھوں کی پریکٹس کریں...... اپنے سوئمنگ پول والے وسیع گھر میں استراحت فرمائیں اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں...... جس ملک میں آپ رہنا پسند نہیں کرتے اس ملک میں رہنے والوں پر آپ کو تنقید کرنے کا اور ہمہ وقت ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا کوئی حق نہیں......''

ڈاکٹر صاحب ظاہر ہے شدید طور پر ناراض ہو گئے...... اور میری کم عقلی پر ماتم کرتے ہوئے امریکہ واپس چلے گئے...... میں اقرار کرتا ہوں کہ دیارِ غیر میں بسنے والے بے شمار پاکستانی ایسے ہیں جو اس ملک کے مسائل کو سمجھتے ہیں اور ان مسائل کے حل کے لیے کوشاں رہتے ہیں لیکن بے شمار پاکستانی ایسے بھی ہیں جو صرف امریکہ یا یورپ میں رہنے

کی وجہ سے اپنے آپ کو ہم سے سپیریئر سمجھتے ہیں اور ہمیں اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہتے ہیں۔ ان سے گزارش ہے کہ وہ پاکستان تشریف لاکر...... اس ملک میں جو مشکلیں اور کٹھنائیاں ہیں ان کا سامنا کر کے یہاں ہمارے ساتھ زندگی گزاریں اور پھر مشورے دیں...... ہم اگر بیچ منجدھار میں ہیں تو کنارے پر بیٹھ کر آپ ہمیں پیراکی کا سبق نہیں دے سکتے......

براہِ کرم ہمارا دل نہ دُکھایا کریں۔

حکومت آپا کو سمجھاؤ

"تم حکومت کو سمجھاتے کیوں نہیں؟" راؤ صاحب ایک جھاڑی کے عقب سے یکدم نمودار ہوئے اور میرا بازو سختی سے تھام کر بولے۔ راؤ صاحب آج تاؤ میں تھے حالانکہ بے حد خوشگوار اور ہمہ وقت مسکرانے والی شخصیت ہیں۔

"کون سی حکومت کو؟" میں نے سہم کر کہا......

"یہی جو حکومت ہے اس کو۔"

"دیکھیں راؤ صاحب آج تک جتنی بھی حکومتیں آئی ہیں وہ کیا کسی کے سمجھانے سے سمجھی ہیں۔ صرف ایک حکومت تھی جسے سمجھایا جا سکتا تھا۔"

"کون سی حکومت؟" وہ ابھی تک جلال میں تھے۔

"حکومت آپا......"

"تو تم بھی موجودہ حکومت کی چاپلوسی کرنے لگے...... اب اس کو آپا بنا لیا ہے...... بڑی بہن کا درجہ دے دیا ہے۔"

"نہیں راؤ صاحب یہ حکومت آپا تو شفیق الرحمٰن کا ایک کردار ہیں۔ اب اگر ان سے کہیں ملاقات ہو جائے تو ان کو تو شاید کچھ سمجھایا جا سکے کسی اور حکومت کو نہیں سمجھایا جا سکتا...... بہرطور یہ ارشاد فرمائیں کہ سمجھانا کیا ہے' میں ایک مرتبہ پھر کوشش کر دیکھوں گا......"

راؤ صاحب سے تقریباً روزانہ صبح کی سیر کے دوران ملاقات ہوتی ہے...... وہ مجھے دیکھ کر پتہ نہیں کیوں بے حد خوش ہوتے ہیں' رُک جاتے ہیں' چھڑی کو بائیں ہاتھ میں منتقل کر کے ایک پُرجوش دست پنجہ لیتے ہیں اور پھر مسکراتے ہوئے کہتے ہیں "جی ارشاد......"

یعنی آج کا شعر سنا دو...... یہ ان کی روزانہ کی فرمائش ہوتی ہے۔ جب تک کوئی شعر نہ سنا دوں میرا ہاتھ نہیں چھوڑتے چنانچہ جونہی وہ سامنے سے آتے نظر آتے ہیں میں فوری طور پر کوئی نہ کوئی شعر یاد کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہوں۔ اب میں شعر یاد کرنے کے معاملے میں انتہائی پھسڈی واقع ہوا ہوں...... اگر میں شاعر ہوتا تو بھوکا مر جاتا کہ اپنے شعر بھی یاد نہ رکھ سکتا...... تو پچھلے دو چار برس کے دوران جتنے بھی شعر یاد تھے یا نہیں یاد تھے انہیں کچھ آگے پیچھے کر کے انہیں سنا چکا تھا اور اب لاکھ ذہن پہ زور دینے سے بھی کچھ یاد نہیں آ رہا تو انہیں اپنی تخلیق کردہ نثری نظمیں سنانی شروع کر دیں...... وہ بھی ختم ہو گئیں تو ہائیکو شروع کر دیئے اور اب فلمی گانوں کی نوبت آ چکی ہے...... وہ ہاتھ تھام کر کہتے ہیں "جی ارشاد" تو میں عرض کرتا ہوں کہ میرا لال دوپٹہ ململ کا...... ہو جی ہو جی...... اور وہ جواب میں اسی طرح خوش ہوتے ہیں جیسے یہ غالب کا کلام ہو اور "سبحان اللہ" کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں...... اب یہ پہلی بار ہوا تھا کہ انہوں نے "جی ارشاد" کہنے کی بجائے "تم حکومت کو سمجھاتے کیوں نہیں" کہا تھا اور نہایت غصے سے کہا تھا۔

"جی تو کیا سمجھاؤں حکومت کو؟" میں نے پھر مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

"بھئی تم جانتے ہو کہ میرے دو بیٹے اور ایک بیٹی امریکہ میں مقیم ہیں...... صرف ایک یعنی سب سے چھوٹی بیٹی کی شادی پچھلے دنوں کی ہے۔ اس کی بپتا ابھی بیان کرتا ہوں...... تو کل میں پوسٹ آفس گیا ہوں چند کارڈ اور ایک لفافہ پوسٹ کرنے کے لیے جس میں شادی کی کچھ تصویریں تھیں...... تم جانتے ہو انہوں نے مجھ سے کتنی رقم مانگی۔"

"راؤ صاحب پچھلے دنوں یکطرفہ طور پر ڈاک کے نرخ بڑھا دیئے گئے تھے تو کافی پیسے لگ گئے ہوں گے......"

"کافی پیسے نہیں بلکہ سینکڑوں روپے...... چھ کارڈ تھے جن کے سوا چار سو روپے طلب کئے گئے اور تصویروں والے لفافے کے لیے ڈیڑھ سو روپے مانگے گئے...... یعنی کل پونے چھ سو روپے...... غضب خدا کا اتنی رقم میں تو شاید بندہ خود امریکہ جا سکتا ہے...... اور صرف یہی نہیں میرے پاس صرف پانچ سو روپے تھے چنانچہ ان سے بے عزت ہو کر گھر آ گیا...... تو خدا کے لیے حکومت کو سمجھاؤ کہ خلق خدا پر یوں ظلم نہ کرے...... یہ اضافہ ختم

کرے، ہم اپنے بال بچوں کو خط لکھ سکیں۔ دوستوں کے ساتھ رابطہ کر سکیں...... اگر حکومت ایسا کرتی ہے تو پھر دکاندار بھی یہی کچھ کریں گے کہ اشیاء ضرورت کی قیمت دگنی کر دی کہ کون پوچھنے والا ہے اور اس میں اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ پوسٹ آفس والوں نے بتایا ہے کہ اس اضافے کی وجہ سے محکمے کی آمدنی میں کمی ہو گئی ہے۔"

"راؤ صاحب میں کچھ نہیں کر سکتا...... البتہ معراج چتھر نے نامہ بر کبوتروں کو پھر سے رواج دینے کا مشورہ دیا ہے......"

"اور اب میں آتا ہوں اصل بات کی طرف......" راؤ صاحب اس دوران میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تقریباً کھینچتے ہوئے نزدیکی بنچ کی طرف لے گئے تھے۔ "میں نے پچھلے دنوں اپنی آخری بیٹی کی شادی کی، بارات لاہور سے تقریباً چار سو کلومیٹر کے فاصلے سے آ رہی تھی، اب یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ میں انہیں ایک بوتل پلا کر رخصت کر دیتا کہ جاؤ اب فوڈ سٹریٹ میں جا کر کھانا کھا لو...... اِدھر اُدھر سے معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ اس مملکت خداداد میں اگر تو آپ آٹھ دس کنال کے گھر میں رہتے ہیں تو بلا تکلف بیشک ہزاروں مہمانوں کو گھر کے اندر پرتکلف کھانے کھلائیں کوئی پابندی نہیں اور اگر بدقسمت ہیں اور چھوٹے سے گھر میں رہتے ہیں تو پولیس دولہا سمیت باراتیوں کو بھی پکڑ کر لے جا سکتی ہے، کیا یہ ظلم نہیں؟"

"ہے......"

"اب اور سنو...... جب سے کھانے کھلانے پر پابندی لگی ہے...... مہندی جو کہ بنیادی طور پر ایک ہندو رسم ہے اس کی دھوم دھام میں اضافہ ہو گیا ہے اور ولیمہ جو کہ اسلامی رسم ہے اور اس پر زور دیا گیا ہے اس پر پابندی ہے...... چنانچہ میں عجیب مصیبت میں تھا کہ کیا کروں...... اگرچہ لڑکے والے نہایت ہی کوآپریٹو تھے اور کہتے تھے کہ آپ کھانے کا تردد نہ کریں ہم گزارہ کر لیں گے لیکن یہ تو آداب میزبانی کے خلاف تھا...... ان کی برادری نے ساری عمر طعنے دینے تھے کہ لو جی ہمیں اتنی دور ساتھ لے کر گئے اور کھانے کا پوچھا تک نہیں...... چنانچہ میں نے مزید تحقیق کی اور ایک شادی ہال والوں سے مذاکرات کئے...... ان کا کہنا تھا کہ آپ بے فکر ہو جائیں ہم ہر فنکشن کے لیے مقامی پولیس کو پانچ ہزار

ادا کرتے ہیں۔ البتہ آپ کو عقیقہ یا سالگرہ کے کارڈ چھپوانے ہوں گے تا کہ بہ وقت ضرورت پیش کیے جا سکیں کہ یہ شادی کا نہیں عقیقے یا سالگرہ کا کھانا ہے کیونکہ پولیس رقم وصول کرنے کے باوجود کبھی کبھار کارروائی ڈالنے کے لیے چھاپہ مار دیتی ہے...... قصہ مختصر اس احمقانہ پابندی کے باعث میرے اخراجات میں دوگنا اضافہ ہو گیا اور اب میں مقروض ہوں۔ یار حکومت کو سمجھاؤ کہ بڑے ہوٹلوں والے ایک بوتل کے لیے دو سو روپے فی کس چارج کرتے ہیں اور اگر کھانے پر پابندی نہ ہو تو اسی رقم میں کھانا بھی کھلایا جا سکتا ہے...... اب یہ ہو رہا ہے کہ ہوٹل میں شادی کرو اور پھر کہیں اور چھپ چھپا کر کھانا بھی کھلاؤ...... تو یہ تو بہت ہی عام فہم بات ہے۔ حکومت نہیں سمجھ سکتی؟"

"نہیں راؤ صاحب...... ہر کوئی جانتا ہے کہ اس پابندی کی وجہ سے لاکھوں لوگ بیکار ہو گئے ہیں...... اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں میں کمی کی بجائے اضافہ ہوا ہے...... پولٹری کا کاروبار ٹھپ ہو گیا ہے اور شادیوں کا خرچہ دگنا ہو گیا ہے......"

"راؤ صاحب مسئلہ یہ ہے کہ جو لوگ ایسے فیصلے کرتے ہیں وہ فائلوں اور اعداد و شمار کو سامنے رکھ کر کرتے ہیں...... عوام کو سامنے رکھ کر نہیں کرتے...... ان بااختیار لوگوں کی ڈاک کا خرچہ سرکار کے ذمے ہوتا ہے اس لیے لفافہ سو روپے کا بھی ہو جائے تو انہیں فرق نہیں پڑتا۔ چونکہ بڑے بڑے گھروں میں رہتے ہیں اس لیے کھانا کھلا سکتے ہیں بلکہ پلا بھی سکتے ہیں...... یہ اگر ہم جیسے ہوں تو ہماری بات سمجھیں...... آپ نے آج میری صبح کی سیر بھی برباد کر دی اور مجھ سے کسی شعر کی بھی فرمائش نہیں کی......"

"جی ارشاد" راؤ صاحب ہنسنے لگے......

"عرض کیا ہے......

ــــ یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گے۔"

پاکستان کا پہلا "قہقہہ کلب"

معراج پتھر کی بیکاری مجھ سے دیکھی نہ جاتی تھی۔

اس نے کبھی اظہار تو نہیں کیا تھا کہ وہ بیکار ہے لیکن اس کے چہرے مہرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ان دنوں بے روزگار ہے۔ جیسے بری طرح عشق میں مبتلا ایک شخص کا چہرہ ہنس رہا ہو تو بھی ناکامیٔ عشق ظاہر ہو ہی جاتا ہے...... یا ایک بچہ کوئی قیمتی گلدان توڑنے کے بعد چاہے کتنا ہی معصوم بن کر بیٹھا ہو اس کی آنکھیں چغلی کھا رہی ہوتی ہیں...... اسی طرح معراج پتھر اگرچہ ویسا ہی ہنس مکھ اور لاپروا تھا لیکن اس کے چہرے پر بے روزگاری کا دکھ عیاں ہوتا تھا...... وہ پتھروں کا شناسا تھا...... تقریباً ہر ماہ کسی میلے ٹھیلے یا عرس پر جاتا تھا اور وہاں آئے ہوئے قیمتی پتھروں کے بیوپاریوں سے کچھ پتھر خریدتا تھا اور پھر اگلے روز انہیں بتاتا تھا کہ تم نے میرے ہاتھوں یہ اور یہ جو پتھر فروخت کیا تھا' یہ فلاں قسم ہے اور اس کی اصل قیمت تو اتنی ہے...... تو اب تم اسے مجھ سے خرید لو بہت کم منافع لوں گا...... اور وہ بیوپاری اُسی پتھر کے دُگنے دام بخوشی ادا کر دیتا تھا...... معراج پتھروں کی شناخت کرنے میں ماہر تھا اور اسی لیے معراج پتھر کہلاتا تھا اور آسانی سے روزی کماتا تھا...... لیکن اب وہ ایک عرصے سے بیکار تھا چنانچہ میں نے ایک روز اس کے ساتھ "پچھری" کی...... پچھری کرنا عام طور پر دوست احباب کی ایسی شبینہ نشستوں کے بارے میں کوڈ ورڈ ہے جن میں وہ کچھ ہوتا ہے جو برسرِ عام نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں نے معراج پتھر کے ساتھ نہایت شریفانہ پچھری کی اور اس کی بیکاری کا سبب پوچھا۔ کہنے لگا...... یار قیمتی پتھروں کے بیوپاری اب سیانے ہو گئے ہیں۔ انہیں خوب علم ہوتا ہے کہ کون سا پتھر کس قسم کا ہے اور اس کی مالیت کیا ہے۔ اس کاروبار میں اب افغان بھی شامل ہو گئے ہیں اور وہ پتھروں کو پہچانتے ہیں۔

''ہاں انہوں نے بامیان کے عظیم بدھ مجسموں کو بھی پہچان لیا اور ان پر توپوں سے حملہ کر دیا...... وہ واقعی پتھروں کو پہچانتے ہیں۔''

''نہیں...... یہ وہ والے افغان نہیں ہیں۔ ان کا تعلق افغانستان کے ان علاقوں سے ہے جہاں سے قیمتی پتھر نکلتے ہیں۔ اور یہ ان کی پہچان رکھتے ہیں...... طالبان کی وجہ سے چونکہ وہاں ہر قسم کا کاروبار ٹھپ پڑا ہے اس لیے یہ لوگ ادھر پاکستان آ گئے ہیں اور میرے کاروبار کو ٹھپ کر دیا ہے...... اس لیے میں بیکار ہو گیا ہوں۔''

''معراج یار تم نسبت روڈ کے رہنے والے ہو اور فوڈ سٹریٹ تمہارے علاقے میں کھل گئی ہے...... وہاں کوئی کاروبار شروع کر دو...... لوگ گول گپے بیچ کر لاکھوں کما رہے ہیں بلکہ اب تو آس پاس کے گھروں میں بھی ریستوران کھلنے لگے ہیں۔''

معراج پتھر رنجیدہ ہو گیا۔ اپنی فرنچ کٹ داڑھی کی نوک کو بل دیتے ہوئے کہنے لگا۔ ''یار اس فوڈ سٹریٹ نے تو میری مجلسی زندگی کا ستیاناس کر دیا ہے...... تم جانتے ہو میرا سارا دن تھڑوں پر بیٹھ کر گپ لگانے اور تاش کھیلنے میں بسر ہوتا تھا...... شام کو کسی تنور دریا چائے ہوٹل میں محفل جم جاتی تھی...... اب تھڑے پر بیٹھو تو مالک کہتا ہے کہ روزانہ کے تین سو روپے ادا کرو...... تندور والوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے وہ بیٹھنے نہیں دیتے۔ چائے ہوٹل کے ویٹر پیالی ختم کرنے پر کہتے ہیں اُٹھو باؤ جی...... وہ دیکھو گلبرگ اور ڈیفنس کی لڑکیاں جینیں پہنے یہاں کڑک چائے پینے کا انتظار کر رہی ہیں۔ یار تارڑ میں تو اپنے علاقے میں علاقہ بدر ہو گیا ہوں...... فوڈ سٹریٹ میں ایسا کراؤڈ آتا ہے کہ قاضی حسین احمد دیکھ لیں تو فتویٰ جاری کر دیں۔ دکاندار اور ہوٹلوں والے مجھ ایسوں کو قریب نہیں آنے دیتے کہ تم ماجھے گامے ہو یہ جگہ اب جنتری کے لیے ہے...... اسی لیے تو کہتا ہوں کہ میں ہی نہیں اس علاقے میں صدیوں سے رہنے والے سب کے سب علاقہ بدر ہو گئے ہیں۔''

''یار معراج تم دل چھوٹا نہ کرو...... یہ بھی تو دیکھو کہ لوگ کتنے خوشحال ہو گئے ہیں۔ پوری دنیا میں اس کی دھوم ہے...... ترقی کی قیمت تو ادا کرنا پڑتی ہے...... چھوڑو فوڈ سٹریٹ کو تم کوئی اور کام کیوں نہیں شروع کر دیتے......''

''یار اب دائی سے کیا پیٹ چھپانا...... کوئی بھی کاروبار شروع کرنے کے لیے

تھوڑی بہت رقم درکار ہوتی ہے جو میرے پاس تو نہیں ہے۔''

''معراج پتھر......'' میں نے خوش ہو کر اس کے کندھے پر ایک دھپ رسید کی۔ ''میں جانتا ہوں کہ میرا یار یعنی تم ایک عدد فقرے ہو...... تمہاری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں اس لیے تمہارے ساتھ کچہری کرنے سے پیشتر میں نے سوچ لیا تھا کہ تم پیسوں کے بغیر کون سا کاروبار کر سکتے ہو اور مال بنا سکتے ہو۔''

''ایک بے روزگار سے مذاق کرتے ہو۔'' معراج نے ناراض ہو کر کہا۔

''نہیں میں بالکل مذاق نہیں کر رہا۔ بے حد سنجیدہ بزنس پروپوزل ہے...... اس کے لیے صرف ایک کمرہ درکار ہے۔''

''نہ بھئی ناں...... ہم اس قسم کا کاروبار کرنے والے لوگ نہیں ہیں، تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے......''

''یار یہ ہرگز اس قسم کا کاروبار نہیں...... نہایت شریفانہ کاروبار ہے...... تم ایک کمرہ کرائے پر حاصل کر لو اور اس میں ایک ''قہقہہ کلب'' قائم کر لو۔''

''وہ کیا ہوتا ہے؟''

''دیکھو میں نے پچھلے دنوں اخبار میں ایک تصویر دیکھی تھی جس میں مختلف عمروں کی درجنوں خواتین ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی ہیں۔ معلوم ہوا کہ ہندوستان کے کسی شہر میں ایک ''قہقہہ کلب'' قائم ہوا ہے جس کے ممبر ایک مقام پر جمع ہو کر زندگی کی تلخیاں بھولنے کے لیے بے تحاشا قہقہے لگاتے ہیں اور خوش و خرم گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔ کلب کے مالک نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ تیسری دنیا کے ملکوں کو قہقہوں کی شدید ضرورت ہے۔ میں صرف اتنا کرتا ہوں کہ لوگوں کو ایک جگہ جمع کر دیتا ہوں تاکہ وہ دل کھول کر ہنس سکیں۔ معراج میری اطلاع کے مطابق ابھی تک پاکستان میں کسی نے اس قسم کا ''قہقہہ کلب'' نہیں کھولا تو یہ تمہارے لیے سنہری موقع ہے۔''

معراج پتھر کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''یار واقعی۔ ایسا کلب تو ایک کمرے میں بھی کھل سکتا ہے۔ اگر صرف سو ممبر بھی بن جائیں اور ہر ممبر سے پانچ سو روپے فیس وصول کی جائے تو پچاس ہزار روپے مہینے کی آمدنی ہے بیٹھے بٹھائے...... لیکن یار ایک پرابلم ہے۔''

''وہ کیا؟''

''میں لوگوں کو اکٹھا کر کے انہیں قہقہے لگانے پر کس طرح مجبور کروں گا۔ وہ اگر خود قہقہہ لگا سکیں تو گھر بیٹھ کر لگا لیں رقم ادا کر کے میرے کلب میں کیوں آئیں......''

''معراج تم فکر نہ کرو میں اس پرابلم پر بھی غور کر چکا ہوں اور یہ کوئی پرابلم نہیں ہے...... پاکستان اس لحاظ سے بے حد خوش قسمت واقع ہوا ہے کہ یہاں سینکڑوں ایسی چیزیں ہیں جنہیں دیکھ کر انسان بے اختیار ہنسنے لگتا ہے......''

''مثلاً......''

''مثلاً تم اپنے کلب ممبران کو ٹیلی ویژن کا خبرنامہ دکھا سکتے ہو اور وہ ہنستے ہنستے پاگل ہو جائیں گے...... ان دنوں اس میں جنرل نالج بہت ہوتی ہے یعنی جرنیلوں کے بارے میں نالج......''

''چلو ایک تو خبرنامہ ہو گیا...... اور؟''

''تم انہیں کوئی ایک انشائیہ پڑھ کر سنا سکتے ہو...... پھر بھی ہنسی نہ آئے تو کوئی مزاحیہ شاعر دکھا دو...... آزمائش شرط ہے۔''

''مزاحیہ شاعر یا مزاحیہ شاعری۔''

''نہیں نہیں مزاحیہ شاعری سناؤ گے تو کلب ممبران زار و قطار رونے لگیں گے...... اور انہیں چپ کرانا مشکل ہو جائے گا......''

''اور اگر یہ تمام حربے ناکام ہو جائیں اور وہ قہقہے نہ لگائیں تو پھر کیا کروں؟''

''تو پھر معراج پتھر...... ویسے تو جب تم ان کے سامنے جاؤ گے تو تمہاری شکل دیکھ کر ہی وہ لوٹ پوٹ ہو جائیں گے لیکن یہ حربہ بھی کام نہ آئے تو انہیں ملک سے باہر مقیم سیاست دانوں کے وہ بیان پڑھ کر سنا دو جن میں وہ پاکستانی عوام کو ''نوید'' دیتے ہیں کہ ہم آ رہے ہیں۔ اور ان لیڈروں کی تصاویر دکھاؤ جو جمہوریت کی نہیں اپنی بقا کے لیے گرفتاریاں پیش کرتے ہو فتح کا نشان بناتے ہیں اور اپنے آپ کو عوام کا نمائندہ بتاتے ہیں...... یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر جنرل صاحب ہم سے درخواست کریں تو ہم انہیں صدر بنا دیں گے...... ان لوگوں کے بیان سنا دو...... تصویریں دکھا دو' کلب کے ممبران قہقہے لگاتے ہوئے اس دنیا سے ہی رخصت ہو جائیں گے...... لیکن معراج پتھر تم کیوں ہنس رہے ہو......!''

آیئے اپنے لیے کبوتر خریدیں!

''تم نے اپنا کبوتر خرید لیا ہے......؟''

''کبوتر؟'' میرے ہاتھوں کے کبوتر اڑ گئے۔ میرا مطلب ہے طوطے اڑ گئے کہ یہ خلیفہ خلفشاری جب بھی آتے ہیں عجیب لایعنی سے سوال کے ساتھ گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔ میں اچھا بھلا ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھا غیر ملکی اور بے حد غریب حسیناؤں کے رقص دیکھ کر توبہ توبہ کر رہا تھا...... غریب اس لیے کہ ان کے تن پر بس چیتھڑے سے لٹکتے تھے اور خلیفہ آئے' فوری طور پر نہایت بدتمیزی سے ٹیلی ویژن بند کیا۔ میں نے سوچا کہ کوئی ایمرجنسی ہو گئی ہے اور وہ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تم نے اپنا کبوتر خرید لیا ہے مجھے یہاں فوری طور پر لاہور کے ایک لارڈ میئر یاد آئے جو غیر ملکی مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے ہمیشہ ایک کتابت شدہ تقریر پڑھتے تھے...... تقریر ان کو پہلے پڑھائی جاتی تھی پھر پڑھتے تھے تو ایک ضیافت کے موقع پر تقریر میں بار بار ۳-اکتوبر کے الفاظ آئے اور وہ بار بار انہیں تین کبوتر ہی پڑھتے رہے۔

''خلیفہ تم جانتے ہو کہ میں کبھی بھی کبوتر بازی کا شوقین نہیں رہا۔ تو مجھے کس سلسلے میں ایک کبوتر خریدنا ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ تمہیں ایک کبوتر کافی نہیں ہوگا...... تم کم از کم چار پانچ کبوتر خریدو...... اور فوری طور پر خرید لو ورنہ کبوتر مہنگے ہو جائیں گے...... میں نے ابھی کل ہی پرندہ مارکیٹ سے کبوتروں کا ریٹ دریافت کیا تو جو کام کا کبوتر تھا وہ اسی روپے میں دستیاب تھا...... آج خریدنے گیا ہوں تو وہی کبوتر ایک سو بیس روپے میں فروخت ہو رہا تھا۔ اس سے پیشتر کہ کبوتروں کی قیمت آسمان سے باتیں کرنے لگے تم اپنے کبوتر خرید لو۔ ورنہ اب

پچھتائے کیا ہوت جب کبوتر چگ گئے کھیت......''

''خلیفہ تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ چڑیوں کی بجائے کبوتروں نے کب سے کھیت چگنے شروع کر دیئے ہیں۔''

''بھئی اس محاورے میں چڑیاں محض اس لیے باندھی گئی ہیں کہ چگنے اور چڑیوں میں ایک توازن قائم ہوتا ہے اور کبوتر اور چگنے میں نہیں ہوتا حالانکہ چڑیوں کی نسبت کبوتر زیادہ چگتے ہیں۔''

بات کہاں سے کہاں نکلتی جا رہی تھی اور یہی خلیفہ کا کمال تھا کہ سادہ سی بات کو اُلجھانے میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ''خلیفہ مجھے دنیا میں کبوتر خریدنے کے علاوہ بھی بہت سارے ضروری کام ہیں...... مثلاً...... مثلاً...... فی الحال وہ کام یاد نہیں آ رہے لیکن ہیں بہت ضروری۔ تو تم میرا وقت ضائع نہ کرو اور بندے کے پتّروں کی طرح براہ راست بتا دو کہ مجھے کبوتر کیوں خریدنے ہیں؟''

''پیغام رسانی کے لیے...... اور کس کے لیے؟''

''جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے یہ طریقہ تو متروک نہیں ہو چکا؟''

''متروک ہو چکا تھا لیکن اب پھر سے رائج ہو رہا ہے...... جیسے ہم اپنی قدیم ثقافت کو پھر سے زندہ کر رہے ہیں ایسے ہم کبوتروں کے ذریعے پیغام رسانی کے طریقے کو بھی پھر سے اپنا رہے ہیں۔ یہ بھی تو ہماری ثقافت کا ایک حصہ ہے ناں......''

''خلیفہ مجھے کسی کو کوئی پیغام نہیں بھیجنا...... یوں بھی کبوتر کے ذریعے پیغام بھیجنے میں کچھ خطرات پنہاں ہیں...... اگر پیغام رساں کبوتر لڑکی کی بجائے اس کے باپ کے کندھے پر جا بیٹھے اور وہ محبت نامہ پڑھ لے تو پھر کیا ہو......''

''تمہیں شرم نہیں آتی......'' خلیفہ غضب ناک ہو گیا۔

''کیوں؟''

''اس عمر میں لڑکیوں کو محبت نامے لکھنے کے بارے میں سوچتے ہو......''

''بھئی خلیفہ وہ تو میں محض مثال دے رہا تھا......''

''اس عمر میں اس قسم کی مثال بھی نہیں دی جا سکتی......''

''بہر حال میں کبوتر نہیں خرید رہا اور یہ میرا حتمی فیصلہ ہے......''

''اگر نہیں خریدو گے تو دیوالیہ ہو جاؤ گے یہ میں تمہیں بتاتا ہوں......''

''آخر کبوتر نہ خریدنے سے میں دیوالیہ کیسے ہو جاؤں گا خلیفہ...... میں تم سے تنگ آ چکا ہوں...... پلیز مجھے اصل بات بتا دو۔''

''دیکھو میاں تمہارا ہے لکھنے لکھانے کا کام...... اپنے عزیزوں کو دوستوں کو اخباروں کے ایڈیٹروں کو خط لکھتے ہو ناں؟''

''ہاں لکھتا ہوں۔''

''تو اب کیسے لکھو گے؟...... محکمہ ڈاک نے نہایت خاموشی سے...... کسی اعلان کے بغیر ڈاک کے ریٹ صرف بڑھائے نہیں بلکہ سو فیصد اضافہ کر کے دوگنے کر دیئے ہیں۔ کیوں کر دیئے ہیں؟ اس کا کوئی جواز نہیں دیا گیا۔ اگر آپ نے کسی کو صرف دو سطریں لکھنی ہیں تو کاغذ اور لفافے کی قیمت کے علاوہ آپ کو چار روپے کے ٹکٹ لگانے ہوں گے یعنی ایک لفافہ آپ کو پانچ روپے میں پڑے گا۔''

میں تقریباً اچھل پڑا۔ ''او ہو تو یہ سانحہ ہوا ہے۔ خلیفہ پچھلے چھ سات روز سے جب بھی گھر آتا تھا تو علم ہی نہیں کہ تمہارے دوست اتنے کمینے ہیں کہ لفافے بیرنگ بھیج رہے ہیں۔ ڈاکیہ روزانہ پچیس تیس روپے وصول کر کے لے جاتا ہے۔ تو اس مسلسل بیرنگی کا جواز یہ تھا...... دراصل میں بھی بے خبر رہا اور حسب عادت دو روپے کے ٹکٹ لگا کر خط پوسٹ کرتا رہا......''

''فکر نہ کرو تمہارے دوستوں کی بیگمات بھی تمہیں کمینہ کہہ رہی ہوں گی۔ میں نے اس مسئلے پر بہت غور کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اب خط لکھنا بھی عام آدمی کی پہنچ سے باہر ہو گیا ہے تو کیوں نہ اس مقصد کے لیے کبوتر استعمال کیے جائیں...... اگر ہم ایک کبوتر اسّی روپے میں خریدتے ہیں تو اس کے ذریعے بیس خط بھجوانے کے بعد اکیسواں خط مفت میں جائے گا......''

''تم یوں کرو کہ اپنے لیے کبوتر خریدو اور جب وہ بیس بیس خط منزل مقصود تک پہنچا دیں تو پھر وہ کبوتر مجھے دے دو۔ دوستوں کے درمیان چند کبوتروں کی کیا حیثیت ہے۔''

''نہیں بھائی...... کبوتر اپنے اپنے...... ویسے ہم آج تک کبوتر بازی کے شوقین

حضرات کو بُرا بھلا کہتے آئے ہیں تو بہت برا کرتے رہے۔ تم جانتے ہوں کہ اندرون شہر سینکڑوں کبوتر باز ہیں جن کے پاس ہزاروں کبوتر ہیں اور اُن کی اُڑان اور لینڈنگ کے لیے چھتریاں ایستادہ کی گئی ہیں...... تو اب یہ کبوتر باز پوسٹ آفس کا کام دے سکتے ہیں...... آپ خط ان کے سپرد کریں اور وہ اپنی فیس وصول کر کے اپنے کبوتر کو ہرکارہ بنادیں......"

"خلیفہ...... مذاق اپنی جگہ لیکن کیا پوری انتظامیہ میں سے کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو اس اضافے کی مخالفت کرتا...... اعلیٰ اور بے مغز حکام کو بتاتا کہ عام آدمی کے لیے ایک خط کتنا ضروری ہے۔ امیر لوگ اپنے عزیزوں کو فون کر سکتے ہیں...... کمپیوٹر پر رابطہ کر سکتے ہیں لیکن ایک غریب شخص کے پاس تو رابطے کا صرف ایک ہی ذریعہ تھا......"

"اسی لیے تو اضافہ کیا گیا کہ غریب آدمی تو بول نہیں سکتا...... اس پر پیشک دس گدھوں کا بوجھ لاددو وہ فریاد نہیں کر سکتا۔ کرے گا تو کوئی سنے گا نہیں...... تم ابھی ابھی مسلسل بیرنگی کا تذکرہ کر رہے تھے۔ پچھلے دنوں ایک دوست کے بیٹے کی شادی تھی...... اس نے تقریباً چھ سو کے قریب شادی کارڈ پوسٹ کیے۔ چونکہ وہ بھی تمہاری طرح ڈاک کے ٹکٹوں میں اضافے سے بے خبر تھا اس لیے ہر لفافے پر حسب معمول دو روپے کا ٹکٹ چسپاں کیا اور انہیں نذر لیٹر بوکس کر دیا...... ظاہر ہے وہ سب شادی کارڈ بیرنگ ہو گئے۔ کچھ نے جرمانہ ادا کر کے وصول کر لیے اور بیشتر نے واپس کر دیے کہ کیسا کنجوس شخص ہے بیٹے کی شادی کر رہا ہے اور کارڈ بیرنگ بھیج رہا ہے...... نتیجہ یہ نکلا کہ شادی میں بہت کم لوگ آئے اور جو آئے وہ بھی باری باری اسے لعن طعن کرتے رہے۔ اور وہ بے چارہ معذرت کرتا رہا اور معافیاں مانگتا رہا......"

"لیکن خلیفہ اب ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"ہم پہلے کیا کر سکتے تھے جو اب کریں گے۔ دُعا کریں گے کہ اس اضافے سے محکمۂ ڈاک کو تاوان کے جو کروڑوں روپے حاصل ہوں گے ان سے افسران کے لیے نئی کاریں خریدی جائیں۔ دیگر سہولتیں مہیا کی جائیں۔ ڈاک خانہ کے عملے کی تنخواہوں میں البتہ ہرگز اضافہ نہ کیا جائے...... اور ہم یہ کریں گے کہ آئندہ ریڈ انڈین لوگوں کی مانند خط لکھنے کی بجائے دھوئیں سے سگنل دیا کریں گے یا پھر کبوتر خرید لیں گے......"

بابا لوگ شادی کے لیے تیار ہیں

کل صبح ماڈل ٹاؤن پارک میں خوشی کی ایک لہر دوڑ رہی تھی...... بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ خوشی کی متعدد لہریں دوڑ رہی تھیں کہ وہاں سیر کرنے والے جتنے بابا لوگ تھے ہر ایک میں سے کیونکہ ایک ایک لہر دوڑ رہی تھی اس لیے جتنے بابے تھے اتنی ہی خوشی کی لہریں دوڑ رہی تھیں اور ان کا سبب ایک شادی تھی بلکہ پانچ شادیاں تھیں۔

ان بابا لوگ میں ظاہر ہے میں بھی شامل تھا۔ ہم سب کے لیے کم از کم ایک اور زیادہ سے زیادہ چار شادیاں کرنے کا امکان پیدا ہو رہا تھا۔ اسی لیے بابا لوگ اپنے آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ مرد چاہے اسّی برس کا ہو جائے رعشے کے باعث ایک ایک کے تین تین نظر آ رہے ہوں ہاتھ میں جنبش نہ ہو پھر بھی ایک اور شادی کے امکان پر وہ اپنے آپے سے باہر ہو جاتا ہے...... رعشہ ختم ہو جاتا ہے اور صرف ہاتھ میں جنبش آ جاتی ہے......

خوشی کی یہ لہریں کل صبح پارک میں کیوں دوڑ رہی تھیں' اس کی وجہ میں ابھی بیان کرتا ہوں لیکن اس سے پیشتر میں ایسے مردان جری کو سلام پیش کرنا چاہتا ہوں جو اپنی زندگی میں متعدد شادیاں کرتے ہیں اور کسی کو ان کی ہوا تک لگنے نہیں دیتے یہاں تک کہ ایک بیوی کو دوسری بیوی کی بھی خبر تک نہیں ہوتی۔

چند برس پہلے کا قصہ ہے کہ میں نے ٹیلی ویژن کے ایک میوزیکل شو کی میزبانی کی۔ جیسا کہ دستور ہے کہ مجھ ایسے بزرگ میزبان کے ہمراہ زیبائش کے لیے ایک عدد پٹاخہ قسم کی خاتون بھی کھڑی کر دی جاتی ہے تاکہ ناظرین اسے دیکھتے رہیں...... تو اس شو میں بھی ایک نوخیز گلوکارہ کو میری معاونت کرنے کے لیے بلایا گیا۔

بہر حال جب شو کا اختتام ہوا تو نوخیز گلوکارہ نے میرے ایسے "کہنہ مشق" میزبان

کے ہمراہ کام کرنے کو اپنی خوش بختی قرار دیا بلکہ میری ایک دو کتابوں کے حوالے دے کر ثابت کر دیا کہ وہ محض نوخیز ہی نہیں ہے۔ میں نے بھی اس کے گائے ہوئے چند نغمات کی تعریف کی جو واقعی مجھے پسند آئے تھے...... اور یہ گفتگو میک اپ روم میں ہو رہی ہے جہاں ان کی والدہ ماجدہ پھسکڑا مارے بڑے چاؤ سے اپنی لاڈلی کی دانشورانہ گفتگو سن رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ یعنی نوخیز گلوکارہ کی والدہ ماجدہ اپنی نشست سے اٹھیں اور ذرا شرما کر کہنے لگیں۔ ''تارڑ صاحب آپ شاید نہیں جانتے کہ یہ آپ کی بیٹی ہے۔''

یقین کیجئے کہ میرے ہاتھوں کے جتنے بھی طوطے تھے وہ ٹیں ٹیں کرتے اُڑ گئے...... کان خوف کے مارے کھڑے ہو گئے کہ یا خدا یہ کہاں سے آ گئی۔ ذہن پر بہتیرا زور مارا کہ کہیں نادانی میں ایک اور شادی نہ کر لی ہو جو اب یادداشت سے محو ہو گئی ہے۔ زبان بھی ہکلانے لگی کہ برے وقت کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ ''وہ جی...... میری بیٹی...... میرا مطلب ہے خاتون آپ...... آپ کو تو میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں یا......''

اس پر خاتون مزید شرمائیں۔ ''تارڑ صاحب آپ کے دوست کی بیٹی ہے تو آپ کی بیٹی ہی ہوئی ناں......''

اب یہ بھی طے ہے کہ میرے کچھ زیادہ دوست بھی نہیں ہیں اور جو ہیں ان کے بال بچوں کو بھی جانتا ہوں کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ کم از کم یہ نہیں کرتے جو یہ نوخیز گلوکارہ کرتی تھیں اس لیے دریافت کیا کہ کون سے دوست......

''شوکت حسن شانا نہیں ہیں...... میں ان کی بیوی ہوں اور یہ میری بیٹی ہے۔''

''آپ بھی ہیں۔'' میرے منہ سے نکل گیا۔

''جی...... کبھی آپ آئیے ناں میرے گھر...... شانا صاحب بھی کبھی کبھار آتے ہیں۔''

اب شوکت حسن شانا کا مختصر تعارف یہ ہے کہ نہایت دانشور شخص ہیں...... شاعری بھی کرتے ہیں اور شادیاں بھی...... بلکہ شادیاں زیادہ کرتے ہیں...... لیکن ایک احتیاط برتتے ہیں کہ خاتون مکمل طور پر خود کفیل ہو۔ اگر رہائش اس کی ذاتی ہو تو سبحان اللہ ورنہ جائیداد مناسب ہو...... وہ بھی نہ ہو تو برسرِ روزگار ضرور ہو۔ ظاہر ہے ایک آبائی بیگم بھی ہیں

اور ان سے بچے بھی ہیں...... ہمیں ہمیشہ اتفاقاً اپنی بھابیوں کا علم ہوتا رہتا ہے کہ انارکلی بازار میں ایک برقعہ پوش خاتون نقاب الٹ کر کہتی ہیں۔ ''بھائی صاحب سلاما لیکم...... میں آپ کی بھرجائی ہوں ناں...... شانا صاحب کی بیگم۔''

بہرحال اس نوخیز گلوکارہ کے سانحہ کے بعد شانا سے ملاقات ہوئی تو میں نے خوب ڈانٹا کہ کمبخت بتا تو دیا کرو سخت شرمندگی ہوتی ہے۔ کہنے لگا۔ ''وہ وہ تو یار حال ہی میں نکاح پڑھوایا تھا اس لیے اطلاع نہ کر سکا۔'' میں نے پوچھا کہ ''جناب وہ نوخیز گلوکارہ......'' تو کہنے لگا۔ ''پہلے خاوند سے ہے۔''

اب وہ گلوکارہ نوخیزی سے آگے جا چکی ہے اور جب کبھی اسے ٹیلی ویژن پر رقص کرتے دیکھتا ہوں تو پشیمانی سی ہوتی ہے۔

اسی طور میرے ایک نہایت قریبی عزیز ہیں...... آج تک بیگمات کی درست تعداد معلوم نہیں ہو سکی...... بلکہ ایک بار کسی بیگم کی بیٹی کی شادی تھی جو ان کی بیٹی بھی تھی تو عزیزوں سے معذرت کی کہ آپ کو پہلے اطلاع نہیں دے سکا اپنی اس شادی کے بارے میں...... مائنڈ نہ کیجئے گا لیکن شادی میں ضرور شرکت کیجئے گا۔

لطف کی بات یہ ہے کہ اگر دیگر بیگمات کو ان کی کسی اور بیگم کے بارے میں پتہ چل جائے تو بھی ناراض نہیں ہوتیں اسے خوش آمدید کہتی ہیں...... ایسے لوگوں میں قدرت کی جانب سے ایک ایسی چارم اور معصومیت ہوتی ہے کہ خواتین ان کے لیے سوکنیں بھی برداشت کر جاتی ہیں...... اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہر نعمت سے نوازا ہے لیکن اس خصوصی چارم اور معصومیت سے محروم رکھا ہے۔ ہم نے کسی اور کو شادی کے لیے تو کیا کہنا ہے محض رومینٹک ہونے کی کوشش کریں تو ہکلانے لگتے ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ آبائی بیگم ہاتھ میں جوتا لیے سر پر کھڑی ہیں...... ادھر ہم نے کسی غیر خاتون کو مسکرا کر دیکھا اور اُدھر دھاڑ سے ایک عدد جوتا...... چنانچہ خوش قسمت ہیں وہ مردانِ جری جو متعدد بیگمات رکھتے ہیں اور ان کو خوش رکھتے ہیں۔

اب میں واپس آتا ہوں کل صبح ماڈل ٹاؤن پارک میں بابا لوگ میں جو خوشی کی لہریں دوڑ رہی تھیں ان کی جانب...... ان کا منبع بھی ایک اور شادی تھی...... بلکہ اخبار میں چھپنے والی ایک تصویر تھی جس میں ایک امریکی مرد اپنے بائیس بچوں اور پانچ بیویوں کے ہمراہ

خوش وخرم کھڑا ہے۔ ایک مقامی عدالت میں ان صاحب کے خلاف مقدمہ چل رہا ہے کہ امریکی قانون کے مطابق صرف ایک شادی کی اجازت ہے تو انہوں نے یک مشت پانچ شادیاں کیوں کر رکھی ہیں۔ ان صاحب کا موقف یہ ہے کہ میں عیسائیت کے مارمون فرقے سے تعلق رکھتا ہوں اور ہمارے عقیدے کے مطابق مزید شادیوں پر کوئی پابندی نہیں۔ میں نے ان خواتین کی مرضی سے باقاعدہ اپنی عبادت گاہ میں شادیاں کی ہیں قانونی طور پر...... اور میری بیگمات سے پوچھ لیجئے کہ وہ مجھ سے خوش ہیں یا کہ نہیں...... بیگمات سے دریافت کرنے کی ضرورت اس لیے نہیں کہ وہ سب کی سب اس گروپ فوٹو میں بڑے فخر سے مسکرا رہی ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہمارے فرقے کے بیشتر مرد ایک سے زیادہ شادیاں کرتے ہیں صرف عوام الناس کو بتاتے نہیں ہیں۔ میں نے بتا دیا ہے کیونکہ میں اپنے عقیدے پر پختہ یقین رکھتا ہوں۔

میں مارمون فرقے کے عقائد سے بخوبی واقف ہوں کیونکہ ایک سوس مارمون لڑکا میرا دوست تھا۔ یہ لوگ جدید ایجادات اور مشینوں وغیرہ سے سخت الرجک ہیں۔ کاروں کی بجائے گھوڑا گاڑیاں استعمال کرتے ہیں۔ سیاہ لباس پہنتے ہیں...... کھیتی باڑی بھی ہاتھ سے کرتے ہیں۔ امریکہ میں ان کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ ہالینڈ میں بھی ان کا ایک قصبہ ہے۔ سیاح ان کی تصویر اتارنے کی کوشش کریں تو پتھر برساتے ہیں۔

بہرحال کل صبح پارک میں جتنے بھی بابے تھے وہ سخت اشتعال میں تھے کہ ہم سے تو یہ مارمون ہی اچھے ہیں جو اپنے عقیدے پر سختی سے کاربند ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک ایک بیوی پر ہی اکتفا کر بیٹھے ہیں حالانکہ ہمارے ہاں تو چار کی گنجائش ہے۔ ہمیں بھی ہمت کرنی چاہیے اور کچھ کر گزرنا چاہیے۔

چونکہ میں بیشتر باباجات کی نسبت کم عمر بابا ہوں اس لیے سب نے مجھے ہلاشیری دی کہ تم کوشش تو کرو۔

یہ نہیں کہ میں ان کی باتوں میں آ گیا۔

اب میں اتنا بھی بھولا نہیں ہوں کہ اپنی بیگم سے براہِ راست کہہ دیتا کہ بس بہت ہو چکی تمہاری تین سوکنیں جلد آ رہی ہیں۔

بہرحال میں گھر آیا اور یونہی مذاق مذاق میں بیگم سے کہا کہ دیکھو یہ مارمون لوگ اپنے عقیدے پر کس طرح قائم ہیں۔ پانچ پانچ شادیاں کرتے ہیں اور تم مجھے اپنے عقیدے پر عمل کرنے سے روکتی ہو۔

حیرت انگیز طور پر بیگم نہایت پُرسکون رہی اور کہنے لگی۔ ''کیا تم اپنے عقیدے کے باقی تمام احکامات پر عمل کرتے ہو؟ نماز باقاعدگی سے پڑھتے ہو؟ تمام روزے رکھتے ہو؟ غصے کو حرام جانتے ہو...... حقوق العباد کا خیال رکھتے ہو...... قرآن پاک کی باقاعدہ تلاوت کرتے ہو...... اگر تم یہ سب کچھ کرتے ہو تو بے شک ایک اور شادی کر لو...... مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

میں نے فوری طور پر بغلیں جھانکنی شروع کر دیں اور اب تک جھانک رہا ہوں...... اور کیا کروں۔

بچوں کو زدوکوب کرنے کے تخلیقی طریقے

ہمارے ہاں جو کوئی اور کچھ نہ کر سکے وہ امریکہ، روس اور یورپ وغیرہ کے فوری زوال کی پیشین گوئیاں کرتا رہتا ہے اور جس کے دل میں کچھ درد ہو وہ 'قرب قیامت کی پیشین گوئیاں کرنے لگتا ہے...... میں نے آج تک کوئی پیشین گوئی نہیں کی سوائے ایک کے یعنی...... یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور اپنی اپنی بولیاں بول کر اڑ جائیں گے...... لیکن آج میں اپنی دوسری پیشین گوئی کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ برطانیہ میں تعلیم کا مکمل طور پر خاتمہ ہونے کو ہے...... اور مستقبل قریب میں گورالوگوں کے بچے اتنے اَن پڑھ ہو جائیں گے کہ وہ دستخط بھی نہیں کر پائیں گے اور انگوٹھے لگایا کریں گے...... اس پیشین گوئی کی بنیاد وہ خبر ہے جس میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ ایک برطانوی ہائی کورٹ نے ایک کرسچین سکول کی وہ اپیل مسترد کر دی ہے جس میں سکول کے بچوں پر تشدد کی اجازت نہ دینے کے حکومتی فیصلے پر نظرثانی کی استدعا کی تھی...... لیورپول کا یہ سکول چاہتا ہے کہ حکومت اس کو سکول میں ایسے بچوں کی پٹائی کی اجازت دے جو ڈسپلن کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے ہیں......

اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ اگر بچوں کی پٹائی نہ کی جائے...... ان کی گوشمالی کی اجازت نہ ہو ان کو زدوکوب کرنے پر پابندی ہو...... مختصر یہ کہ انہیں چھینٹی نہ لگائی جائے تو وہ خاک پڑھیں گے۔ ہمارے ہاں بھی تعلیم کا معیار گرنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بیشتر تعلیمی ادارے مغرب کے انحطاط پذیر تعلیمی نظام کی اندھادھند پیروی کرتے ہوئے بچوں کو زدوکوب کرنے سے پرہیز کرنے لگے ہیں۔ صاحب کہاں وہ دن تھے کہ بچوں کو دھما دھم پیٹا جاتا تھا' سکول کے باہر تک بچوں کی چیخ و پکار اور آہ وزاری کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔ ہر

طرف مولا بخش کا راج تھا...... بچوں کی ہتھیلیاں سوجی ہوتی تھیں اور کان اکڑنے کو ہوتے تھے اور ان کے آنسو تھمنے میں نہ آتے تھے۔ تو یہی وہ دن تھے جب معیار تعلیم بے حد اونچا ہوا کرتا تھا...... بلکہ اکثر بنچ پر کھڑا ہونے کی وجہ سے مزید اونچا ہو جاتا تھا...... افسوس کہ یہ امت خرافات میں کھو گئی اور مار پیٹ کی سنہری روایت سے منہ موڑ لیا۔ تبھی تو نئی نسل بزرگوں کا احترام نہیں کرتی...... ہمارے زمانے میں بڑا بڑا قاہر بزرگ پایا جاتا تھا...... پیار بعد میں کرتا تھا اگر کرتا تھا تو...... اور جھانپڑ پہلے رسید کر دیتا تھا...... اولاد والد صاحب قبلہ کے سامنے تھر تھر کانپتی تھی اور اکثر مارے خوف کے اپنے کپڑے بھگو لیتی تھی...... سکول کے زمانے میں ایک ہم جماعت تھا زمان خان...... سالانہ امتحان قریب آیا تو یہ فیصلہ ہوا کہ چھٹی کے بعد کسی ایک کلاس فیلو کے گھر جا کر اجتماعی طور پر امتحان کی تیاری کی جائے...... چنانچہ ہر روز ہم کسی نہ کسی کلاس فیلو کے گھر جا کر خوب رٹے لگاتے...... لیکن زمان خان نے کبھی ہمیں اپنے گھر مدعو نہ کیا...... ایک روز دوستوں نے شکایت کی تو کہنے لگا...... یار میرے اباجی ذرا جلالی طبیعت کے ہیں' ویسے مجھے تو کوئی اعتراض نہیں' ٹھیک ہے آج چھٹی کے بعد آپ سب لوگ میرے گھر اکٹھے ہوں گے۔ ہم زمان خان کے گھر جا کر اس کی بیٹھک میں براجمان ہوئے اور انگریزی محاورے یاد کرنے لگے...... تھوڑی دیر کے بعد ایک دھماکے کی آواز آئی۔ بیٹھک کا دروازہ چوپٹ کھل گیا اور زمان خان کے والد صاحب ایک عصا تھامے سفید مونچھوں کو بل دیتے ایک زلزلے کی طرح اندر داخل ہوئے اور گرج کر بولے۔ ''اوئے زمان یہ کن بدبختوں کو گھر لے آیا ہے...... اوئے بدبختو دفع ہو جاؤ یہاں سے......'' زمان نے نہایت اطمینان سے کہا۔ ''اباجی یہ میرے کلاس فیلو ہیں امتحان کی تیاری کے لیے آئے ہیں۔'' اس پر والد صاحب نے آگے بڑھ کر زمان کو کان سے پکڑ لیا اور کہنے لگے۔ ''اوئے بدبخت تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔'' یہ کہہ کر چلے گئے...... کچھ دیر گزری تو پھر دھماکہ ہوا اور والد صاحب پھر نازل ہو گئے۔ ''اوئے زمان یہ کن بدبختوں کو گھر لے آیا ہے۔ اوئے بدبختو دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' زمان نے پھر نہایت اطمینان سے ہمارا تعارف کروایا اور والد صاحب نے پھر زمان کا کان مروڑا اور چلے گئے۔ اور یہ ''اوئے بدبختو'' کی پرفارمنس ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد دہرائی جاتی رہی۔ بعد میں زمان خان نے

سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ''یارو! میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ ابا جی ذرا جلالی طبیعت کے مالک ہیں۔ آج تک گھر کا کوئی دروازہ ہاتھ سے دھکیل کر نہیں کھولا...... ہمیشہ ٹھڈا مار کر کھولتے ہیں...... اسی لیے دروازوں کے نچلے حصوں کے پرخچے اڑ چکے ہیں اور پھر تھوڑے سے بھلکڑ بھی ہیں......'' ظاہر ہے اس کے بعد ہم زمان خان کے کہنے کے باوجود دوبارہ اس کے گھر نہیں گئے۔

ہمارے سکول کے بیشتر ماسٹر حضرات بھی اسی قسم کی جلالی طبیعت کے مالک تھے...... ماسٹر رفاقت فن زدوکوب میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں بچہ ان کے تابڑ توڑ حملوں کی تاب نہ لاکر کلاس روم سے فرار ہو جاتا تو وہ چھڑی کو ایک تلوار کی طرح لہراتے زیر لب نعرۂ تکبیر بلند کرتے اس کا پیچھا کرتے...... بچہ آگے آگے اور ماسٹر صاحب پیچھے پیچھے۔ بچہ اگر ناتجربہ کار ہوتا تو سکول کے گیٹ کی جانب بھاگتا جہاں گیٹ کیپر اسے دبوچ کر ماسٹر صاحب کے حوالے کر دیتا...... اگر کائیاں قسم کا بچہ ہوتا تو لیٹرین میں گھس کر اندر سے چٹخنی چڑھا لیتا اور ماسٹر صاحب پھنکارتے ہوئے واپس آ جاتے......

ایک اور مولانا ماسٹر صاحب کی عادت تھی کہ گھر کا کام چیک کرنے کے لیے بچے کی کاپی ایک ہاتھ میں پکڑتے اور دوسرے سے اس کا کان پکڑ کر اسے حسب خواہش کھینچتے رہتے...... اس دوران اگر انہیں کوئی قصہ یاد آ جاتا تو وہ سنانے لگتے لیکن بھول جاتے کہ ان کی گرفت میں ایک کان بھی ہے...... وہ بدستور اسے مروڑتے رہتے تا آنکہ بچے کی ولدوز چیخ ''مر گیا ماسٹر جی'' کے ساتھ پورے سکول میں گونجتی...... ان ماسٹر صاحب کی ایک اور نہایت دل پذیر عادت تھی...... اردو املا کی کاپی چیک کرتے تو اس میں مثال کے طور پر لفظ ''دل پذیر'' اگر ''پظیر'' لکھا گیا ہے تو وہ قابل فہم طور پر گوشمالی فرماتے...... دو فقروں کے بعد ظاہر ہے وہی لفظ اگر دوبارہ آئے گا تو ''دل پظیر'' ہی لکھا ہوگا تو وہ غضب ناک ہو جاتے کہ اُلو کے کان ابھی ابھی تو بتایا ہے کہ یہ دل پذیر ہوتا ہے اور تم نے دوبارہ دل پظیر لکھا ہے...... گوشمالی مزید اور تادیر ہوتی اور جب وہی لفظ ایک مرتبہ پھر غلط لکھا ہوا سامنے آتا تو پھر بید کی مدد لیتے کہ اس نالائق کو ابھی ابھی دوبارہ بتایا ہے کہ یہ دل پذیر ہے اور یہ اسے پھر سے دل پظیر لکھتا جاتا ہے...... ظاہر ہے ہم میں اتنی ہمت نہ تھی کہ انہیں بتاتے کہ ماسٹر صاحب یہ املا ایک ہی

نشست میں لکھی گئی ہے تو دل پظیر ہی چلتا جائے گا......

ہیڈ ماسٹر اگرچہ ہمیشہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس ہوتے لیکن زدوکوب کرنے میں انہیں بھی ملکہ حاصل تھا...... ان کے پاس ایک چھوٹا سا چمڑے سے مڑھا ہوا بید تھا جسے وہ اس طرح استعمال کرتے جیسے مغربی موسیقی کے کنڈکٹر آرکسٹرا کو ہدایات دیتے ہوئے ایک چھوٹی سی چھڑی کو ہوا میں لہراتے ہیں...... کبھی آہستگی سے اور کبھی نہایت سرعت سے اور کبھی ہوا میں ساکن کر کے یکدم دھم سے...... فرق صرف یہ ہوتا تھا کہ کنڈکٹر کی چھڑی موسیقی کو جنم دیتی تھی اور ہیڈ ماسٹر صاحب کا بید آہ وزاری تخلیق کرتا تھا...... اس مار پیٹ کے دوران البتہ ہیڈ ماسٹر صاحب کا چہرہ ہمیشہ ایک مسکراہٹ سے سجا رہتا اور وہ ہر ضرب سے پیشتر کہتے ''عزیز طلبہ ایسا تو نہیں کرتے'' ماسٹر دین محمد قصائی کے کمالات کے بارے میں اس سے پیشتر تفصیل سے لکھ چکا ہوں...... آپ قصائی کے لقب سے کچھ نہ کچھ جان گئے ہوں گے کہ بچوں کو زدوکوب کرنے میں وہ کس مقام پر فائز تھے...... وہ طالب علموں کو ہمیشہ دو خانوں میں بانٹ دیتے...... ایک ''جنتی'' اور دوسرے ''دوزخی''...... ''جنتی خوش نصیبوں کو کبھی کچھ نہ کہتے البتہ دوزخی حضرات کا مار مار کر بھرکس نکال دیتے اور احتیاطاً مارنے سے پیشتر کلاس روم کے دروازے بند کر دیتے تاکہ کوئی بچہ فرار نہ ہو جائے......

سکول میں مار دھاڑ کا یہ قصہ بہت طولانی ہے لیکن مندرجہ بالا زدوکوب کرنے کے طریقے نہایت مہذب اور مناسب تھے کہ یہ شہر کے سکولوں میں رائج تھے...... گاؤں میں ان دنوں تخلیقی طریقے مستعمل تھے یعنی بچے کو مرغا بنا دیا جاتا تھا...... اگر اس تخلیق کو اوج کمال پر لے جانا مقصود ہوتا تو اس مرغا بنے بچے کے اوپر ایک اور بچہ بٹھا دیا جاتا...... مجھے ذاتی طور پر یہ منفرد تجربہ ہو چکا ہے اور میں صدق دل سے یہ سمجھتا ہوں کہ جو شخص آج تک مرغا نہیں بنا وہ جانتا ہی نہیں کہ خوشگوار زندگی کیا ہے......

مجھے اپنے مطلب کا دادا جان چاہیے

پچھلے کسی کالم میں، میں نے ایک دادا جان کا ذکر کیا تھا اور ان کی گونا گوں خوبیوں اور خامیوں کا ذکر کیا تھا...... اور یہ بھی عرض کیا تھا کہ ان دادا جان کا ہمارے آپ کے کسی کے بھی دادا جان سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ کسی اور ہی قسم کے دادا جان ہیں جو بیک وقت سمگلنگ بھی کرتے ہیں اور پارسائی کی رسوم بھی پوری کرتے ہیں...... پتا نہیں یہ کیسے دادا جان ہیں...... کہاں ہوتے ہیں اور کدھر ہوتے ہیں اور ہوتے بھی ہیں یا نہیں...... بہر حال یہ ایک ایسے دادا جان ہیں جن سے ہر قسم کا مکالمہ ہو سکتا ہے...... چنانچہ میں نے مناسب خیال کیا کہ ان سے تازہ ترین صورت حال کے بارے میں تبادلہ خیال کیا جائے...... اور تازہ ترین صورت حال کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہیں کہ یہ اتنی تازہ نہیں رہی پھر بھی تازہ ترین ہی چلی جاتی ہے...... تو ان دادا جان سے کچھ باتیں ہو جائیں......

''دادا جان میرے ساتھ آپ کا تعارف کچھ نیا نیا ہے۔ یہ فرمائیں کہ آپ کس نوعیت کے دادا ہیں...... دادا...... بستی کے بڑے غنڈے کو بھی کہتے ہیں...... یعنی دادا گیری والے دادا...... تو آپ وہی ہیں؟''

''نہیں برخوردار یہ میری قسمت میں کہاں...... ویسے پہلے ہوا کرتا تھا......''

''تو اب کیوں نہیں ہیں؟''

''کیونکہ اب یہ اعزاز راج دلارے امریکہ کے پاس ہے...... اس کے پاس دادا گیری کے بھی حقوق ہیں۔''

''بہر حال یہ فرمائیں کہ شمالی اتحاد تو ملک پر قبضہ کر چکا۔ افغانستان پر بمباری کا سلسلہ کب ختم ہوگا؟''

''کون سی بمباری کا؟''

''کمال کرتے ہیں...... قندھار کے آس پاس پورے کے پورے گاؤں ملیامیٹ ہو رہے ہیں...... اور ان کے ساتھ ان کے مکین جن میں عورتیں بچے بوڑھے بھی شامل ہیں وہ بھی ملیامیٹ ہو رہے ہیں...... اور آپ پوچھتے ہیں کون سی بمباری......''

''برخوردار یہ بمباری تو نہیں یہ تو دہشت گردی کے خلاف جنگ ہے...... دنیا کے تمام ملک اسے سپورٹ کر رہے ہیں یہاں تک کہ افغانستان والے بھی اسے سپورٹ کر رہے ہیں......''

''افغانستان والے؟''

''ہاں شمالی اتحاد والے اور پشاور میں مقیم سب کے سب افغانی سپورٹ کر رہے ہیں۔''

''بہر حال یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے یہ کب ختم ہوگا......؟''

''جب اس سے مطلوبہ نتائج حاصل کر لیے جائیں گے...... اور یہ مطلوبہ نتائج کیا ہیں تو یہ تو کوئی بھی نہیں جانتا...... دادا بھی نہیں جانتا...... ویسے میرا اندازہ ہے کہ جب ٹریڈ ٹاور میں مرنے والوں سے دس گنا زیادہ افغان ہلاک ہو جائیں گے پھر بمباری بند کر دی جائے گی کیونکہ انہیں صرف پچاس ساٹھ ہزار باڈی بیگز یعنی لاشوں کے تھیلے درکار ہیں......''

''کئی ہزار تو ہو چکے......''

''ابھی وہ کہتے ہیں کہ اس دعوے کا کوئی ثبوت سامنے نہیں آیا...... کچھ قبریں دکھائی گئی ہیں لیکن ان میں دفن لاشیں نہیں دکھائی گئیں...... اس لیے ابھی گنتی شروع نہیں ہوئی......''

''لیکن دادا ٹریڈ ٹاورز کے سانحہ میں کوئی بچہ یا بوڑھا تو ہلاک نہیں ہوا تھا اور یہاں ان کو بھی اڑایا جا رہا ہے......''

''گنتی شروع کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے...... بیچ میں بچے اور بوڑھے بھی آ رہے ہیں اور انہیں شمار نہیں کیا جا سکتا...... ان سب کا کام تمام ہو تو صاف ستھری گنتی کا آغاز کیا جائے......''

''اس کا مطلب ہے کہ کاروباری لوگ ہیں......''

''ہاں...... نہایت ایماندار ہیں اور حساب کتاب کے ماہر ہیں...... ویسے مجھے تم سے ایک شکایت ہے......''

''مجھ سے؟''

''ہاں ہاں...... تم لوگوں سے جو کالم وغیرہ لکھتے ہیں۔ بش اور مشرف کو ذاتی مشورے دیتے ہیں...... سینے میں قوم کا درد رکھتے ہیں...... تم میں سے کتنے ہیں جنہوں نے اس قتل عام کو اپنے کالم کا موضوع بنایا ہے...... اس کی مذمت کی ہے...... اپنی شرمندگی کا اظہار کیا ہے......''

''دادا آپ ہم جیسے کالم نگاروں کو زیادہ سنجیدگی سے نہ لیا کیجئے...... ہم بھی آپ کی طرح خودغرض ہیں اور جانتے ہیں کہ کون ہماری سوکھی روٹی پر مکھن لگائے گا...... تو ہم صرف اس کو مکھن لگاتے ہیں...... ہم سے اس قسم کی توقع عبث ہے......''

''یہ تو خیر ایک شکایت تھی لیکن تم سے ایک سوال بھی پوچھنا چاہتا ہوں...... تم شمالی علاقہ جات کے بارے میں کچھ جانتے ہو...... شاہراہ قراقرم پر درجنوں بار سفر کر چکے ہو...... اس کی اہمیت سے آگاہ ہو...... تو اس شاہراہ کو جو کئی روز تک بلاک کر دیا گیا تھا اور کئی مقامات پر اسے اڑا دینے کی خاطر شنید ہے کہ بارود بھی لگا دیا گیا تھا تو اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے......''

''بھئی دادا...... یہ تو افغانستان پر امریکی حملے کی مخالفت میں ایک احتجاج تھا......''

''کیا تم نہیں جانتے کہ شمالی علاقہ جات میں لاکھوں لوگوں کا انحصار صرف اسی ایک شاہراہ پر ہے...... آٹا' دودھ' گوشت' تیل' چینی...... تمام خوراک اسی کے راستے وہاں تک پہنچتی ہے...... اس کے بند ہونے سے وہاں قحط کے آثار پیدا ہو گئے...... کم از کم ایک بیمار بچے کی موت صرف اس لیے ہو گئی کہ شاہراہ بند تھی اور اسے ہسپتال تک نہیں پہنچایا جا سکا......''

''دادا جب اپنے ملک کے خلاف ہی اعلان جہاد کر دیا جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے......''

''بے شک...... لیکن تم یہ بھی تو جانتے ہو کہ سیاچن کے میدان جنگ کو سامان

رسد اور اسلحہ بارود بھی اس شاہراہ کے راستے جاتا ہے...... اور کوئی راستہ نہیں...... تو کیا ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے جوان وہاں ہندوستان کے آگے ہتھیار ڈال دیں۔ شاہراہ کو بلاک کرنے والوں کو اس حقیقت کا علم نہیں تھا؟''

''یقیناً تھا...... لیکن دادا...... تم کیا جانو کہ اپنے ہی ملک کے خلاف اعلان جہاد کرنے میں کیسا لطف ہے...... اسلام آباد پر مارچ کرنے میں کتنا مزہ ہے...... گھر بیٹھے ثواب کمایا جا سکتا ہے...... ہمیں پاکستان کی کیا پروا ہے...... اسے کچھ ہو گیا تو ہم سب برادر اسلامی ملک افغانستان چلے جائیں گے......''

''ہجرت کی تحریک میں جو کچھ انہوں نے ہمارے آباؤاجداد کے ساتھ کیا تھا وہ بھول گئے ہو...... ہمیں کبھی ادھر سے خیر کی خبر بھی آئی ہے......''

''دادا میں نے تم سے ایک آسان سا سوال پوچھا تھا کہ بڑے دادا جو افغانستان پر بمباری کر رہے ہیں تو یہ کب ختم ہوگی اور تم بحث کرنے لگے ہو...... میرا ایمان کمزور کرنے کے درپے ہو...... مجھے تم جیسا دادا نہیں چاہیے۔ میں کوئی اور اپنے مطلب کا دادا جان تلاش کر لوں گا...... خدا حافظ۔''

بڑھتی جاتی دھند ہے اور اس کے پیچھے شہر ہے

بڑھتی جاتی دُھند ہے اور اس کے پیچھے شہر ہے
بڑھتی جاتی دُھند ہے اور اس کے پیچھے شام ہے
دُھندلے دُھندلے لوگ ہیں اور باغ ہیں اور شام ہے

(منیر نیازی)

جی ہاں ان دنوں بڑھتی جاتی دُھند ہے اور اس کے پیچھے شہر ہے...... شہر لاہور ہے...... یا شاید کوئی اور شہر ہے...... اس کے برج مینارے اور گلی کوچے اور محلے بازار تو دکھائی نہیں دیتے تو یہ کوئی بھی شہر ہو سکتا ہے...... دھند پہچان مٹا دیتی ہے...... دھند کا آسیب ہر روشنی کو نگل جاتا ہے۔ سڑکوں پر کاروں کی ہیڈلائٹس کی روشنی نیم مردہ جگنوؤں سے بھی مدھم ہے۔ ٹریفک لائٹس بجھی ہوئی لگتی ہیں' آسمان پر کوئی آواز نہیں' خاموشی ہے کیونکہ ہوائی جہاز اور ان کے مسافر ایئرپورٹ پر تھمے ہوئے ہیں...... لیکن اس کے باوجود شادیوں کی بھرمار ہے۔ میں اور میری بیگم درجنوں شادی کارڈوں کو خوف بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کئی ایسی شادیاں ہیں' جن میں شرکت نہ کریں تو بقیہ زندگی میں ہمارا حقہ پانی بند کر دیا جائے گا۔ بیگم حقہ تو نہیں پیتی لیکن پانی تو پیتی ہے اور پی پی کر ان کو کوستی ہے جنہوں نے ان دھند بھرے ایام میں شادیوں کی تاریخیں رکھی ہیں۔ یہ سوچے بغیر کہ جب یہ تاریخیں طے ہو رہی تھیں تب تو ہر جانب تیز دھوپ تھی... ایسی سفید اندھی دھند میں باہر جانا اندھا دھند اپنی موت کے منہ میں جانے کے مترادف ہے۔ کاریں ٹکرا رہی ہیں...... بسیں فٹ پاتھوں پر چڑھ رہی ہیں اور سائیکل سواران سے اپنی جان بچاتے پھرتے ہیں۔

ایک حقہ پانی بند قسم کی لازمی شادی کے لیے کار میں گھر سے نکلے۔ ایک درخت

کار کے اندر آنے کو تھا کہ بریک لگا لی...... ایک سائیکل پر سوار ہوتے ہوتے بچے...... چوک میں پہنچے تو حیران ہو گئے کہ اب کیا کریں کدھر جائیں...... اگر اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لیں تو شاید ہمیں زیادہ نظر آئے۔

"واپس چلیں' ضرور خودکشی کرنی ہے؟" بیگم نے صلاح دی۔

"لیکن واپس کیسے چلیں؟"

بیگم نے دروازہ کھولا اور کار سے اتر گئی اور اشارے کرنے لگی کہ یہاں سے موڑو...... اب خوشی تو بہت ہوئی کہ بیگم نے چلو اس عمر میں ہی سہی لیکن اشارے تو کیے' لیکن کار کو واپس گھر تک لانا ایک عذاب تھا۔ گیٹ کھلا چھوڑ کر گئے تھے جو بعد میں بچوں نے بند کر دیا چنانچہ سیدھے اس میں جا بھڑے اور وہ خودکار طریقے سے کھل گیا۔ گھر کے اندر آئے اور صاحب شادی کو فون کر کے اپنی بپتا سنائی کہ یوں تمہارے ہاں آنے کے لیے گھر سے نکلے تھے اور یوں باہر اتنی گھنی دھند ہے کہ تم تک پہنچنا ناممکن ہے۔ وہ صاحب اگرچہ قریبی دوست ہیں لیکن بجائے اس کے کہ ہمارے ساتھ اظہار ہمدردی کرتے فوراً طیش میں آ گئے۔ "میری بیٹی کی شادی ہے اور آپ لوگ دھند کا بہانہ بنا رہے ہو۔"

"یار تم گھر سے باہر نکل کر تو دیکھو کہ دھند کا کیا حال ہے۔"

"میں گھر سے باہر نکل کر ان مہمانوں کا استقبال کر رہا ہوں جو اس دھند کے باوجود میری بیٹی کی شادی پر پہنچ گئے ہیں' کیونکہ وہ تمہارے جیسے بہانہ ساز دوست نہیں ہیں۔"

"یار...... وہ...... یقیناً حادثہ ہو جائے گا۔"

"ہو جائے۔"

"ہم مر جائیں گے۔"

"مر جاؤ۔"

اب اس کے بعد کیا گنجائش رہ جاتی ہے چنانچہ میں نے کہا۔ "اچھا تو پھر تم کوئی طریقہ بتاؤ کہ ہم کیسے تم تک پہنچیں۔"

"بس تم سڑک پر آؤ پھر کسی بس یا کار کا انتظار کرو اور اپنی گاڑی اس کی بیک لائٹس پر نظریں جما کر چلاتے آؤ پہنچ جاؤ گے...... ورنہ زندگی بھر کے لیے......"

"حقہ پانی بند؟"

"بالکل......!"

چنانچہ پھر گھر سے نکلے۔ دوست کے نادر مشورے پر عمل کیا اور ایک بس کے پیچھے پیچھے نابیناؤں کی مانند چل دیئے۔ یہاں وہ لطیفہ یاد آیا کہ ہماری طرح ایک صاحب نے دھند کے موسم میں اپنی کار ایک اور کار کے پیچھے لگا دی۔ کچھ دیر کے بعد وہ کار رُک گئی تو ان صاحب نے ہارن بجا کر کہا کہ بھائی صاحب رُک کیوں گئے ہو چلتے کیوں نہیں۔ تو اگلی کار کے ڈرائیور نے جواب دیا' میں اپنے گیراج میں پہنچ گیا ہوں آگے کہاں جاؤں۔ بہر حال دھند میں ٹامک ٹوئیاں مارتے (اگرچہ وہ بھی دکھائی نہیں دے رہی تھیں) اس علاقے میں پہنچ ہی گئے جہاں شادی تھی...... کچھ لائٹس نظر آئیں تو کار پارک کی۔ استقبالیہ پر پہنچے تو میزبان کچھ اجنبی سے لگے۔ معلوم ہوا یہ ہمارے والی شادی نہیں ہے ویسے میزبانوں نے نہایت اُلفت کا مظاہرہ کیا اور کہنے لگے آج ہمارے مہمان بن جایئے اور آپس کی بات ہے کہ جس شادی پر آپ جا رہے ہیں وہاں تو صرف کشمیری چائے کی ایک پیالی ملے گی' ہم نے یہاں جلیبیوں کا بھی بندوبست کیا ہے۔

خدا خدا کر کے جب ہم درست جائے شادی پر پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ پنڈال مہمانوں سے بھرا ہوا ہے اور خوب رونق ہے۔ ہمارے دوست نے پھر شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ "دیکھ لو سب لوگ پہنچ گئے ہیں صرف تم بہانے بنا رہے تھے۔"

"ان کے پاس یقیناً ہیلی کاپٹر ہوں گے۔" میں نے خفت مٹانے کی خاطر ہنس کر کہا۔

"البتہ ایک پرابلم ہو گئی تھی...... یہاں آتے ہوئے دُولہا میاں کی کار آگے پیچھے ہو گئی تھی باقی بارات پہنچ گئی ہے...... اب دُولہا میاں کی کار کو تلاش کرنے کے لیے لوگ روانہ کیے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے دُولہا میاں جان بوجھ کر اِدھر اُدھر ہو گئے ہوں...... کاش ہماری شادی پر بھی اسی قسم کی دُھند ہوتی۔"

"منحوس باتیں نہ کرو...... بیٹی کا معاملہ ہے۔"

"سوری......" واقعی میں نے پُرمزاح ہونے کے شوق میں واہیات بات کی تھی۔

بہر حال دُولہا میاں کو کہیں قصور کے نواح میں پایا گیا اور پھر وہاں سے انہیں واپس لایا گیا۔

جانے اس شب بارات واپس کیسے گئی ہو گی۔

تو جناب بڑھتی جاتی دھند ہے اور اس کے پیچھے شہر ہے...... اور سردی بھی اتنی شدید ہے کہ ہیٹر کے سامنے بیٹھے ہوئے بھی انگلیاں اکڑ رہی ہیں۔ سفید کاغذ بھی برف کا بنا ہوا لگتا ہے اور لکھتے ہوئے ہاتھ کا وہ حصہ جو کاغذ پر آرام کرتا ہے ٹھنڈا ٹھار ہو رہا ہے...... لیکن یہ دھند تو کبھی نہ کبھی چھٹ جائے گی۔ جنگ کی اس دھند کا کیا ہو گا جو ہمارے پیارے ہمسایوں نے ہم پر مسلط کر رکھی ہے...... اس دھند میں بھی دونوں فریقوں کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا...... کسی لمحے بھی ٹکراؤ ہو سکتا ہے...... بش بھائی نے گیارہ ستمبر کے بعد دہشت گردی کے خلاف تقریر کیا کی سب لوگ اس تقریر کو طوطے کی طرح دُہرا رہے ہیں۔ پہل شیروِن صاحب نے کی...... پھر پیوٹن کو چھینکنا یاد آ گیا اور اب واجپائی بھائی کی حس شعر پھڑکی ہے تو "جنگ نامہ" پیش کرنے لگے ہیں...... پتہ نہیں کس ملک کا محاورہ ہے یا شاید میرا اپنا ہی ہے کہ دلدل میں کُشتی لڑنے والوں میں سے کوئی بھی نہیں جیتتا' دونوں غرق ہو جاتے ہیں...... ہم خواہ مخواہ کُشتی کرنا نہیں چاہتے اور وہ رانوں پر ہاتھ مار مار کر دنگل کرنے کے جنون میں مبتلا ہیں۔ حبیب جالب نے کہا تھا......

جنگ میں قتل سپاہی ہوں گے
سرخرو ظلِ الٰہی ہوں گے

تو اِدھر کے ظلِ الٰہی محض الیکشن میں سرخرو ہونے کے لیے اکھاڑے کی مٹی کھود رہے ہیں اور بڑھکیں مار رہے ہیں۔ پنجابی میں کہتے ہیں کہ بھاگنے والوں کے لیے میدان اور گڑھے ایک سے ہوتے ہیں...... چنانچہ دوڑ ہو گی تو نفع نقصان برابر کا ہو گا۔

بڑھتی جاتی دھند ہے اور اس کے پیچھے شہر ہے...... یہ دھند چھٹے تو امن کا شہر نظر آئے۔

ہمیں بربادی کے پیغمبر درکار نہیں

اگلے روز ایک نہایت سینئر اور اتفاق سے پڑھے لکھے بیوروکریٹ نے مجھے افطاری کی میز سے جدا کر کے ایک کونے میں کھڑا کر دیا اور کہنے لگے۔ ''تارڑ صاحب اب کیا ہوگا......!''

''اب کیا ہونا ہے...... افطاری کے بعد کارڈ میں درج ہے کہ ڈنر ہوگا...... تو اب ڈنر ہوگا......''

''ایکسی لنٹ جوک......'' وہ اتنا ہنسے کہ میں مجرم محسوس کرنے لگا...... میں نے سوچا' ہو نہ ہو میں نے دعوتی کارڈ کو غور سے نہیں پڑھا اور غلطی سے صرف افطاری پر آ گیا ہوں اور اب گھر واپس جا کر بیگم سے منت کروں گا کہ بھلی لوک مجھے دو پھلکے بنا دے اگر سالن نہیں بچا تو اچار سے کھا لوں گا...... ''ڈنر نہیں ہے؟'' میں نے ذرا پریشان ہو کر پوچھا۔

''کیوں نہیں کیوں نہیں......'' انہوں نے ذرا سرکاری لہجے میں کہا۔ ''آفٹر آل ہمیں نئے گورنر صاحب نے مدعو کیا ہے تو ڈنر کیوں نہیں ہوگا لیکن جناب میں تو پاکستان کے حوالے سے پوچھ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا......''

''کیوں پاکستان کو کیا ہوا ہے؟''

''افغانستان میں حکومت کی تبدیلی' اُدھر ہندوستان کے عزائم...... اور پھر ملکی صورت حال۔ بہت بُرے وقت آ رہے ہیں تارڑ صاحب...... میرا خیال تھا آپ میڈیا کے آدمی ہیں آپ کو اس تشویشناک صورت حال کا علم ہوگا...... ڈنر کون سے ہال میں ہے...... لان میں تو نہیں ہوگا سردی بڑھ گئی ہے۔'' اور وہ سر ہلاتے زیر لب کچھ بڑبڑاتے چلے گئے......

پاکستان شاید دنیا کا واحد ملک ہے جہاں صورت حال ہمیشہ تشویشناک ہوتی

ہے...... ہمارے بیشتر دانشور' اقتدار سے محروم سیاستدان' سیاسی تجزیہ نگار ہمہ وقت تشویش میں رہتے ہیں کہ بس ملک ٹوٹنے والا ہے...... اقتصادی حالت دگرگوں ہے...... قانون کے پرخچے اڑ رہے ہیں...... جرائم بڑھ گئے ہیں...... سرحدوں پر صورت حال تشویشناک ہے' اس لیے یہ ملک بس گیا کہ گیا...... اس میں بیشتر حوالے کسی حد تک درست ہیں...... اور پاکستان سے محبت کرنے والے ہر دل میں ایک رنج' ایک ملال ہے کہ ہمارا ملک موجودہ صورت حال سے کہیں بہتر ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ تیسری دنیا کے بیشتر ممالک انہی حالات سے دوچار ہیں لیکن وہاں کوئی بھی اس ملک کے ٹوٹنے کی بات نہیں کرتا...... افریقہ' جنوبی امریکہ اور ایشیا میں لاتعداد ایسے ملک ہیں جن کی نسبت ہم ایک جنت میں رہتے ہیں...... کہیں ایسا تو نہیں کہ بیشتر لوگ جو اس ملک کے ٹوٹنے کی بات کرتے ہیں' وہ ہیں جنہیں لوٹ مار میں ان کا حصہ نہیں ملا...... یا جتنا ملا ہے وہ اس کا موازنہ دوسرے ''خوش نصیبوں'' کے ساتھ کرتے ہیں تو انہیں احساس ہوتا ہے کہ انہیں تو بہت کم ملا ہے...... ایک عام آدمی نے کبھی اس ملک کی سلامتی کے بارے میں ایسے خدشات کا اظہار نہیں کیا...... بیشک وہ رشوت' جرم اور سماجی ناانصافی کی شکایت کرتا ہے لیکن وہ کبھی یہ نہیں کہتا کہ بس جی یہ ملک بس گیا کہ گیا......

ہمارے ہاں ''بربادی کے پیغام بر'' ایک بڑی تعداد میں موجود ہیں...... جمہوریت اور مذہب کے نام لیوا ہمہ وقت اعلان کرتے رہتے ہیں کہ اگر جمہوریت بحال نہ ہوئی تو ملک ٹوٹ جائے گا۔ اگر جمہوریت بحال ہو جاتی ہے تو فوراً پٹڑی تبدیل کر کے نعرہ زن ہوتے ہیں کہ اس حکومت کو بدلنا ہمارا منشور ہے کیونکہ اس پارٹی کی حکومت قائم رہی تو ملکی سلامتی کو خطرہ ہے۔ مذہبی جماعتیں پاکستان سے زیادہ دوسرے ملکوں کی سلامتی میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہیں۔ یہ نعرہ کتنے غیظ و غضب سے لگایا جاتا تھا کہ طالبان پاکستان کی سلامتی کی جنگ لڑ رہے ہیں...... اب اگر طالبان نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں تو کیا پاکستان ختم ہو گیا ہے...... جب ایک نیا ملک وجود میں آتا ہے تو وہ ریت کی دیواروں سے نہیں بنا ہوتا کہ کچھ عرصے کے بعد مسمار ہو جائے...... اس ملک کے حصول کے لیے برس ہا برس جدوجہد کی جاتی ہے' کروڑوں عوام کی خواہشوں اور قربانیوں سے وجود میں آتا ہے اور وہ تب تک زمین

بوس نہیں ہوتا جب تک کہ وہ کروڑوں عوام یہ تہیہ نہ کرلیں کہ ہم سب مشترکہ طور پر خودکشی کرنا چاہتے ہیں...... ملک اتنی آسانی سے صرف معاشی بدحالی' قانون کی بگڑتی ہوئی صورت حال اور کرپشن وغیرہ سے نہیں ٹوٹتے...... کمزور پڑ جاتے ہیں...... ان کی عزت نفس میں کمی ہو جاتی ہے لیکن وہ قائم رہتے ہیں......

ہم میں سے ہر ایک کا یہ فرض ہے کہ وہ بربادی کے ان پیغامبروں کا دامن پکڑیں اور ان سے کہیں کہ جناب آپ ہمیں کب تک ڈراتے رہیں گے جب تک کہ آپ برسر اقتدار نہیں آجاتے' آپ کی پارٹی کی پسند کی جمہوریت نہیں آجاتی' صرف آپ کے برانڈ کا اسلام زبردستی نافذ نہیں کیا جاتا...... ہمیں کبھی تو کوئی خوشخبری سنایا کیجئے...... کبھی تو یہ کہہ دیجئے کہ ہم اقتدار میں آئیں نہ آئیں' جو کچھ ہم نافذ کرنا چاہتے ہیں وہ نافذ ہو نہ ہو' یہ پاکستان قائم رہے گا اور ہم اس کی بہتری کے لیے کوشاں رہیں گے...... آپ مزے سے ممالک غیر میں شاپنگ کر رہے ہیں۔ اپنے بچوں کے ساتھ زیادہ وقت گزار رہے ہیں' صنعتیں قائم کر رہے ہیں۔ برطانوی شہریت سے لطف اندوز ہو رہے ہیں...... اپنی تنظیموں اور مدرسوں میں حکمرانی کرتے ہیں' ہیں پجاروز کے جلو میں سفر کرتے ہیں تو کرتے رہئے لیکن ہمیں بھی تو جینے دیجئے...... ہم بھی رزق حلال کے حصول کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔ ہمیں بھی تو شاپنگ کرنے کا۔ اپنے بچوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا...... صنعتیں قائم کرنے کا اور پجارو میں نہ سہی' ایک چھوٹے سے موٹر سائیکل پر سواری کرنے کا شوق ہے...... ہمیں ڈرا ڈرا کر ہلکان نہ کیجئے...... اس ملک کو انشاءاللہ کچھ بھی نہیں ہوگا......

یہاں میں وہ قصہ ایک مرتبہ پھر سنانا چاہتا ہوں کہ جب پاکستان وجود میں آیا تو ایک انگریز انجینئر نے رخصت ہوتے ہوئے اپنے ایک جونیئر کلرک محمد دین یا چراغ دین سے کہا کہ دیکھو ہم تو جا رہے ہیں لیکن تم سے یہ نہری نظام نہیں چلے گا...... یہ کہہ کر انگریز صاحب بہادر ولایت سدھار گئے۔ پچیس تیس برس بعد ان کے دل میں امنگ پیدا ہوئی کہ ذرا پاکستان جا کر دیکھوں تو سہی کہ وہاں کیا صورت حال ہے...... اب یہاں وہی چراغ دین چیف انجینئر ہو چکا تھا۔ وہ اپنے پرانے صاحب کو ایک بڑی نہر پر لے گیا اور کہا۔ ''صاحب آپ نے جاتے ہوئے کہا تھا کہ یہ نہریں ہم سے نہیں چلیں گی...... دیکھ لو چل

رہی ہیں ناں؟'' اس پر صاحب نے اس کے کندھے کو تھپک کر کہا۔ ''چراغ دین اس میں تمہارا کوئی کمال نہیں...... دراصل نہروں کو چلنے کی عادت ہوگئی ہے۔'' تو جناب اس ملک کو بھی چلنے کی عادت ہوگئی ہے...... بے شک اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں...... پنجابی میں ایک محاورہ ہے کہ ''پھاڈیاں دا رب گاڈی'' یعنی جو بالکل بیکار اور نکمے ہوں ان کی بیل گاڑی رب چلا رہا ہے تو یہ انشاءاللہ منزل پر پہنچ کر رہے گی...... آج کے اخبار میں ایک امریکی شہری کا خط ہے جو لکھتا ہے ''میں نے تین دسمبر کے ''نیویارک ٹائمز'' میں ایک تصویر دیکھی ہے جس میں افغانستان پر بمباری کے دوران ہلاک ہونے والے دو شہریوں کی لاشیں ہیں...... یہ لاشیں جلال آباد کے مردہ خانے میں تابوتوں میں پڑی ہیں...... ایک کفن میں لپٹی ہوئی لاش کے ننگے پاؤں کے ساتھ ایک چٹ چسپاں ہے جس پر ''ایدھی'' کا لفظ چھپا ہوا ہے یعنی ان لاشوں کی آبرومندانہ تدفین عبدالستار ایدھی کی تنظیم نے کی ہے...... اس تنظیم کی افغانستان میں موجودگی سے وہاں کے زخمیوں کو طبی امداد دی جا رہی ہے اور لاوارث لاشوں کو دفنایا جا رہا ہے...... یہاں امریکہ میں ہم ایک اسلامک فاؤنڈیشن کے انسانی ہمدردی کے کام سے بے حد متاثر ہوئے ہیں......'' اینڈی میکارڈ' نیویارک

کیا اس ملک کی سلامتی کو کوئی خطرہ ہو سکتا ہے جس میں ایدھی ایسے انسان موجود ہوں؟

بڑھیا کے خلاف جنگی جرائم کا مقدمہ

"میں خلفشار میں ہوں۔"

میں ہنسنے لگا۔ "یار تمہارا نام خلیفہ خلفشاری ہے تو ظاہر ہے تم خلفشار میں ہی ہو گے۔"

"نام کا شخصیت اور مزاج سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا...... ایک نابینا کا نام چراغ دین بھی تو ہو سکتا ہے...... میں انتشار میں تو رہتا ہوں کہ یہ ہمارا قومی مزاج ہے اور میں اپنی قوم سے الگ نہیں لیکن خلفشار میں نہیں رہتا۔"

"چلو پھر مجھے یہ بتا دو کہ تم خلفشار میں کیوں ہو؟"

"دراصل گیارہ ستمبر کے بعد......"

"خدا کے لیے خلیفہ......" میں چیخ اٹھا اور ہاتھ جوڑ دیے۔ "کیا ہم کسی اور موضوع پر بات نہیں کر سکتے۔ میں تنگ آ گیا ہوں اس گیارہ ستمبر کے سانحہ سے...... دنیا میں اور بھی تو بہت کچھ ہو رہا ہے جو اس سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔"

"مثلاً......؟"

"مثلاً...... مثلاً یہ کہ جاپانی شہزادی کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے...... دادو میں ایک درویش بڑھیا نے ایک بچے کو کھانے کی کوشش کی ہے۔"

"اوہو تارڑ میاں، میں بھی تو اسی درویش بڑھیا کے بارے میں خلفشار میں ہوں جس نے بچے کو کھانے کی کوشش کی ہے بلکہ کھا گئی ہے۔"

"کھا گئی ہے؟ نہیں نہیں، خلیفہ اس نے صرف ایک بچہ کھانے کی کوشش کی ہے اسے کھایا نہیں۔"

"تم تک پوری خبر نہیں پہنچی، میں جس درویش بڑھیا کے بارے میں بات کر رہا

ہوں وہ تو سینکڑوں نہیں ہزاروں پاکستانی بچے کھا گئی ہے۔"

"تم کون سی بڑھیا کے بارے میں بات کر رہے ہو خلیفہ؟"

"کابل کے ایک گٹر میں ایک پاکستانی کی مسخ شدہ لاش پڑی ہوئی ہے۔ ایک سو ساٹھ طالبان کو قطار میں کھڑا کر کے انہیں مشین گنوں سے ہلاک کر دیا گیا ہے اور ان میں سے بیشتر پاکستانی ہیں...... اور......"

"خلیفہ...... میں نے ہاتھ جوڑ کر درخواست کی تھی کہ تم گیارہ ستمبر اور افغانستان پر امریکی حملے کے بارے میں کوئی بات نہ کرو۔"

"میں اس کے بارے میں بات نہیں کر رہا۔ طالبان کے لیے میرے دل میں جو نرم گوشہ ہے وہ ڈاک کے ٹکٹ کے سائز کا بھی نہیں۔ لیکن میں ان پاکستانی بچوں اور نوجوانوں کا تو ماتم کر سکتا ہوں جنہیں بڑھیا نے ہلاک کر ڈالا۔ میں ان کے نظریات سے تو متفق نہیں ہوں لیکن ان کی ہلاکت سے نامتفق ہوں کہ وہ میرے وطن کے تھے۔"

"دیکھو خلیفہ! امریکہ نے اپنا انتقام لے لیا ہے اس کے پانچ ہزار بندے مارے گئے تھے تو اس نے پچاس ہزار افغانیوں کو ہلاک کر دیا۔ اگرچہ میں نے مشورہ تو دیا تھا کہ چونکہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں صرف تندرست اور توانا لوگ ہلاک ہوئے تھے ان میں بوڑھے اور بچے شامل نہیں تھے۔ اس لیے اگر افغانیوں اور طالبان کو مارنا ہے تو صرف نوجوانوں کو مارا جائے...... لیکن منی ایٹم بم ڈیزی کٹر اور بنکر بسٹر بم میں کوئی ایسا سسٹم نہیں ہے جو بچوں اور بوڑھوں میں تخصیص کر سکے اس لیے وہ بھی ہلاک ہو گئے۔ بہتر یہ تھا کہ امریکی فوج خود بہ نفس نفیس کابل اور مزار شریف میں جا کر یہ فریضہ سرانجام دیتی۔ لیکن اس میں ان کی جانوں کو خطرہ تھا اس لیے انہوں نے مناسب جانا کہ صرف مکمل تباہی کے بعد وہاں قدم رنجہ فرمایا جائے۔ اب رہ گئی پاکستانی طالبان کی بات تو انہیں کس بڑھیا نے کھایا ہے؟"

"ایک تو امریکی بڑھیا ہے جس نے کہا تھا کہ غیر ملکی طالبان کو ہلاک کر دینا بہت ضروری ہے انہیں گرفتار کرنا مناسب نہیں...... اور اسی پالیسی کے تحت مزار شریف کے نزدیک قلعہ جنگی میں تاریخ کا بدنام ترین قتل عام ہوا۔ جس نے ویت نام میں ہونے والے مائی لائی قتل عام کی یاد دلا دی۔ تم نے گردے اٹی مسخ شدہ لاشوں...... اور سینکڑوں لاشوں کی

تصویریں دیکھی ہوں گی جنہیں امریکی بہادروں نے بی باون طیاروں سے میزائلیں فائر کر کے نابود کر دیا۔"

"خلیفہ انہوں نے بھی تو ایک امریکی کو ہلاک کر دیا تھا۔ بین الاقوامی سٹاک ایکسچینج میں ایک امریکی برابر ہے ایک ہزار افغانیوں کے...... تو ابھی حساب برابر نہیں ہوا۔ ابھی انصاف ہونا باقی ہے۔"

"تم کس کی سائیڈ پر ہو؟"

"میں امریکی ڈالروں کی سائیڈ پر ہوں۔"

"تم نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ لاشوں کے جبڑوں کو چیر کر ان میں سے سونے کے دانت نکالے جا رہے ہیں۔"

"تو اس میں کیا برائی ہے...... سونا ضائع تو نہیں کرنا تھا...... یوں بھی یہ معمول کی بات ہے۔ نازی بھی تو مرے ہوئے یہودیوں کے دانتوں میں سے سونا نکالتے تھے اس لیے قانون میں اس کی گنجائش موجود تھی۔"

"اور جب پوری دنیا اور ایمنسٹی انٹرنیشنل یہ کہہ رہی ہے کہ یہ جنگی جرم ہے تو برطانیہ کے ایک وزیر نے بیان دیا ہے کہ اس کی انکوائری کروانے کی کیا ضرورت ہے۔ جنگ میں اس قسم کی ظالمانہ حرکتیں ہو ہی جاتی ہیں تو پھر نیورن برگ ٹرائل کیوں ہوا تھا۔ نازیوں سے بھی تو اسی قسم کی حرکتیں ہو گئی تھیں۔ میں تو اس تنہا طالبان کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں جو آخری خبریں آنے تک قلعہ جنگی کے ایک تہہ خانے میں راکٹ فائر کرنے کے باوجود زندہ ہے اور ہتھیار نہیں پھینک رہا۔"

"خلیفہ تم اس بڑھیا کے بارے میں بات کر رہے تھے جو پاکستانی بچے کھا گئی۔"

"ہاں...... میں چاہتا ہوں کہ اس بڑھیا کے خلاف جنگی جرائم کا مقدمہ دائر کروں۔"

"جنگی جرائم کے مقدمے کسی ملک کی جانب سے تو دائر کیے جا سکتے ہیں۔ کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں۔"

"چاہے اس فرد کے ہزاروں ہم وطن مارے جائیں...... ان کی لاشیں گٹروں میں

پھینک دی جائیں...... ان پر پٹرول چھڑک کر انہیں آگ لگا دی جائے۔ لیکن اس قتل عام میں صرف ایک بڑھیا ملوث نہیں...... ایک اور بڑھیا بھی ہے اور وہ بھی برابر کی قصوروار ہے۔"

"وہ کون سی بڑھیا ہے خلیفہ......؟"

"وہی جو ہزاروں نوجوانوں کو تلواروں اور عام ہتھیاروں سے مسلح کر کے سرحد کے پار لے جاتی ہے اور پھر انہیں موت کے منہ میں دھکیل کر اپنے چند ساتھیوں سمیت پاکستان بھاگ آتی ہے۔ اس بڑھیا پر بھی جنگی جرائم کا مقدمہ چلنا چاہیے۔"

"بھئی یہ بھی نارمل روٹین ہے...... اس قسم کی بڑھیا کبھی خود شہید نہیں ہوتی...... یہ اوّل تو سرحد پار نہیں جاتی 'صرف معصوم نوجوانوں کو اشتعال دلا کر انہیں موت کے منہ میں دھکیل دیتی ہے اور یا پھر جلسوں اور احتجاجی جلوسوں کی قیادت کرتی ہے۔ سیمیناروں میں فلسفے بیان کرتی ہے اور ایک پُر آسائش زندگی بسر کرتی ہے...... یہ اپنے بچوں کو یا تو امریکہ میں رکھتی ہے یا ڈیزل کی آمدنی سے انہیں متمول کرتی ہے اور یا پھر اسلام آباد پر حملہ آور ہونے کی دھمکیاں دیتی ہے۔"

"ہاں تارڑ...... ہمارے ساتھ یہی ہوتا آیا ہے۔ باہر جو بڑھیا ہے وہ ہم پر دھونس جماتی رہتی ہے کہ یا تو تم میرے ساتھ ہو یا پھر میرے خلاف۔ اور جو گھر کی بڑھیا ہے وہ ہمیں بلیک میل کرتی رہتی ہے اور نوجوانوں کو موت کے منہ میں دھکیلتی رہتی ہے۔ میں انہی کے خلاف جنگی جرائم کا مقدمہ درج کروانا چاہتا ہوں۔"

"جو تم نہیں کر سکتے۔"

"تو پھر کیا کروں؟"

"صبر۔"

"اور صبر کے علاوہ کیا میں افغانستان میں بیدردی سے مارے جانے والے پاکستانی نوجوانوں کا ماتم کر سکتا ہوں؟"

"ہاں وہ تم کر سکتے ہو کیونکہ جرم ضعیفی کی یہی سزا ہے...... صبر اور ماتم!"

ہدایت نامہ کالم نگاری برائے میٹرک پاس نوجوانان!

پچھلے دنوں لاہور کے گردونواح میں میٹرک کا نتیجہ منظرِ عام پر آیا۔

ان دنوں تو میٹرک پاس کو کوئی پوچھتا نہیں لیکن ہمارے زمانے میں میٹرک پاس کو ارسطو نہیں تو اس کے آس پاس کی کوئی شے سمجھا جاتا تھا۔ یہ تحقیق نہیں کی جاتی تھی کہ برخوردار کون سی ڈویژن میں پاس ہوا ہے صرف یہی کافی ہوتا تھا کہ بچہ میٹرک میں پاس ہوگیا ہے۔ چنانچہ بچے کی والدہ ماجدہ نتیجہ نکلنے پر محلے بھر میں اعلان کرتی پھرتی تھیں کہ ماشاءاللہ سے اپنا شریف میٹرک میں پاس ہوگیا ہے اور مبارکیں وصول کرتی پھرتی تھی...... اور میٹرک پاس بچے کی والدہ کہلانے لگتی تھیں۔ جس روز نتیجہ نکلنا ہوتا تھا تو شہر بھر میں ایک سنسنی سی پھیل جاتی تھی کہ آج میٹرک کا رزلٹ آرہا ہے۔ اخباروں کے دفاتر میں ہجوم رہتا تھا اور اہالیانِ شہر پوری رات جاگ کر گزارتے تھے۔ جاگ کر اس لیے بھی کہ بیشتر برخوردار فیل ہو جایا کرتے تھے۔

اور اب یہ صورت حال ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی کہ نتیجہ نکل چکا ہے۔ میٹرک کو سرے سے کوئی کوالیفیکیشن ہی نہیں سمجھا جاتا اور فرسٹ ڈویژن والوں کو بھی اچھے کالجوں میں داخلہ نہیں ملتا...... تو جس روز لاہور کے گردونواح میں میٹرک کا نتیجہ نکلا اس سے اگلے روز میرے ایک جاننے والے خوشی محمد نام کے میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔ ''تارڑ صاحب! دیر سے شادی کروانے کا ایک نقصان یہ ہوا ہے کہ یار دوستوں کی اولاد تعلیم سے فراغت حاصل کر چکی ہے اور میرا بڑا بیٹا اس برس میٹرک میں پاس ہوا ہے۔ اب بتائیں اس کا کیا کروں؟''

میں نے کہا۔ ''کالج میں داخل کروا دیں اور کیا کرنا ہے۔''

وہ بولے۔ ''نمبر بہت کم آئے ہیں...... کسی بھی کالج میں داخلہ نہیں مل سکتا۔ میں نے سوچا ہے کہ نالائق کو کسی کام پر لگا دوں...... بس اسی سلسلے میں آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں کہ کچھ مدد کیجئے۔''

''ملازمت ملنی تو بہت مشکل ہے......'' میں نے عرض کیا۔

''نہیں جی ملازم کروانے کو کون کہہ رہا ہے۔ آپ اسے کسی اخبار میں کالم نویس لگوا دیں۔''

''کالم نویس؟'' مجھے غصہ آگیا کہ میں بھی تو کالم نویسی کرتا رہتا ہوں۔ ''ایک میٹرک پاس کالم نویس کیسے بن سکتا ہے۔''

خوشی محمد مسکرانے لگے۔ ''تارڑ صاحب میں نے پوری تحقیق کر لی ہے...... آپ سمیت بیشتر کالم نویس کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ پڑھے لکھے ہوتے تو اپنے کالموں کے ساتھ اپنی تصویریں کیوں شائع کرواتے جنہیں دیکھ کر نہایت مضبوط اعصاب کے بچے بھی ڈر جاتے ہیں۔ بلکہ ایک کالم نویس اپنا تو بڑا انما چہرہ کالم کی پیشانی پر چھپواتے تھے تو ان کی تصویر کی وجہ سے اخبار کی اشاعت میں کمی ہوگئی۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر بچے کو کالم نویس بنانے کا فیصلہ کیا ہے تو آپ اس سلسلے میں راہنمائی کریں۔''

''بچے کو ادب' سیاست اور آداب کے بارے میں کچھ پتا ہے؟''

''بالکل نہیں......''

''تو پھر وہ کالم نگار بن سکتا ہے...... اسے تھوڑی سی راہنمائی کی ضرورت ہے۔''

خواتین و حضرات میں نے سوچا ہے کہ اس برس ماشاءاللہ آپ کے عزیزوں وغیرہ میں بھی کوئی نہ کوئی میٹرک پاس ہوا ہوگا اور کم نمبروں سے پاس ہوا ہوگا تو بہتر یہ ہے کہ جیسے میں نے ماضی میں افسانہ نگار' ناول نگار اور سفرنامہ نگار بننے کے بارے میں آپ کی راہنمائی کی تھی اسی طرز پر کالم نگار بننے کے لیے بھی ایک آسان اور مختصر ہدایت نامہ لکھ دیا جائے...... تو ملاحظہ فرمائیے۔

آپ کو (یعنی کالم نگار بننے کے خواہش مندوں کو) اب تک یہ تو معلوم ہو ہی گیا ہوگا کہ اس میدان میں کودنے کے لیے محض میٹرک پاس ہونا کافی ہے بلکہ یہ بھی آپ کے

لیے ضرورت سے زیادہ کوالیفیکیشن ہے...... سب سے پہلے آپ کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ آپ کس قسم کے کالم نگار بننا پسند فرمائیں گے...... ادبی' سیاسی' دردمند پاکستانی یا مخولیا کالم نگار...... یعنی طنز و مزاح کے نشتر اور بھالے چلانے والے کالم نگار...... پھر یہ فیصلہ کیجئے کہ آپ کے کالم کا عنوان کیا ہوگا...... یہ جتنا زیادہ مہمل اور بیہودہ ہوگا اتنا ہی آپ کا کالم پاپولر ہوگا۔ مثلاً ''فریادِ بلبل''۔ ''دل کے ٹکڑے''۔ ''نرگس کا جہاں''۔ ''لومڑ باتیں'' اور ''دوائے درد'' وغیرہ...... اگر آپ کالم نگاری کے علاوہ شاعری بھی شروع کردیں۔ خود نہیں شروع کر سکتے تو معاوضے پر کسی اور سے شروع کروالیں تو یہ سونے پر سہاگہ ہوجائے گا۔ سونا آپ مشاعرے پڑھ کر حاصل کرلیں گے اور پھر اس پر ایک خود توصیفی سہاگہ آپ اپنے کالم میں پھیریں گے...... اس کے علاوہ جو لوگ آپ کو مشاعروں اور تقریبات میں بلائیں گے آپ ان کی اور ان کے بال بچوں اور ان کے پالتو جانوروں کی تصویریں کالم کے ہمراہ چھاپ کر ثوابِ دارین حاصل کریں گے۔

سیاسی کالم لکھنے کے لیے کسی سیاسی بصیرت کی ہرگز ضرورت نہیں۔ آپ کو صرف یہ دیکھنا ہے کہ کون سا سورج چڑھ رہا ہے اور اس کی شان میں ڈفلیاں بجانی ہیں اور جب وہی سورج ڈوب رہا ہے تو اس میں سے دنیا جہان کے کیڑے نکالنے ہیں اور اپنے پچھلے کالموں میں سے حوالے دے کر یہ ثابت کرنا ہے کہ حضرات دیکھیں میں نے آج سے چھ ماہ قبل یہ لکھ دیا تھا کہ یہ صاحب ملک و قوم کو لے ڈوبیں گے۔ سیاسی کالم میں آپ بے دریغ مشورے دے سکتے ہیں اور کوئی آپ سے یہ نہیں پوچھے گا کہ آپ کی سیاسی لیاقت کیا ہے...... ایسے کالم عام طور پر...... ''میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ...... حب الوطنی کا تقاضا ہے کہ میں قوم کو خبردار کروں اور پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی'' ...... سے شروع ہوتے ہیں اور بینظیر' نواز شریف اور جنرل مشرف کو مشورے دیتے دیتے دردمندی کی ایک آہ پر ختم ہوجاتے ہیں۔

مزاحیہ کالم نگار بننے کے لیے شکل کا مزاحیہ ہونا اگرچہ شرط نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اگر یہ خوبی بخش دی ہو تو اس کے استعمال میں چنداں مضائقہ نہیں' یوں آپ کو دیگر کالم نگاروں پر برتری حاصل ہوجاتی ہے کہ قارئین بہر طور مسکرانے لگتے ہیں۔ آپ کی تحریر پر نہ

سہی آپ کی تصویر پر ہی سہی...... ہمارے ایک جاننے والے نے جان جوکھوں میں ڈال کر ایک اخبار میں کالم نویسی حاصل کرلی اور پھر اسی شام ٹی ہاؤس میں کھڑے ہوکر اعلان کیا کہ اب ہمارے پاس بھی کالم کی تلوار آگئی ہے' نپٹ لیں گے سب سے...... بس کالم نگار کی یہی سب سے بڑی بدقسمتی ہے کہ وہ کالم کو تلوار سمجھ لیتا ہے حالانکہ یہ استرا ہوتا ہے جس سے وہ اپنا گلا بھی کاٹ سکتا ہے۔ اس لیے بیشتر کالم نگار بالائی منزل سے محروم ہوچکے ہوتے ہیں۔

کالم نگاری کے آغاز میں مضافات کا دورہ بے حد مفید رہتا ہے۔ وہاں کے ادیب اور شاعر قومی دھارے سے الگ ہوتے ہیں اگرچہ اپنے شہری بھائیوں سے کہیں زیادہ قوتِ تخلیق رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ لائم لائٹ میں آئیں اسی لیے دو نمبر بلکہ تین نمبر شاعروں اور ادیبوں کی پذیرائی کرتے ہیں کہ ان کے پاس کالم کی تلوار ہوتی ہے...... چنانچہ وہ آپ کی بے حد آؤ بھگت کرتے ہیں۔ لفافے کے ہمراہ دیسی گھی اور باسمتی چاول بھی پیش کرتے ہیں اور آپ واپسی پر اپنے کالم میں نہایت مربیانہ انداز میں ان کی توصیف کرتے ہیں کہ مجھے تو بے حد حیرت ہوئی کہ تاندلیانوالہ میں ایسے ایسے باکمال شاعر چھپے بیٹھے ہیں۔ جوں جوں وقت گزرتا ہے آپ تاندلیانوالہ سے ترقی کرتے کرتے پہلے دبئی اور دوحہ پہنچتے ہیں اور پھر امریکہ میں جا قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ خصلت آپ کی وہاں بھی وہی رہتی ہے اور آپ وہاں دیسی گھی کی بجائے ڈالر وصول کرتے ہیں اور جشن منوا کر واپس آجاتے ہیں۔ وہاں آپ سے کوئی نہیں پوچھتا کہ آپ نے لکھا کیا ہے۔ وہ آپ کے تھوڑے لکھے کو بہت جانتے ہیں اور علامہ اقبالؒ اور حالی کے بعد آپ کو مصلحِ قوم کا خطاب دیتے ہیں۔ آپ ان کی توصیف میں کالم لکھ کر انہیں اس کی فوٹوسٹیٹ کاپیاں روانہ کرنے کو کبھی نہیں بھولتے۔ آپ ہمیشہ اپنے کالموں کو ادبِ عالیہ کے درجات پر فائز کرتے ہیں کیونکہ آپ کے پلّے اور کچھ نہیں ہوتا۔ کالم نگاری کے ذریعے اعلیٰ رُتبے حاصل کرنے کی بھی درخشاں مثالیں موجود ہیں جن کی تفصیل میں جانا مناسب نہیں......

البتہ ایک احتیاط ازحد ضروری ہے۔ آپ نے قطعی طور پر منو بھائی' انتظار حسین' احمد ندیم قاسمی یا مشفق خواجہ ایسا کالم نگار نہیں بننا...... آپ دیکھ لیجئے کہ ان کے اعزاز میں کبھی کوئی تقریب نہیں ہوتی اور یہ ہمیشہ اپنے گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ لوگ اس

کاروباری صنف سے یکسر ناواقف ہیں ان کی پیروی کرنا گویا اندھے کنویں میں چھلانگ لگانا ہے۔ آپ کو اندھے کنویں میں نہیں امریکہ اور دبئی میں چھلانگ لگانی ہے۔

کالم نگاری کے بارے میں یہ ہدایت نامہ نامکمل ہے کیونکہ اس کے لیے تو ایک پوری کتاب درکار ہے...... بہرحال اگر آپ کے برخوردار کے میٹرک میں نمبر کم آتے ہیں تو اس سے بہتر کوئی اور پیشہ نہیں جس میں تعلیم کی ضرورت ہے نہ عقل کی۔ بسم اللہ کیجئے...... اور برخوردار کے ہاتھ میں کالم کی تلوار پکڑا دیجئے...... جو کہ دراصل ایک استرا ہے۔

شاعری کو کوّا لے اڑا... شکریہ کوّے!

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ میں شاعروں سے بغض رکھتا ہوں حالانکہ یہ قطعی طور پر غلط ہے کیونکہ میں شاعروں سے صرف بغض نہیں رکھتا' بلکہ کدورت بھی رکھتا ہوں اور اس کی مختلف وجوہات ہیں۔

ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ میں لاکھ کوشش کے باوجود آج تک ایک شعر بھی نہیں لکھ سکا۔ لکھنا تو دُور کی بات ہے مجھے تو شعر یاد رکھنے میں بھی دشواری پیش آتی ہے اور جب کبھی میں کسی محفل میں اپنے شعری ذوق کی نمائش کرنے کے لیے کوئی شعر سنانے کی کوشش کرتا ہوں تو اکثر دونوں مصرعے الگ الگ شعروں کے سنا دیتا ہوں' چنانچہ ایسی شاعری سنانے سے عزت سادات بھی چلی جاتی ہے۔ مثلاً غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست...... رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی...... یا پھر طبیعت بہت ہی موزوں ہو تو ایک ہی شاعر کے الگ الگ مصرعے بھی مزا دے جاتے ہیں یعنی...... شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے...... ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے......

اس شعری مصیبت سے کچھ عرصہ پہلے چھٹکارا حاصل ہوا تھا جب برادر عزیز شعیب بن عزیز کا وہ مصرعہ زبان زدِ عام ہوا تھا کہ...... اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں...... ظاہر ہے پہلا مصرعہ بھی زبان زدِ عام ہوا تھا کہ...... اب اُداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں...... لیکن دوسرے مصرعے میں میری دلچسپی اس وجہ سے ہے کہ شعیب نے بتایا کہ آپ کسی بھی معروف شعر کے مصرعے کے بعد یہ مصرعہ ٹانک دیں تو شعر مزید بامعنی اور فرحت انگیز ہو جائے گا۔ مثلاً......

؎ دیواروں سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے
اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں

؎ غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے
اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں

میں نے آپ کو راہ دکھائی ہے اب اس پر چل نکلیے اور دیکھئے کیا کیا گل کھلتے ہیں۔

کچھ اسی قسم کا فارمولا رُوحی کنجاہی نے ایجاد کیا تھا۔ رُوحی کے نام کی وجہ سے ایک عرصے تک بہت سے حضرات کو غلط فہمی رہی لیکن جب روحی بانو نے روحی کنجاہی کو دیکھا تو انہوں نے اپنا نام بدلنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا تو انہی رُوحی کا ایک مصرعہ ہے کہ...... حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی...... اس مصرعے کو بھی آپ کسی مشہور شعر کے پہلے مصرعے کے بعد ٹانک دیں تو معانی کے نئے سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتے ہیں۔ مثلاً......

ہیرا کھیا جو گیا جھوٹھ بولیں...... حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی۔

اب ذرا غالب کو اس کسوٹی پر پرکھیے۔

دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور......
حالانکہ......

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد......
حالانکہ......

ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کا ایک تار
حالانکہ......

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر......
حالانکہ......

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا......
حالانکہ......

چنانچہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ یہ مصرعہ غالب کی شاعری کو بھی کہاں سے کہاں لے جاتا ہے۔ بہر حال بات ہو رہی تھی کہ میں شاعروں سے کیوں کدورت رکھتا ہوں اور میں یہاں اپنا بیان "میں سمجھتا ہوں کہ"...... سے شروع کروں گا۔ آپ جانتے ہوں گے کہ ادیب' شاعر اور دانشور وغیرہ اپنا ہر بیان "میں سمجھتا ہوں کہ" سے شروع کرتے ہیں۔ یعنی میں سمجھتا ہوں کہ اردو ادب زوال پذیر ہے سوائے میرے ادب کے...... میں سمجھتا ہوں کہ معاشرہ انحطاط پذیر ہے...... میں سمجھتا ہوں کہ میں کسی اور کو کچھ نہیں سمجھتا وغیرہ وغیرہ...... یہی میں سمجھتا ہوں کہ...... سیاستدان بھی بے دریغ استعمال کرتے ہیں حالانکہ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں رہے ہوتے...... سمجھ رہے ہوتے تو فوج کیوں آتی...... لیکن یہ کلیہ عوام الناس پر بھی تو لاگو ہوتا ہے کہ وہ بھی کچھ سمجھ رہے ہوتے تو ایسے سیاستدان اقتدار میں کیسے آتے۔ اب کہا جا رہا ہے کہ میں سمجھتا ہوں بلکہ سمجھتی ہوں کہ مجھے تیسری بار پاکستان کی وزیر اعظم ہونا چاہیے...... پس ثابت ہوا کہ پاکستان میں کوئی بھی کچھ بھی نہیں سمجھ رہا' اسی لیے یہ کشتی چلی جا رہی ہے خدا کے سہارے!

لیجئے میں "میں سمجھتا ہوں کہ......" میں اتنا الجھ گیا کہ مجھے وہ بیان ہی یاد نہیں رہا جو مجھے دینا تھا لیکن کچھ یاد آ رہا ہے کہ شاعری کے بارے میں کچھ زریں خیالات کا اظہار مقصود تھا۔ یہ اظہار مقصود' نور مقصود کے کچھ نہیں لگتے...... ہاں خوب یاد آیا کہ میں کیا کہنا چاہتا تھا۔ میں نے آج ہی ایک ادبی اخبار میں ایک خبر پڑھی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ان دنوں ادبی اخبار نکالنا بے حد "اِن" ہے اور اس کا ایڈیٹر فوری طور پر دنیائے ادب میں معتبر ہو جاتا ہے اور مشاعروں میں رتبہ' بلند پانے لگتا ہے تو ایسے ہی ایک ادبی اخبار میں ایک خبر پڑھی ہے جسے پڑھ کر دل خوشی سے جھوم اٹھا ہے۔

خبر یہ ہے کہ جڑانوالہ یا بوریوالہ میں ایک شاعر اپنے صحن میں بیٹھے اپنے اوّلین مجموعہ' کلام کے مسودے کو بہ نظر تحسین دیکھ رہے تھے اور اپنی شاعری پڑھتے ہوئے جھوم رہے تھے اور جھومتے جھومتے داد بھی دیتے جا رہے تھے کہ یکدم ایک کوا آیا اور ان کا مسودہ چھین کر نزدیکی درخت پر جا بیٹھا...... پھر اپنی چونچ سے مسودے کا ایک ایک ورق علیحدہ کر کے پھینکنے لگا...... خبر میں اس شاعر کے دو تین شعر بھی درج کیے گئے تھے جو ایک کوّے کو

نامہ بر بنانے کے سلسلے میں کہے گئے تھے۔ شاید میرا کالم پڑھنے والے میرے اس بیان پر
شک کریں لیکن یقین کیجئے میں نے اس خبر کا حوالہ دیتے ہوئے قطعی طور پر مبالغے سے کام
نہیں لیا۔ آپ میری نیت پر شک کر سکتے ہیں لیکن اس خبر کے حوالے پر نہیں۔

مثلاً آپ یہ شک کر سکتے ہیں کہ یہ کوا میرا تربیت شدہ ہے اور میں نے اس خوف
سے کہ کہیں ایک اور شعری مجموعہ شائع نہ ہو جائے اسے خصوصی طور پر جڑانوالہ یا بوریوالہ
روانہ کیا تھا...... ایک مرتبہ پھر یقین کیجئے کہ اگر ایسا ممکن ہوتا تو میں ایک نہیں سینکڑوں کوّوں کو
ٹریننگ دے کر پاکستان کے کونے کونے میں روانہ کر دیتا کہ جا کا گا جا...... جہاں کہیں بھی
شعری مجموعہ منظر عام پر آنے کو ہو اسے اٹھالا...... اور یوں خلق خدا کو آئندہ برسوں میں سکھ کا
سانس لینے دیتا' لیکن ایسا نہیں ہے۔ میرا اس کوّے سے قطعی طور پر کوئی تعلق نہیں' وہ زیادہ
سے زیادہ میرا ہم خیال ہو سکتا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ ان دنوں ہم خیالوں کی بے حد
پذیرائی ہو رہی ہے۔

ویسے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شاعر موصوف اپنا پورا مسوّدہ گود میں لے کر صحن
میں کیوں بیٹھے ہوئے تھے جب کہ ان کے علم میں ہوگا کہ مقامی کوّے ان کی شاعری سے
الرجک ہیں اور پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک کوا چاہے وہ کتنا ہی کوا کیوں نہ ہو' پورا مسوّدہ اپنی
چونچ میں دبا کر لے جائے مجھے یقین ہے کہ ایک نہیں بہت سارے کوّے ہوں گے اور یہ ان
کا مشترکہ فیصلہ ہوگا...... کوّوں کے بارے میں میری معلومات خاصی وسیع ہیں اور میں آپ
کو بتانا چاہتا ہوں کہ یہ دن کوّوں کے انڈے دینے کے ہوتے ہیں اور وہ بے حد حساس
ہو چکے ہوتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ اسلام آباد میں جب میں ہر صبح ٹیلی ویژن سٹیشن جایا کرتا تھا تو
صرف اِن موسموں میں اُن درختوں کے قریب سے گزرنے سے ذرا اجتناب کرتا تھا' جن پر
کوّوں کا بسیرا ہوتا تھا کیونکہ وہ مجھ پر حملہ آور ہو جاتے تھے...... میں اس صورت حال سے
بے حد پریشان سا تھا جب ایک کوا شناس نے مجھے اس حقیقت سے آشنا کیا جس حقیقت سے
میں نے ابھی ابھی آپ کو آشنا کیا ہے کہ انڈوں کا موسم ہے اور کوّے سمجھتے ہیں کہ تم ان کے
انڈے اتار کر ان سے ناشتہ کر لو گے...... تو یہ بھی ممکن ہے کہ ان شاعر نے کبھی کسی کوّے کا دل

دکھایا ہو۔ یعنی اسے اپنے شعر وغیرہ سنائے ہوں اور وہ کوا سمجھتا ہو کہ یہ شخص ایسے شعر کہتا ہے
تو پھر میرے انڈے بھی لے اڑے گا...... تو اس نے مسوّدہ لے کر اڑنے کا منصوبہ بنا لیا۔

البتہ خبر کے آخر میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ کوا مسوّدہ لے کر نزدیکی درخت پر جا بیٹھا
اور پھر مسوّدے کا ایک ایک ورق الگ الگ کر کے پھینکنے لگا...... پتہ نہیں وہ پڑھ کر پھینکتا تھا یا
یونہی پھینک دیتا تھا۔ گمان غالب ہے کہ پڑھ کر ہی پھینکتا ہوگا کہ یہ میں کیا اٹھا لایا ہوں......
اور یہی آخری سطریں میرے لیے قابل تشویش ہیں کہ کہیں شاعر نے وہ تمام اوراق پھر سے
اکٹھے نہ کر لیے ہوں...... اور مجھے ایک اور شعری مجموعے کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔

شاعر کو چاہیے کہ اگر آئندہ وہ ایک اور شعری مجموعہ...... خدانخواستہ ترتیب دے
کر صحن میں بیٹھے تو احتیاط کرے اور "میرے منڈیرے نہ بول...... جا کا گا...... کا گا جا......
گا تا رہے......

ویسے آپس کی بات ہے...... شاعری کو لے اڑنے والے کوّے تیار کرنا اتنا بُرا
آئیڈیا نہیں ہے۔

خلیفہ خلفشاری اور بل ڈوزر

خلیفہ خلفشاری آئے اور حسب معمول خلفشار میں مبتلا آئے...... نہ سلام نہ دُعا' چھوٹتے ہی بولے۔ ''یہ تم اپنے ایدھی صاحب کو سمجھا نہیں سکتے؟''

''خلیفہ...... تم نے جو یکدم ایدھی صاحب کی بات کی ہے تو میں بھی ہڑبڑا کر پوچھنے کو تھا کہ کون سے ایدھی صاحب...... پھر فوراً خیال آ گیا کہ اوہو اپنے ایدھی صاحب...... لیکن خلیفہ ایک قدیمی دوست سے ملاقات کا یہ کیا قرینہ ہے کہ سلام دُعا کے بغیر...... میرا حال چال دریافت کیے بغیر تم نے ایدھی صاحب کا تذکرہ چھیڑ دیا ہے...... بھئی ذرا آرام سے تشریف فرما ہو جاؤ...... چائے پانی نوش کرو اور پھر پوچھو......''

''نہیں نہیں۔'' خلیفہ حالت ایستادگی میں ہی رہے بیٹھے نہیں۔ ''میں بہت جلدی میں ہوں۔''

''کام کاج تو تم کچھ کرتے نہیں سوائے ناک بھوں چڑھانے کے شکایتیں اور گلے کرنے کے...... مایوسی پھیلانے کے' تو تمہیں جلدی کس بات کی ہے؟''

''میں نے ایک بلڈوزر خریدنا ہے۔''

''ہائیں...... یہ تم نے بلڈوزر ہی کہا ہے ناں...... جس کے ساتھ پرانی عمارتیں اور تجاوزات وغیرہ مسمار کرتے ہیں۔''

''کیا تم نے آج تک کسی ایسے بلڈوزر کو بھی دیکھا ہے جس سے عمارتیں تعمیر کی جاتی ہیں؟ کبھی عقل کو بھی ہاتھ مار لیا کرو۔''

''خلیفہ...... ساری عمر عقل کو ہاتھ مارتے رہے ہیں چنانچہ عقل بیچاری مار کھا کھا کر ادھ موئی ہو چکی ہے...... ویسے تم بھی کبھی ہوش کے ناخن لے لیا کرو۔ پوری قوم ہوش

کے ناخن لیے ہوئے ہے اور یہ ناخن اتنے بڑھ گئے ہیں کہ ان سے ایک دوسرے کا منہ نوچنے کا کام لیا جا رہا ہے...... اگر میں اکیلا ہوش کے ناخن نہیں لے سکا تو کون سی قیامت آ گئی...... بہرحال میں جلدی میں ہوں۔''

''اس لیے کہ تم ایک عدد بلڈوزر خریدنے جا رہے ہو...... صحیح؟''

''بالکل صحیح......''

''اس بلڈوزر کا کرو گے کیا؟''

''یہ میرا اپنا پرائیویٹ معاملہ ہے...... صرف تم مجھے یہ بتا دو کہ کیا تم اپنے ایدھی صاحب کو سمجھا نہیں سکتے؟

''ایدھی صاحب کے کام سے میں واقفیت رکھتا ہوں لیکن ذاتی طور پر صرف ایک بار ایک ایوارڈ وصول کرتے ہوئے ان سے ملاقات ہوئی تھی اور وہ بھی صرف ہاتھ ملایا تھا...... ویسے انہیں کیا سمجھانا ہے؟''

''یہ کہ باز آ جائیں...... غریب غربا...... نادار بچوں' زخمیوں اور حاجت مندوں کی مدد سے باز آ جائیں خواہ مخواہ قوم میں فتنہ فساد پھیلا رہے ہیں...... آرام سے گھر بیٹھیں اور اللہ اللہ کریں جیسے ہمارے بیشتر بزرگان دین کر رہے ہیں...... زیادہ سے زیادہ چندے جمع کر کے بلکہ زبردستی جمع کر کے کوئی مدرسہ کھول لیں اور دوسرے فرقوں کو دھمکیاں دیں...... اس عمر میں انہیں چین ہی نہیں آتا...... انہوں نے ٹھیکہ لے رکھا ہے انسانیت کی خدمت کرنے کا...... یہ پاکستانی انسانیت خدمت نہیں کروانا چاہتی تو زبردستی کیوں کرتے ہیں...... کبھی ہیلی کاپٹروں پر پہنچ جاتے ہیں اور کبھی ایمبولینس پر سوار ہو کر ہر حادثے کے موقع پر سب سے پہلے جا موجود ہوتے ہیں...... دوسرے لوگوں کے رزق پر بھی لات مارتے ہیں۔''

''کون سے دوسرے لوگوں کے رزق پر......''

''یہی جو انسانیت کی فلاح کے بارے میں تقریریں کرتے ہیں...... سیمینار منعقد کرواتے ہیں...... قوم کے اور مذہب کے غم میں گھر بیٹھے گھلتے جاتے ہیں...... ابھی پچھلے دنوں میرے گھر کی گھنٹی بجی اور بجتی چلی گئی...... باہر نکلا تو ایک بزرگ کھڑے تھے...... انہوں نے نہایت دھمکی آمیز لہجے میں کسی مدرسے کے لیے چندہ طلب کیا...... میں نے عرض کیا کہ

جناب میں مجبور ہوں منع کرنے کے باوجود میری گھروالی فالتو کپڑے، جوتے، رضائیاں ایدھی سنٹر میں دے آتی ہے صدقہ خیرات بھی انہی کے حوالے کر آتی ہے بلکہ بعض اوقات تو گھریلو اخراجات میں کنجوسی کر کے کچھ رقم جمع کر کے وہاں دے آتی ہے اس لیے چندے وغیرہ کی گنجائش نہیں...... اس پر بزرگ جلال میں آ گئے اور کہنے لگے...... اس کا تم لوگوں کو کوئی ثواب نہیں ملے گا...... یہ ایدھی ہے کیا...... مردے جمع کر کے دفناتا ہے...... یہاں تک کہ کتے بلیوں کی لاشوں کو بھی دفن کرتا ہے...... خود مردوں سے اتارے ہوئے کپڑے پہنتا ہے...... ایمبولینسوں پر سیر کرتا ہے...... پاگل بچوں کو اپنے گھر میں رکھتا ہے انہیں نہلاتا دُھلاتا ہے اور پیار کرتا ہے...... یہ کس شخص کو آپ چندے دیتے ہیں جو آپ کی بخشش کی گارنٹی نہیں دے سکتا جو کہ ہم دے سکتے ہیں...... تو تارڑ میاں میں ان لوگوں کے رزق کی بات کر رہا ہوں...... اس لیے کہتا ہوں کہ اپنے ایدھی کو سمجھا لو...... اس قسم کی حرکتیں ٹھیک نہیں۔"

"اچھا خلیفہ......" میں نے تنگ آ کر کہا۔ "کبھی ایدھی صاحب سے ملاقات ہوئی تو سمجھا دوں گا۔"

"اور ہاں......" خلیفہ کی پھر بھی تشفی نہ ہوئی۔ "یہ اٹلی کے صدر نے کس خوشی میں ایدھی صاحب کو قصر صدارت میں بلا کر اتنا بڑا ایوارڈ دیا ہے...... بھئی ہمارے کسی سیاستدان کو بلا لیتے...... کسی ریٹائرڈ جنرل پر یہ ایوارڈ نچھاور کرتے...... کسی صنعت کار یا شاعر کو بلا لیتے ایک مُردے ڈھونے والے کو کیوں بلا لیا...... کیا عزت رہ گئی ہماری......"

"خلیفہ دراصل وہ جو گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں آ گیا ہے ناں کہ انسانیت کی خدمت کرنے کے لیے ایدھی صاحب کی ایمبولینس فلیٹ دنیا میں سب سے بڑی ہے اس نے بڑا کام خراب کیا ہے...... یہ باہر کے لوگ ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے متاثر ہو جاتے ہیں...... مجھے تو خدشہ ہے کہ کہیں ایدھی صاحب کو نوبل انعام نہ مل جائے...... کیونکہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ انسانیت کی خدمت کرنے کے حوالے سے وہ مدر ٹریسا سے کہیں بلند درجے پر فائز ہیں...... مدر ٹریسا بہر طور اس لیے خدمت کرتی تھیں تا کہ لوگ ان کے عقیدے سے متاثر ہو کر اس میں شامل ہو جائیں جبکہ ایدھی صاحب کا اس قسم کا کوئی

نصب العین نہیں ہے...... کوئی لالچ نہیں ہے بلکہ تمہیں یاد ہوگا کہ جب کراچی میں سیاسی جذبات والوں نے ان کی ایمبولینسیں جلا دی تھیں تو انہوں نے بیان دیا تھا کہ میں تو صرف انسانوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں یہاں کے انسان مجھے ایسا نہیں کرنے دیں گے تو میں کسی اور ملک میں چلا جاؤں گا...... یوں بھی انہیں نوبل انعام ملتا ہے تو ہمیں خوشی کی بجائے شرمندگی ہوگی جیسے ڈاکٹر عبدالسلام کی وجہ سے ہوئی...... اس لیے ہمیں بھرپور کوشش کرنی چاہیے کہ انہیں نوبل انعام ہرگز نہ ملے۔"

"اللہ تمہارا بھلا کرے۔" خلیفہ خوش ہو گئے۔

"اب آئے ہو راہِ راست پر...... بھئی یہ انسانیت کی خدمت کرنا وغیرہ ہمیں راس نہیں آتا...... ایدھی صاحب نے ہمارا ریکارڈ خراب کر دیا ہے...... ذرا لاہور کو ہی دیکھو کہ بیشتر ہسپتال وغیرہ کفار نے ہی تعمیر کروائے تھے...... ہم اس قسم کی کارکردگی سے ہمیشہ دُور ہی رہے ہیں...... منشی ہسپتال اور شوکت خانم ہسپتال بھی بس غلطی سے ہی وجود میں آ گئے ہمیں خبر ہو جاتی تو ان کا بندوبست بھی کر لیتے...... میں تو کہتا ہوں کہ میو ہسپتال، لیڈی ولنگڈن ہسپتال، گنگارام ہسپتال، گلاب دیوی ہسپتال، جانکی دیوی ہسپتال وغیرہ کے نام تبدیل کر دینے چاہئیں اور لگے ہاتھوں ایف سی کالج، دیال سنگھ کالج، ایچی سن کالج، سینٹ انتھونی اور کیتھڈرل سکول وغیرہ کا بھی تیا پانچہ کر دینا چاہیے لیکن کوئی میری مانتا ہی نہیں۔"

"خلیفہ...... اتنی لمبی تقریر کر ڈالی اور پھر بھی نہیں بیٹھے...... بیٹھ جاؤ یار......"

"میں نے تمہیں بتایا تو ہے کہ میں جلدی میں ہوں...... میں تو یونہی رُک گیا...... بلڈوزر خریدنے جا رہا تھا...... بس چلتا ہوں۔"

اور واقعی خلیفہ جانے لگا تو میں نے اسے روک لیا۔ "خلیفہ کیا واقعی تم سنجیدہ ہو...... کیا تم سچ مچ ایک بلڈوزر خریدنے جا رہے ہو؟"

"بالکل خریدنے جا رہا ہوں۔"

"لیکن تم اس بلڈوزر کا کرو گے کیا؟"

"میں اس کی مدد سے پاکستان کی شاہراہوں پر ہر دس بیس کلومیٹر پر واقع ایدھی ایمبولینس کے ٹینٹ اور کمرے مسمار کر دوں گا...... انہیں ملیامیٹ کر دوں گا۔"

''لیکن خلیفہ..... وہ میڈیکل سینٹر تو ٹریفک کے حادثات میں زخمی ہونے والوں کی مدد کرتے ہیں..... ایمبولینس معمولی کرائے پر یا بالکل مفت جائے حادثے پر پہنچتی ہیں..... یہاں تک کہ پاکستانی فوج کی کسی گاڑی کو حادثہ پیش آ جائے تو بھی انہی سے مدد طلب کی جاتی ہے۔''

''یہ سب کچھ درست ہوگا..... لیکن نیشنل ہائی وے اتھارٹی کے حکام نے..... وہ جو کوئی بھی ہیں ایدھی صاحب کو قانونی نوٹس دے دیا ہے کہ یہ میڈیکل سنٹر ناجائز تجاوزات ہیں انہیں فوری طور پر مسمار کر دیا جائے اور میں ایک محب وطن پاکستانی کی حیثیت سے اپنی حکومت کے ان باضمیر اور روشن خیال حکام کی مدد کرنا چاہتا ہوں..... بلڈوزر کی مدد سے ان ناجائز تجاوزات کو گرا دینا چاہتا ہوں۔''

''واہ خلیفہ..... اللہ تعالیٰ نہ صرف ان حکام کو بلکہ تمہیں بھی اس نیک کام کرنے کا اجر دے گا..... مجھے بھی ساتھ لے چلو..... میں ایک کدال خرید کر اس کارِ خیر میں شریک ہونا چاہتا ہوں..... ایدھی صاحب یوں نہیں سمجھیں گے۔''

آ بیوی مجھے مار...

وہ کیا کہتے ہیں کہ آ بیل مجھے مار..... یہاں بیل کی بجائے ''بیوی'' لگا دیں تو آپ فی الفور سمجھ جائیں گے کہ پچھلے ہفتے میرے ساتھ کیا ہوا۔ ہوا یہ کہ اکلوتی بیٹی ڈاکٹر بن کر شادی شدہ ہو کر امریکہ میں جا بیٹھی..... بڑے بیٹے کی پوسٹنگ جدہ میں ہو گئی اور چھوٹے بیٹے اپنی ٹریننگ مکمل کرنے کے لیے جو صبح نکلتے ہیں تو رات کو گھر لوٹتے ہیں۔ اب چونکہ وہ اتنے چھوٹے بھی نہیں ہیں کہ ان سے پوچھا جائے کہ برخوردار آخر یہ تم کس قسم کی ٹریننگ لے رہے ہو جو رات گئے تک جاری رہتی ہے..... چنانچہ اس صورت حال میں ہم دونوں میاں بیوی تنہا گھر میں بیٹھے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ دیکھ کر ویسے تو ایک عرصے سے اکتا چکے تھے مگر تب کوئی اور شکل بھی دیکھنے کو مل جاتی تھی تو ''موڈ'' ذرا بہتر ہو جاتا تھا اور اب یہ کیفیت ہے کہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہنا ایک مجبوری ہے..... ایک ڈبل روٹی لاتے ہیں تو وہ ختم ہونے میں نہیں آتی۔ ایک بار ہانڈی پک جائے تو بیگم اگلے چار روز وہی آلو شوربہ پیش کرتی رہتی ہیں..... تو پچھلے ہفتے میں نے بیگم سے کہا کہ کم از کم تم تو کہیں باہر گھوم آیا کرو کیا ہر وقت منہ اٹھا کر مجھے دیکھتی رہتی ہو۔

''بس دل پر پتھر رکھ کر تمہیں دیکھتی ہوں لیکن اور کیا کروں..... اور میں اکیلی کیسے گھوم آیا کروں ڈرائیونگ تو مجھے آتی نہیں..... تم مجھے ایک ڈرائیور رکھ دو پھر دیکھنا کہ میں تمہاری شکل تک نہیں دیکھوں گی..... اپنے بہن بھائیوں سے ملوں گی فرینڈز کے ہاں چلی جایا کروں گی۔''

یہ ڈرائیور رکھنے والا مشورہ مجھے پسند نہ آیا کیونکہ شنید ہے کہ انہیں تنخواہ بھی دینی پڑتی ہے اور پٹرول میں بھی ہیرا پھیری کرتے ہیں۔ ''نہیں بیگم آج کل قابل اعتماد ڈرائیور

بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ یوں بھی سارا دن سر پر سوار رہے گا' کبھی چائے طلب کرے گا اور کبھی ایڈوانس......"

"بہانے نہ بناؤ...... ہماری جان پہچان کے سب لوگوں نے ڈرائیور رکھے ہوئے ہیں۔ اگر انہیں قابلِ اعتماد لوگ مل جاتے ہیں تو ہمیں بھی کوئی نہ کوئی مل جائے گا۔"

"بیگم آج تک تو ہم نے ڈرائیور رکھا نہیں...... اور پھر تم تھوڑی دیر گھوم پھر کر واپس آ جاؤ گی تو وہ سارا دن بیکار بیٹھا رہے گا۔"

"اس کی تم فکر ہی نہ کرو......" وہ ہنس کر بولی۔ "میں نے کہا ہے ناں کہ اگر ڈرائیور میرے پاس ہو تو پھر تمہاری شکل دیکھوں گی ہی نہیں...... صبح نکلا کروں گی اور سارا دن میل ملاقاتیں کر کے شام کو لوٹا کروں گی......"

"تو میں سارا دن کیا کروں گا......"

"تم عیش کرنا...... ٹیلی ویژن پر وہ چینل دیکھنا جو تم میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی بدل دیتے ہو...... فون پر اپنے چاہنے والوں سے گپیں لگانا اور بھوک لگے تو فرج میں مالٹے پڑے ہیں' ڈبل روٹی ہے' انڈے ہیں' پچھلے ہفتے کی دال ماش ہے۔ تمہیں اور کیا چاہیے۔ بس تم مجھے ڈرائیور رکھ دو۔"

تب میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ "بیگم مشکل سے پٹرول کے پیسے پورے ہوتے ہیں ڈرائیور کی تنخواہ کہاں سے دیں گے۔"

"تنخواہ میرے ذمے......" اس نے فوراً کہا۔

"تم کہاں سے دو گی...... ابھی کل دوپٹہ رنگوانے کے لیے تم نے بیس روپے مجھ سے ادھار لیے تھے۔"

"تمہیں اس سے کیا کہ تنخواہ کہاں سے دوں گی...... میں ادھر ادھر سے بچت کر کے کچھ رقم نکال لوں گی۔"

مجھے معلوم تھا کہ یہ جو ادھر ادھر سے بچت ہوئی ہے وہ میرے سگریٹ کم ہونے ہیں' میرا ماہانہ خرچہ کم ہونا ہے اور شاید خوراک بھی آدھی رہ جائے۔ "تمہیں پتہ ہے کہ ڈرائیور کی تنخواہ ان دنوں تین چار ہزاروں روپے سے کم نہیں۔"

"میں نے کہہ جو دیا ہے کہ تنخواہ میرے ذمے...... تم ڈرائیور کا بندوبست کرو۔"

تب مجھے ایک نہایت نادر خیال آیا۔ مجھے اس قسم کے نادر خیال اکثر آیا کرتے ہیں لیکن کوئی بھی ان سے مستفید نہیں ہوتا...... یہ نادر خیال آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام وغیرہ قسم کا تھا۔

"بیگم تم مجھے ڈرائیور رکھ لو اور بے شک چار کی بجائے دو ہزار تنخواہ دے دیا کرو۔"

"قبول ہے؟" بیگم نے کھل کر کہا۔

"ہاں قبول ہے۔ ویسے پہلی بار تمہارے برابر میں بیٹھ کر جو "قبول ہے" کہا تھا اس کا خمیازہ آج تک بھگت رہا ہوں۔ اللہ کرے اس "قبول ہے" کے نتائج ذرا بہتر برآمد ہوں...... تو اٹھو ڈرائیور حاضر ہے۔"

"اب اتنی جلدی بھی کیا...... کل صبح حاضر ہو جانا۔"

اگلی صبح...... بلکہ صبح سویرے بیگم نے کچوکے دے کر جگا دیا۔ "کیسے سُست الوجود ڈرائیور ہو' ابھی تک سوئے پڑے ہو...... اٹھو اور اٹھ کر کار کو پانی سے صاف کرو...... میں نے جولڑکا کار دھونے کے لیے پارٹ ٹائم رکھا ہوا تھا اسے جواب دے دیا ہے۔"

"لیکن یہ تو میری ڈرائیوری میں شامل نہیں۔"

"شامل ہے...... تمام ڈرائیور صبح اٹھ کر کاریں دھوتے ہیں...... اٹھو تنخواہ کس بات کی لیتے ہو۔"

چنانچہ ہم بادل ناخواستہ اٹھے...... نیکر اور بنیان پہنی اور پائپ تھام کر کار دھونے میں جت گئے...... تھوڑی دیر بعد گیٹ کے باہر ایک موٹر سائیکل رُکا۔ ایک صاحب مسکراتے ہوئے اندر آ گئے اور میں اس سمے ٹائر دھونے میں مشغول تھا۔

"آہا تارڑ صاحب...... جناب آپ تو اس ملک کے ادیبوں اور دانشوروں کے لیے ایک مثال ہیں...... کیا سادگی ہے' کیا درویش صفت لوگ ہیں...... واہ......"

اب مجھے یاد آیا کہ کسی اخبار کے ادبی صفحے کے مدیر کو انٹرویو کا وقت دے رکھا تھا اور یہ وہی تھے جو آدھمکے تھے۔ چنانچہ میں نے کار کو نہلانے اور چمکانے کے دوران ادب عالیہ پر اپنے سنہری خیالات کو بیان کیا۔

پچھلے پہر بیگم نے اپنی بڑی بہن سے ملنے کا پروگرام تیار کیا اور کہا...... چلو!
میں تو سٹیئرنگ پر ہی بیٹھا لیکن بیگم پچھلا دروازہ کھول کر پچھلی نشست پر براجمان ہوگئیں۔
میں نے برابر میں آ کر بیٹھنے کو کہا تو ناراض ہوگئیں کہ بھلا کوئی ڈرائیور کے ساتھ بھی بیٹھتا
ہے۔ بڑی بہن کے گھر پہنچے تو مجھے باہر انتظار کرنے کو کہا۔ میں ایک اچھے اور فرض شناس
ڈرائیور کی مانند بیٹھے رہنے کی بجائے کار پر کپڑا پھیرنے لگا۔ اس دوران اندر سے چائے بھی
آ گئی اور ساتھ ہی بیگم بھی برآمد ہوگئیں۔ ان کے ہمراہ ان کی بڑی بہن یعنی میری بڑی سالی
بھی تھیں۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ بھائی جان آپ اندر کیوں نہیں آئے۔ میں نے
کوئی لنگڑا سا بہانہ کیا تو ناراض ہوگئیں۔ ''لوگ کہتے تھے کہ شہرت نے آپ کا دماغ خراب
کر دیا ہے لیکن میں مانتی نہیں تھی...... آپ اب ہمیں اس لائق بھی نہیں سمجھتے کہ ہمارے گھر
کے اندر آئیں۔ ٹھیک ہے ہم غریب لوگ ہیں لیکن آپ بھی تو ادھار مانگ مانگ کر گزارہ
کرتے ہیں۔'' اسی دوران مجال ہے جو بیگم نے اصل صورت حال کی طرف اشارہ بھی کیا
ہو تو...... اطمینان سے پچھلی نشست پر براجمان رہیں...... بعد میں، میں نے شکایت کی تو
کہنے لگیں، میں نے باہر انتظار کرنے کو کہا تھا یہ تو نہیں کہا تھا کہ میری سگی بڑی بہن کو اندر جا کر
سلام بھی نہ کرو۔

بڑی بہن کے بعد بیگم چھوٹی بہن کے ہاں گئیں۔ پھر بڑے بھائی کے ہاں قدم
رنجہ فرمایا اور پھر چھوٹے بھائی کو جا سلام کیا۔ اور شام ہوئی تو کہنے لگیں اب مجھے لبرٹی مارکیٹ
لے چلو شاپنگ کرنی ہے۔ وہاں پہنچے تو کہنے لگیں۔ پیسے نکالو مجھے شاپنگ کرنی ہے۔ میں
نے کہا، میں تو بی بی جی ڈرائیور ہوں، بیگمات ڈرائیوروں سے پیسے نہیں مانگتیں۔ کہنے
لگیں...... تم دو منٹ کے لیے ڈرائیور سے خاوند بن جاؤ اور سیدھی طرح پیسے نکالو...... میں
نے بٹوے میں جو کچھ تھا، ڈھیر کر دیا۔

پورا ہفتہ اسی دھکم پیل میں گزرا۔ اتنی ڈرائیونگ کی عادت نہ تھی اس لیے کل صبح
اٹھتے ہی میں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''بیگم صاحبہ آپ مہربانی کر کے مجھے فارغ کر دیجئے۔
ایک ہفتے کی تنخواہ عنایت کر دیجئے میں آپ کی نوکری نہیں کر سکتا۔''
''تم ٹھیک کہتے تھے۔'' انہوں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ''آج کل قابلِ اعتماد

ڈرائیور نہیں ملتے...... تمہارے لیے میں نے کیا نہیں کیا...... جہاں بھی لے کر جاتی تھی، اندر
سے چائے اور بسکٹ بھیجتی تھی، کھانے کا وقت ہوتا تھا تو نقد پندرہ روپے تمہیں دیتی تھی کہ
جاؤ جا کر عیش کرو...... تمہیں تکلیف کیا ہے۔''
''کوئی تکلیف نہیں...... آپ میری تنخواہ عنایت کر دیں، مجھے نہیں کرنی نوکری۔''
''تنخواہ کے پیسے تو مجھے تمہارے جیب خرچ سے نکالنے تھے اور سگریٹ بند
کر دینے تھے...... تم بھی کیا یاد کرو گے۔ جاؤ، سگریٹ پیو اور تمہیں جیب خرچ بھی وہی ملے گا
جو پہلے ملتا تھا۔ اب مجھے میری بڑی پھوپھی کے گھر لے چلو۔''
''میں اب تمہارا ڈرائیور نہیں ہوں۔''
''خاوند تو ہو ناں...... پلیز ڈارلنگ......''
''ڈارلنگ'' کا لفظ سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ بیگم نے زندگی میں پہلی
بار مجھے اتنے پیار سے ڈارلنگ کہا تھا اور میں پھر سے ڈرائیور بن گیا...... لیکن اس بار تنخواہ
کے بغیر......

میری یادداشت ''گوتا'' کھا جاتی ہے

میری یادداشت ''غوطہ'' کھا جاتی ہے۔

یعنی اچھی بھلی سطح آب پر تیر رہی ہوتی ہے اور پھر یکدم ایک جل مرغی کی مانند ڈبکی لگا جاتی ہے اور بہت دیر کے بعد جب اس غوطے سے ابھرتی ہے تو کچھ یاد نہیں رہتا کہ اس دوران کیا ہوا تھا۔

گلگت سے چترال کے طویل سفر کے دوران ایک جیپ ڈرائیور اسلم نام کا تھا جو فن ڈرائیونگ میں تو یکتا تھا لیکن کسی پیدائشی نقص کی بنا پر ہکلاتا بہت تھا یعنی جتنی دیر میں وہ آپ کو وارننگ دیتا تھا کہ...... تا تا...... تار...... رڑ...... صاحب...... آ آ گے...... کھ کھ کھڈا ہے اتنی دیر میں جیپ اس کھڈے پر سے گزر جاتی تھی اور آپ کا سر اس کی چھت سے ٹکرا کر پلپلا ہو چکا ہوتا تھا اور پھر وہ نہایت شرمندہ ہو کر کہتا تھا...... سو سوری...... میری ز زبان...... گوتا کھا جاتی ہے۔

تو میری یادداشت بھی ''گوتا'' یعنی غوطہ کھا جاتی ہے اور میں بھی حسب توفیق بے حد شرمندہ ہوتا ہوں۔

یہ نہیں کہ سٹھیا جانے کے باعث ایسا ہوا ہے بلکہ مزاج لڑکپن سے ہی عاشقانہ تھا۔ بچپن میں بھی یہی کیفیت تھی۔ جوانی بھی یادداشت میں ڈبکیاں لگاتے گزری البتہ اب مجھے یہ آسانی ہے کہ میں اپنے بھلکڑ پن کو عمر کے کھاتے میں ڈال کر سرخرو ہو جاتا ہوں۔ لوگوں کے نام یاد نہیں رہتے۔ ان کے بچوں کی تعداد یاد نہیں رہتی۔ وہ رہ جائے تو یہ یاد نہیں رہتا کہ شادی شدہ ہیں یا نہیں۔ اور شادیوں کی تاریخیں یاد نہیں رہتیں...... بہت بار ایسا ہوا کہ ہم سج سنور کر شادی والے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ شادی تو کل ہے اور اگر بہت زیادہ احتیاط برتی تو شادی کے ایک دن بعد قدم رنجہ فرمایا اور کھسیانی سی مسکراہٹ کے ساتھ

معذرت کر کے لوٹ آئے۔ پچھلے دنوں قوی خان کے بیٹے کی شادی تھی...... قوی اور منور سعید ٹیلی ویژن کے بڑے اداکار ہیں لیکن مزاج میں درویشی اور شرافت اتنی ہے کہ لگتا ہے کہ ابھی ابھی کسی غار میں چلہ کاٹ کر نکلے ہیں چنانچہ میں نے خان صاحب کے بیٹے کی شادی کی تاریخ خوب رٹے لگا کر منہ زبانی یاد کر لی...... عین اس تاریخ پر وقت کے مطابق ان کے گھر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں گھر اگرچہ بجلی کے قمقموں سے چمچما رہا ہے لیکن بالکل ویران پڑا ہے...... بجھی ہوئی آگ پر چند دیگیں ٹھنڈی ہو رہی ہیں اور ایک دو حضرات شامیانے سمیٹ رہے ہیں...... یہ صورت حال دیکھ کر بیگم نے بے چارگی کی ایک نہایت ٹھنڈی آہ بھری اور کہنے لگی۔ ''تم تو کہتے تھے کہ تمہیں اس شادی کی تاریخ منہ زبانی یاد ہے۔''

''میں قسم کھا کر کہتا ہوں بیگم کہ آج ہی کی تاریخ تھی...... کارڈ گھر چھوڑ آئے ورنہ تم چیک کر سکتی تھی......''

''اگر آج ہی کی تاریخ ہے تو گھر ویران کیوں پڑا ہے۔ اور شامیانے کیوں سمیٹے جا رہے ہیں۔''

''البتہ......!'' میں نے صرف اتنا کہا۔

''البتہ کیا......!''

''بس یہی کہ البتہ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔''

حیرت انگیز طور پر بیگم نے مجھے زیادہ نہیں ڈانٹا صرف اتنا کہا کہ...... ''بس تم گاؤدی ہی رہو گے...... عزیز دوستوں کی خوشیوں میں شریک نہیں ہو سکتے...... صرف اپنے حافظے کی خرابی کے باعث اور مجھے بھی شرمندہ کرتے ہو...... کل پارک میں سیر کرتے ہوئے اگر قوی کی بیگم کا سامنا ہو گیا تو اسے کیا منہ دکھاؤں گی......''

گھر واپس پہنچ کر کارڈ چیک کیا تو...... تاریخ وہی تھی...... میں نے اگلے روز قوی خان کو فون کیا تو میرے کہنے سے پہلے ہی بول اٹھے کہ بڑے افسوس کی بات ہے تارڑ صاحب...... ہم لوگ انتظار ہی کرتے رہے...... میں نے پوری پوزیشن بیان کر دی تو کھانس کر بولے۔ ''اچھا اچھا تو آپ تشریف لائے تھے۔ دراصل گھر میں جگہ کم ہو گئی تھی تو ہم فوراً ایک قریبی شادی گھر میں منتقل ہو گئے تھے تو آپ وہاں کسی ملازم سے پوچھ لیتے تو وہ بتا دیتا۔''

اب بیگم نے پھر مجھ پر ہی الزام دھرا کہ ہاں وہاں ایک دو ملازم نظر آ رہے تھے اور تم ان سے کچھ پوچھے بغیر ہی واپس آ گئے...... یعنی میں عین وقت کے مطابق تاریخ کے مطابق بھی کسی شادی پر جاؤں تو وہ وہاں سے منتقل ہو جاتی ہے۔

اکثر اوقات "اخبار جہاں" سے فون آتا ہے کہ تارڑ صاحب ابھی تک آپ کا کالم وصول نہیں ہوا...... میں کہتا ہوں کہ جی آج سوموار ہے...... شام تک پوسٹ کر دوں گا بدھ کے روز انشاء اللہ مل جائے گا اور ادھر سے کہا جاتا ہے کہ جی آج سوموار نہیں آج تو بدھ ہے...... اب میں بحث بھی نہیں کر سکتا کہ دنیا کے سب سے بڑے اردو ہفت روزہ کے سٹاف کے لوگ تو جانتے ہی ہوں گے کہ آج کون سا دن ہے...... لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ آج سوموار کی بجائے بدھ کیسے ہو گیا...... بلکہ درمیان میں سے منگل کیسے غوطہ کھا گیا۔

کوئی اچھی کتاب پڑھتا ہوں تو وہ باقاعدہ منہ زبانی یاد ہو جاتی ہے۔ اس کے کردار، واقعات اور منظر یوں ذہن نشین ہو جاتے ہیں کہ آپ بے شک کسی بھی صفحے کو کھول کر میرا امتحان لے سکتے ہیں...... مجھ سے ایک سو صفحے کا مقالہ لکھوا سکتے ہیں لیکن اگلے دو چار دن میں کرداروں کے نام یادداشت سے فرار ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور دو چار ہفتوں کے بعد کتاب کا نام بھی بمشکل ذہن میں آتا ہے...... کسی محفل میں اپنی علمیت کا رُعب جمانے کی خاطر حوالے دے دوں اور ادھر سے کوئی سوال آ جائے تو بغلیں جھانکنے لگتا ہوں اور یار لوگ سمجھتے ہیں کہ میں گپ شپ لگا رہا تھا...... اس سلسلے میں، میں ایک معنک نقاد کا بے حد معترف ہوا کرتا تھا۔ وہ حلقہ اربابِ ذوق کے اجلاس کے دوران کسی بھی افسانے، غزل یا مضمون پر اتنی مدلل گفتگو فرماتے تھے کہ انسان دنگ رہ جاتا تھا...... اور ایسے ایسے نایاب حوالہ جات دیتے چلے جاتے ہیں کہ حاضرین مرعوبیت سے سر جھکائے ان کے ارشادات سنتے چلے جاتے تھے...... عام طور پر وہ بحث کا آغاز کچھ اس طرح سے کرتے تھے کہ اس مضمون میں جو نکتہ اٹھایا گیا ہے اس کی آفاقیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے...... اس ضمن میں امام ابوحنیفہ کا قول ہے کہ...... اگرچہ امام غزالی ان سے اتفاق نہیں کرتے تھے اور پیر رومی نے جب کہا کہ افلاک کی ماہیت کو جاننے کے لیے صرف پیمانۂ قلب درکار ہے تو کیا خوب کہا، جبکہ فتوحات مکیہ میں آیا ہے کہ...... حالانکہ افلاطون صدیوں پیشتر اعلان کر چکا

تھا کہ...... البتہ ن۔م۔ راشد کی شاعری میں اپنے ان افکار کی جھلک ملتی ہے جبکہ فیض صاحب کو دیکھئے تو وہ کسی اور جانب راغب نظر آتے ہیں۔

ایک روز انہوں نے نطشے کی مشہور کتاب "زرتشت نے کہا" سے ایک طویل اقتباس منہ زبانی سنا دیا...... یہ کتاب ایک دوست نے مجھے اس غلط فہمی میں تحفے کے طور پر پیش کی تھی کہ میں شاید فلسفے وغیرہ کا بھی شوقین ہوں...... میں نے دل پر جبر کر کے دو چار صفحے پڑھے جو سر سے گزر گئے۔ میں نے سوچا، چار پانچ سو صفحے کی پوری کتاب کو اگر سر سے گزارا تو شاید سر ہی نہ رہے، اس لیے اسے فوراً بند کر کے شیلف میں ایسی جگہ سجا لیا جہاں ہر کوئی اسے دیکھ کر میرے فلسفیانہ ذوق کا قائل ہو جائے...... بہرحال میں نے گھر واپس آ کر نہایت عرق ریزی سے اس کتاب کی ورق گردانی کی...... مجال ہے جو نطشے نے کہیں بھول کر اس قسم کی بات کی ہو جس کا حوالہ معنک نقاد نے نہایت وثوق سے دیا تھا...... میں نے اگلے ہفتے ان سے مذاکرات کیے تو کہنے لگے۔ "تارڑ بھائی میں نے پڑھا تو سب کو ہے لیکن حافظہ ساتھ نہیں دیتا...... چنانچہ کچھ آگے پیچھے ہو جاتا ہے...... میرا خیال ہے یہ حوالہ نطشے کا نہیں تھا ابن خلدون کا تھا...... آپ اس کی تاریخ کی چار پانچ جلدیں پڑھ لیں، کہیں نہ کہیں مل جائے گا...... نہ ملا تو مثنوی مولانا روم میں کہیں ہو گا......

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں نے پڑھا بھی کسی کو نہیں پھر بھی حافظہ ساتھ نہیں دیتا......

پچھلے دنوں سردی شدید ہوئی تو میں نے ایک پرانا ٹویڈ کوٹ پہن لیا...... جیبوں میں ہاتھ ڈالے تو وہاں مبلغ ایک ہزار روپے کا ایک نوٹ...... یقیناً پچھلی سردیوں میں اسے سنبھالا ہو گا پھر بھول گیا یعنی غیر متوقع طور پر دولت مل گئی تھی۔ چنانچہ دو چار دوستوں کو چینی ریستوران میں کھانا کھلا کر اس نوٹ کو اڑا دیا...... اس سے اگلے روز چھوٹا بیٹا کہنے لگا۔ "ابا جی پرسوں میں نے آپ کو جو ہزار روپے کا نوٹ سنبھالنے کے لیے دیا تھا وہ واپس کر دیجئے۔"

تو جناب یوں میری یادداشت غوطہ کھا جاتی ہے......

اس کا ایک فائدہ بہرحال ہے کہ میں اپنی عمر کے مطابق یہ نہیں کہہ سکتا کہ یادِ ماضی عذاب ہے یا رب...... کیونکہ حافظہ تو ماشاء اللہ بچپن سے ہی چھینا جا چکا ہے۔

میں بیوٹی فل ہو گیا

کل ہماری حجامت ہو گئی......

یہ نہیں کہ میں نے آج تک سرداروں کی پیروی میں حجامت کروائی ہی نہیں تھی اور گیسو دراز بنا پھرتا تھا بلکہ حجامت کروانا...... بنوانا اور بات ہے اور ہو جانا اور ہی قصہ ہے......

اور قصہ کچھ یوں ہے کہ کل بیگم نے اتفاقاً نہایت شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے حکم نہیں دیا بلکہ فرمائش کی کہ ذرا مین مارکیٹ تک جا کر کچھ پائے' کلیجی اور مچھلی وغیرہ خرید لاؤ کہ سردیوں میں انہی خوراکوں کا تو لطف آتا ہے۔ میں بھی بھنڈیاں' پھول گوبھی اور شلغم وغیرہ کھا کھا کر کچھ بنیا ہوا جاتا تھا اور گوشت کی شدید طلب تھی چنانچہ خوشی خوشی بیگم کی عطا کردہ رقم جیب میں رکھی اور مین مارکیٹ پہنچ گیا...... وہاں پہنچا ہوں تو خیال آیا کہ بال بہت بڑھ گئے ہیں انہیں کٹوا لیا جائے...... بال میں صرف اسی صورت کٹواتا ہوں جب یار دوست اعتراض کرنے لگتے ہیں کہ کیا شیگی ڈوگ بنے پھرتے ہو اور بچے کہتے ہیں کہ ابو آپ کنجوسی نہ کریں پیسے ہم دے دیتے ہیں...... چنانچہ بال کٹوانے کا خیال اوّل اوّل مجھے نہیں بلکہ دوسروں کو آتا ہے۔

بہر حال میں نے موقع غنیمت جانا اور مین مارکیٹ کے قریب اپنے ہیئر ڈریسر کے ہاں چلا گیا...... وہاں پہنچا تو ایک نوٹس آویزاں ہے کہ ہیئر ڈریسر صاحب کی کوئی پھوپھی یا خالہ جان فوت ہو گئی ہیں اس لیے ان کے سوگ میں دکان تین دن بند رہے گی...... دکان کے قریب ہی میں نے ایک نہایت ماڈرن قسم کی دیدہ زیب جگہ دیکھی جس کی پیشانی پر ''فار مین اونلی'' کا نہایت آرٹی کرافٹی قسم کا بورڈ لگا تھا...... اردو میں ترجمہ کیا جائے تو یہ ''صرف مردوں کے لیے'' ہوتا تھا جو عام طور پر ٹائلٹ کے باہر لکھا ہوا ہوتا ہے لیکن یہاں یہ

بھی لکھا تھا کہ تشریف لائیے' بال بنوائیے اور خوبصورت ہو جائیے وغیرہ وغیرہ...... میں نے سوچا اگر میں نے ہیئر ڈریسر کی واپسی کا انتظار کیا تو بات اگلے ماہ تک ملتوی ہو جائے گی کیوں نہ اس نئے ہیئر ڈریسر کی خدمات سے استفادہ کیا جائے...... اندر گیا تو ہر طرف خدمات ہی خدمات تھیں' جو نہایت دیدہ زیب وردیاں زیب تن کیے منتظر تھیں۔ میں نے سوچا ہو نہ ہو غلطی سے کسی نائٹ کلب میں آ گیا ہوں کیونکہ روشنیاں بھی بے حد مدھم تھیں اور موسیقی بھی ان ''خدمات'' کی مانند نہایت اشتعال انگیز تھی...... لیکن یہ دیکھ کر کہ ایک جانب کچھ مرد حضرات بال کٹوانے اور شیمپو وغیرہ کروانے کے مختلف مراحل میں ہیں کچھ ڈھارس ہوئی...... اتنی دیر میں ایک ''خدمات'' میری جانب آئی اور نہایت والہانہ انداز میں میرا استقبال کیا اور بہ زبان انگریزی کیا۔

''میں تو...... یہاں بال بھی کاٹے جاتے ہیں مس؟'' میں نے ذرا ڈرتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں نہیں تارڑ صاحب......'' خدمات نے ایک بھرپور مسکراہٹ فلیش کی۔ ''ہم آپ کے بے حد شکر گزار ہیں کہ آپ یہاں تشریف لائے...... آپ جانتے ہوں گے کہ شہر میں یہ پہلا بیوٹی پارلر ہے جو صرف مردوں کے لیے اسٹیبلش کیا گیا ہے...... کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ عورتوں کی طرح مردوں کو بھی خوبصورت بننے کا حق حاصل ہے......''

''کیوں نہیں۔'' میں نے فوراً ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''لیکن میں تو صرف حجامت بنوانا چاہتا ہوں......''

اب میں اس چکر میں تھا کہ یہاں سے فرار ہو جاؤں کیونکہ یہ کوئی عام قسم کے فٹ پاتھیے نائی نہیں تھے کہ بال کاٹے اور شیو کرنے کے بعد آم کی گٹھلی سے چمک پیدا کر کے دس روپے میں فارغ کر دیتے بلکہ جو مرد حضرات یہاں کام کر رہے تھے وہ مجھ سے کہیں سمارٹ اور مہنگے لباس میں تھے اور اس پر طرہ یہ کہ انگریزی بولے چلے جا رہے تھے......

''میرا خیال ہے میں پھر کسی وقت آ جاؤں گا یہاں تو رش بہت ہے۔''

''نہیں نہیں جناب...... آپ جیسی مشہور شخصیت کے لیے تو ہم پورا بیوٹی پارلر خالی کروا سکتے ہیں...... آئیے ناں!''

بقیہ گفتگو تو انگریزی میں ہوئی لیکن خاتون نے ''آیئے ناں'' اردو میں کہا اور نہایت دلبرانہ انداز میں کہا چنانچہ میں اس ''آیئے ناں'' کی تاب نہ لاتے ہوئے ایک کرسی پر جا بیٹھا.....

میرے حصے میں جو ہیئر ڈریسر یا بیوٹی ایکسپرٹ آئے انہوں نے پہلے تو درجن بھر تولیے میری گردن کے ساتھ یوں باندھے کہ میرا دم گھٹنے لگا اور آئینے میں باقاعدہ کفن پوش سا لگنے لگا..... پھر انہوں نے میرے کانوں میں روئی ٹھونس دی..... یہاں سے فارغ ہو کر انہوں نے اپنا منہ میرے بالوں پر جھکایا اور ان میں ایک پھونک مار کر کہا۔ ''آہا.....''

''کیا آہا؟''

''آپ تو سر گنجے ہو رہے ہیں.....''

''سر گنجے نہیں ہو رہے بلکہ میرا سر گنجا ہو رہا ہے؟''

''بالکل درست..... تو آپ کو فل ٹریٹمنٹ دیا جائے؟''

اب اللہ جانے یہ فل ٹریٹمنٹ کیا ہوتا تھا اس لیے میں نے فوراً کہا۔ ''نہیں نہیں صرف بال کاٹ دیجئے۔''

ان صاحب نے مجھ سے پوچھے بغیر میرے سر میں کوئی واہیات سا تیل ڈالا اور چمپی کرنے لگے..... سچی بات ہے کہ لطف آ گیا اور میں باقاعدہ اونگھنے لگا..... اس کے بعد ان صاحب نے کاؤنٹر پر کوئی درجن بھر قینچیاں' استرے' چھری کانٹے وغیرہ سجائے اور پھر انہیں تادیر غور سے دیکھ کر ان میں سے ایک قینچی کا انتخاب کیا اور طبع آزمائی میں مشغول ہو گئے..... تھوڑی دیر کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھ سے کچھ کہہ رہے ہیں لیکن مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا..... صرف ان کے ہلتے ہوئے ہونٹ دکھائی دے رہے ہیں..... تب کھلا کہ میرے کانوں میں روئی ٹھنسی ہوئی ہے چنانچہ میں نے دائیں کان میں سے روئی نکال کر کہا۔ ''آپ مجھ سے کچھ کہہ رہے تھے؟''

''سر! میں آپ کو بتا رہا تھا کہ آپ میرے ہاتھوں میں بالکل محفوظ ہیں..... میں شوبزنس کی بے شمار نامور شخصیات کی ہیئر ڈریسنگ کر چکا ہوں..... دبئی میں کئی برس گزارے ہیں۔''

''اچھا اچھا۔'' میں نے متاثر ہو کر کہا..... ''وہاں عربوں کی ہیئر ڈریسنگ کرتے تھے۔''

''جی نہیں..... وہاں تو پھل فروٹ بیچتا تھا..... لیکن میں نے ڈاک کے ذریعے انٹرنیشنل سکول آف ہیئر ڈریسنگ اینڈ فائن آرٹس نیویارک سے ڈپلومہ حاصل کیا ہے.....''

''تو آپ نے یہ فن سیکھا کہاں سے ہے؟''

''اپنے ابا جی سے..... وہ لاری اڈہ سرگودھا میں بیٹھنے والے مشہور ہیئر ڈریسر تھے.....''

''اور آپ نے انگریزی کہاں سے سیکھی؟''

''انگلینڈ سے..... غیر قانونی طور پر گیا تھا۔ دو ماہ میں پکڑا گیا اور واپس بھیج دیا گیا لیکن میں نے دو ماہ میں انگریزی پر عبور حاصل کر لیا..... اب یہاں سے کچھ تجربہ حاصل کر کے سرگودھا میں اپنا ذاتی بیوٹی پارلر فار مین اونلی بناؤں گا۔''

''صحیح.....''

حجامت سے فارغ ہو کر اس نے پھر انگریزی میں کچھ کہا کہ پتہ نہیں فیشل کر دوں' میں نے کہا بے شک کر دیں..... اس پر اس ناہنجار نے ایک سفید رنگ کی گوند نما شے میرے چہرے پر تھوپ دی اور غائب ہو گیا..... اس دوران میں اپنے سفید بھوت کو آئینے میں تکتا رہا کہ یا اللہ یہ کیسا فیشل ہے۔ پندرہ منٹ بعد ہیئر ڈریسر صاحب واپس آئے اور وہ گوند میرے چہرے سے اتار کر پھر وہی بے ہودہ تیل لگا کر مالش کی اور تولیہ جھاڑ کر بولا۔ ''تھینک یو سر۔''

کاؤنٹر پر ادائیگی کرنے گیا تو وہ ساتھ ساتھ چلا آیا اور منیجر صاحب سے کہنے لگا۔ ''فور ففٹی سر.....''

میں نے سوچا یہ تو بہت سستا کام ہے..... پانچ سو کا نوٹ کاؤنٹر پر رکھا تو منیجر نے صرف پچاس کا نوٹ واپس کاؤنٹر پر رکھا جسے ہیئر ڈریسر صاحب نے ''تھینک یو سر'' کہہ کر دبوچ لیا..... معلوم ہوا کہ بال کاٹنے اور فیشل کے یہی چارجز تھے.....

گھر واپس گیا تو بیگم کہنے لگیں۔ ''مچھلی اور پائے وغیرہ نہیں لائے۔''

''میں نے کہا۔ ''اے جاہل اور بیک ورڈ عورت مچھلی اور پائے چھوڑو تم یہ بتاؤ کہ میں کیسا لگ رہا ہوں؟''

اس نے پہلی بار مجھے غور سے دیکھا اور حیرت سے اس کا منہ کھل گیا۔ ''ہا ہائے یہ کیا بن کر آ گئے ہو...... بالکل زنخے لگ رہے ہو...... تالیاں بجانے والے...... لیکن مچھلی اور پائے کہاں ہیں؟''

''بیگم خوبصورت بننے کا حق ہم مردوں کو بھی تو حاصل ہے...... مچھلی اور پائے ہم نے اپنی خوبصورتی پر قربان کر دیے ہیں......''

شرم عربوں پر..ان کے حکمرانوں پر

میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔

میرے رُخسار گورے گورے نہیں ورنہ آپ دیکھتے کہ یہ سرخ سرخ آنسو گورے رنگ پر کیسے سجتے' کیسے دھیرے دھیرے بہتے۔

میرا دل خون کے آنسو تب روتا ہے جب اس فانی جہان میں کسی انسان یا قوم کے ساتھ کوئی بہت بڑی زیادتی' کوئی بہت بڑا ظلم ہوتا ہے۔

میں کوئی پیشہ ور آنسو بہانے والا تو نہیں ہوں کہ خواہ مخواہ رو دوں۔

تو جب میں...... یعنی مستنصر حسین تارڑ روتا ہوں اور خون کے آنسو روتا ہوں تو سمجھ لیجئے کہ دنیا میں کہیں نہ کہیں کوئی ایسا ظلم ہوا ہے جس کی مثال مشکل سے ملنے والی ہے۔

دیکھیں ناں میرا دماغ تو نہیں چل گیا کہ وجہ بے وجہ خون کے آنسو رونے لگوں۔

تو آپ وجہ پوچھیے...... میں بتاتا ہوں...... اور جب بتاؤں گا تو آپ بھی خون کے آنسو بہانے لگیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ ایک بہت عظیم الشان ظلم ہو گیا ہے۔ تاریخ کی ایک بہت بڑی زیادتی ہو گئی ہے...... اور وہ یہ کہ ایک عام اسرائیلی شہری اطمینان سے اور سکون سے کافی کا ایک کپ بھی نہیں پی سکتا۔

وہ اپنے گھر میں...... اس گھر میں جو دہشت گرد فلسطینیوں کے آبائی گھر بلڈوز کر کے تعمیر کیا گیا ہے' اس گھر میں تو کافی کا ایک کپ پی سکتا ہے لیکن وہ حیفہ' تل ابیب یا بیت المقدس کے کسی قہوہ خانے میں بیٹھ کر کافی کا یہ کپ نہیں پی سکتا۔ اطمینان اور سکون کے ساتھ...... کیونکہ وہاں کسی بھی لمحے کوئی فاترالعقل' جاہل اور انگریزی کی بجائے عربی بولنے والا یا بولنے والی خودکش بامبر اس کے سکون میں رخنہ ڈال کر اپنے بدن پر بندھے بارود کو اڑا سکتی ہے۔

یہ کتنی بڑی زیادتی ہے کہ امریکہ' پولینڈ' جرمنی' انگلینڈ اور یوکرائن وغیرہ سے آنے والا ایک شخص...... کسی کیفے میں بیٹھ کر اطمینان سے کافی بھی نہیں پی سکتا۔

اسی لیے میرا دل خون کے آنسو روتا ہے...... ان فلسطینی کیڑے مکوڑوں کی سرزمین پر جو سفید فام اور اعلیٰ نسل کے لوگ آباد ہونے کے لیے آتے ہیں تو انہیں سکون میسر نہیں۔

دراصل ان دنوں بے شک' وہ امریکی نوکس نیوز ہو یا اسرائیلی مبصر' وہ سب یہی شکایت کر رہے ہیں کہ ایک اسرائیلی شہری اطمینان سے کافی کا ایک کپ بھی نہیں پی سکتا۔ اس لیے یہ اشد ضروری ہے کہ اپنے سینکڑوں ٹینک' گن شپ ہیلی کاپٹر' طیارے اور میزائل فلسطینی علاقوں میں روانہ کیے جائیں تاکہ ایک اسرائیلی شہری کافی کا ایک پیالہ تو اطمینان سے پی سکے۔

کیا آپ ایک اتنی چھوٹی سی خوشی سے انکار کر سکتے ہیں؟

نہیں کر سکتے ناں...... لیکن وہ نامراد فلسطینی انکار کر دیتے ہیں اور اسرائیلی ٹینکوں پر پتھروں کی بارش کر دیتے ہیں۔

جنین کے ریفیوجی کیمپ میں ایک قتل عام کے بعد سینکڑوں لاشیں سڑکوں پر پڑی ہیں اور ریڈ کراس کے عملے کو اجازت نہیں کہ وہ انہیں اٹھائے۔ جنین کیمپ کو زیر کرنے میں اسرائیلی فوج کو کچھ زیادہ ہی وقت لگا۔ اسی لیے ایک فلسطینی نے اسرائیلی ٹینکوں پر پتھر پھینکتے ہوئے کہا۔ ''کہاں ہے وہ ناقابلِ تسخیر اسرائیلی فوج جس نے چھ روزہ جنگ میں آدھا عرب فتح کر لیا تھا اور اب آٹھ روز ہو گئے ہیں جنین کیمپ کو فتح نہیں کر سکی۔''

بیت اللحم میں...... حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش میں...... اس مقام پر جہاں وہ پیدا ہوئے تھے' اس چرچ پر اسرائیلی ٹینک گولے برسا رہے ہیں...... ان کے اندر محصور پادری دہائی دے رہے ہیں کہ یہاں صرف عورتیں اور بچے پناہ لیے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگوں کے پاس ہتھیار بھی ہیں اور یہ سب ہماری پناہ میں ہیں لیکن ان کی فریاد بھی کوئی نہیں سنتا۔ ایک کافی کے کپ کے سامنے اس فریاد کی کیا اہمیت ہے۔

پوری دنیا اسرائیلی عوام کی اس ٹریجڈی پر دھیان نہیں دے رہی۔ ان کا نقطۂ نظر

سمجھنے سے انکاری ہے۔ دُم ہلاتے برطانیہ کے علاوہ تمام یورپی اقوام احتجاج کر رہی ہیں۔ یو این او کے سیکرٹری جنرل اسرائیلی حملے اور قبضے اور قتل عام پر رنجیدہ ہیں اور بین الاقوامی فوج بھجوانے کی درخواست کر رہے ہیں اور صرف امریکہ اور اس کے عوام ہیں جو یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ایک عام شہری اگر اطمینان سے کسی کافی بار میں موسیقی سنتے ہوئے اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ چہلیں کرتے ہوئے کافی کا ایک کپ اطمینان سے نہیں پی سکتا تو اس کے لیے فلسطینیوں کا قتل عام جائز ہے کہ یہ تو ذاتی دفاع ہے۔ دیکھیں ناں اسرائیل ریاست ہائے متحدہ کی ایک ریاست ہے۔ ہم کیسے یہ توقع رکھتے ہیں کہ امریکہ کا صدر یا نائب صدر فلسطین کے حق میں بات کرے۔ نائب صدر نے تو پچھلے ماہ یہاں تک کہہ دیا تھا کہ میری جانب سے اگر یاسر عرفات کو قتل کر دیا جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں کیونکہ وہ دہشت پسند ہے اور بش صاحب نے بھی واضح طور پر کہہ دیا کہ عرفات پر میں نے کبھی اعتبار نہیں کیا وہ ایک قابل توجہ شخص نہیں۔

ویسے فلسطینی بھی بے حد زیادتی کر رہے ہیں۔ ان کے گھروں کو ان کے خاندانوں سمیت بلڈوز کر دیا گیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ہم نے ملبے میں سے لاشیں نکالنی ہیں۔ ایک صحافی نے بی بی سی کے انٹرویو کے دوران اسرائیلی وزیر انصاف سے پوچھا کہ آپ نے جنین کیمپ میں کتنے فلسطینیوں کو قتل کیا ہے تو اس نے کہا کہ ہم نے صرف دہشت پسندوں کو قتل کیا ہے اور عام شہری صرف وہ قتل ہوئے ہیں جو ان کے آس پاس تھے۔ اگر دس شہریوں میں ایک دہشت پسند ہو گا تو مجبوراً سب کو قتل کرنا پڑتا ہے۔ وزیر انصاف نے اس زیادتی پر بھی شدید احتجاج کیا کہ جنین کے گلی کوچوں میں فلسطینیوں کی جو سینکڑوں لاشیں بکھری ہوئی ہیں وہ خود فلسطینیوں نے وہاں پھینکی ہیں تاکہ ہمیں بدنام کیا جا سکے۔

اب تو آپ بھی قائل ہو گئے ہوں گے کہ واقعی ایسا ہوا ہے کہ فلسطینیوں نے اپنے بھائیوں' بچوں اور عورتوں کو خود قتل کیا اور پھر بے چارے اسرائیل کو بدنام کرنے کے لیے اپنے پیاروں کی لاشیں باہر پھینک دیں تاکہ انہیں گدھ اور کُتے نوچ سکیں۔ کچھ بدطینت لوگ کہتے ہیں کہ امریکہ کی جانب سے جو بیان آتے ہیں کہ اسرائیل مغربی کنارے کو فوراً خالی کر دے تو وہ یہ بیان مسکراتے ہوئے دیتے ہیں اور اس کے ساتھ اسرائیل کو آنکھ مار

دیتے ہیں کہ تم قتل عام جاری رکھو۔ کچھ اور واہیات قسم کے لوگوں کا کہنا ہے کہ کبھی کبھی امریکہ ''صلح'' کروانے کی خاطر میدان میں آتا ہے اور پھر فلسطینیوں کو چھا مار کر کہتا ہے کہ بھائی جان کیوں لڑتے ہو اور اس دوران اسرائیل فلسطینیوں کو زدوکوب کرتا رہتا ہے۔ یہ سب افواہیں ہیں' ان پر کان نہیں دھرنا چاہیے۔

اس لمحے لاکھوں کی تعداد میں بچے' عورتیں اور بوڑھے خوراک' پانی اور بجلی سے محروم ہیں۔ ہزاروں کے گھر بلڈوز کر دیئے گئے ہیں اور ہزاروں ملبے کے نیچے دفن ہیں۔ کوئی صحافی' ریڈکراس کا کوئی رکن...... امدادی تنظیم کا کوئی فرد ان مفتوح علاقوں کے اندر نہیں جا سکتا۔

یہ سب کچھ کافی کا ایک کپ پینے کے لیے کیا گیا ہے اور میں اسرائیلیوں کے ساتھ ہمدردی کرتے ہوئے انہیں سپورٹ کرتا ہوں۔ آپ دیکھئے گا کہ اب رہتی دنیا تک اسرائیلی شہری مزے سے کافی پئیں گے۔ انہوں نے فلسطینیوں کا ''آخری حل'' کر دیا ہے۔ ہٹلر نے انہی اسرائیلیوں کے آباؤاجداد کے لیے یہ ''آخری حل'' تجویز کیا تھا لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکا۔

بس ان خودکش بامبر خواتین اور حضرات کا کوئی مسئلہ ہے...... پچھلے ہفتے جس نوجوان لڑکی نے بیت المقدس میں اپنے آپ کو اڑا دیا تھا اس نے اس مشن پر جانے سے پہلے ایک عجیب و غریب بیان دیا۔ اس نے کہا۔ ''شرم عرب فوجوں کے لیے...... شرم ان حکمرانوں کے لیے کہ ان کی نوجوان بیٹیوں کو میدان جنگ میں اترنا پڑ رہا ہے۔''

یہ فلسطینی آخر کیوں اسرائیلیوں کو ایک کپ کافی پینے نہیں دیتے۔ میرا دل اسرائیلیوں کے لیے مسلسل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ اجازت ہو تو میں تھوڑے سے آنسو پونچھ لوں۔

شاہ صاحب پر اُلو نے حملہ کر دیا

''چوہدری صاحب...... مجھ پر اُلو نے حملہ کر دیا ہے۔'' شاہ صاحب کی ہوائیاں اُڑی ہوئی تھیں اور وہ قدرے خوفزدہ تھے۔

''اُلو نے؟'' میں نے حیرت سے کہا...... ''کس قسم کے اُلو نے......؟''

''مجھے کیا پتہ کس قسم کے اُلو نے......'' وہ ناراض ہو گئے۔ ''میں آپ کی طرح جانوروں اور پرندوں کی اقسام نہیں جانتا...... شریف بینکر ہوں۔''

''یعنی سچ مچ کے اُلو نے؟''

''چوہدری صاحب...... کیا کوئی جھوٹ موٹ کا اُلو بھی ہوتا ہے؟''

''کاٹھ کا اُلو بھی تو ہو سکتا ہے۔''

''وہ کاٹھ کی ہنڈیا ہوتی ہے...... ایک تو آپ کو محاوروں کا بھی نہیں پتہ اور ادیب بنے پھرتے ہیں۔'' شاہ صاحب تو سچ مچ ناراض ہو گئے۔

میں خاموش ہو گیا...... شاہ صاحب ذرا جلالی طبیعت کے ہیں۔ میں نے سوچا ان سے بحث نہیں کرنی چاہیے' ورنہ اس ماڈل ٹاؤن پارک میں صبح سویرے اُلو کہاں سے آ سکتا ہے...... بیگ صاحب اور شیخ صاحب اور قاضی صاحب کے ہمراہ شاہ صاحب بھی ہماری صبح کی سیر کی ٹولی میں شامل تھے۔ ہمیشہ ملاقات کا آغاز غالب کے کسی شعر سے کرتے تھے اور آج اُلو سے کر دیا...... یقیناً انہیں غلط فہمی ہوئی تھی لیکن وہ ذرا ناراض نظر آتے تھے' اس لیے میں نے انہیں منانے کی غرض سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے شاہ جی' آپ پر کسی اُلو نے حملہ کر دیا لیکن کہاں اور کیسے......؟''

''میں نہیں بتاتا' آپ اس معاملے میں سیریس نہیں ہو رہے......''

''یقین کیجئے' میں بے حد سیریس ہوں......''

''دراصل میں آج ذرا طلوعِ آفتاب سے پہلے ہی ادھر آ نکلا...... ٹریک پر سیر کرتا ہوا جب اس مقام پر پہنچا ہوں جہاں پارک کی نرسری ہے اور ٹیوب ویل ہے تو درختوں میں سے ایک پرندہ پھڑ پھڑاتا ہوا اترا اور اس نے میرے سر پر چونچ مارنے کی کوشش کی...... اور میں نے بڑی مشکل سے اسے بھگایا......''

''آپ فرما رہے ہیں کہ درختوں میں سے ایک پرندہ اترا...... تو یہ کوئی بھی پرندہ ہوسکتا ہے' جسے آپ اُلو سمجھ بیٹھے......''

''کمال کرتے ہیں...... تو کیا وہ کبوتر ہوسکتا ہے' چڑیا ہوسکتی ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ یہ کوا ہوسکتا ہے...... اسلام آباد ٹیلی ویژن سٹیشن کے برابر میں درختوں کا ایک جھنڈ ہے اور میں ایک خاص موسم میں جب کبھی بے دھیانی میں ان کے نیچے سے گزرتا تھا تو کوّے مجھ پر حملہ آور ہو جاتے تھے...... تحقیق پر معلوم ہوا کہ موسم برسات میں ان کے انڈے دینے کا سیزن ہوتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ آپ ان کے انڈے چرانے آئے ہیں تو کوا ہوگا......''

''چوہدری صاحب ہم سیّد زادے ہیں' آپ کی طرح جاٹ وغیرہ نہیں جو کوّے ہم پر حملہ آور ہوں...... ویسے بھی یہ مئی کا مہینہ ہے' موسم برسات تو نہیں......''

''یہ بھی درست ہے...... لیکن آپ وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ اُلو ہی تھا جس نے آپ پر حملہ کیا کوئی اور پرندہ نہ تھا۔''

''چوہدری صاحب آپ کا کیا خیال ہے' میں ایک اُلو کو بھی نہیں پہچان سکتا...... کوّے اور اُلو میں تمیز نہیں کرسکتا...... کمال ہے میں صبح سویرے ہلاک ہوتا ہوتا بچا ہوں اور آپ جرح کر رہے ہیں......''

اس کے بعد شاہ صاحب نے مجھ سے کُٹی کر لی اور بقیہ سیر کے دوران مجھ سے بولے نہیں۔

اگلی صبح کیا دیکھتا ہوں کہ شاہ صاحب اور بیگ صاحب ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چلے آ رہے ہیں اور شاہ صاحب کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ ہے۔

''مجھ پر آپ کو یقین نہیں ہے ناں تو بیگ صاحب سے پوچھ لیجئے۔''

اب کیا دیکھتا ہوں کہ بیگ صاحب کا رنگ بھی زرد ہو رہا ہے۔ ''کیوں بیگ صاحب؟''

''چوہدری صاحب حالانکہ میرے سر پر بہت زیادہ بال نہیں پھر بھی آج بال بال بچا ہوں۔ مجھ پر بھی اُلو نے حملہ کر دیا تھا...... اور بہت بڑا اُلو تھا......''

''کیا واقعی؟'' میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''بالکل...... آج سویرے میں بھی نرسری کے قریب سے گزرا ہوں تو درختوں میں سے ایک اُلو اترا...... اتنی تیزی سے جیسے ایف۔16 طیارہ اترتا ہے اور مجھ پر حملہ آور ہوگیا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی......''

معاملہ واقعی سیریس تھا...... ''بیگ صاحب اُلو ہی تھا؟''

''ہاں جی...... ہم صحافی لوگوں کو اُلو بناتے آئے ہیں...... اُلوؤں سے انٹرویو کرتے ہیں...... بھلا ہم ایک اُلو کو نہیں پہچانیں گے تو اور کون پہچانے گا...... باقاعدہ اُلو تھا......''

''لیکن ایک اُلو ماڈل ٹاؤن پارک میں آ کیسے گیا؟''

''میاں نواز شریف کی رہائش گاہ یہاں سے قریب ہے' ہوسکتا ہے ان کا پرائیویٹ اُلو ہو جسے وہ یہاں چھوڑ گئے ہوں...... شنید ہے کہ ان کے گرد بھی خاصے اُلو تھے۔ رنجیت سنگھ کی پوتی مہارانی بمباں سدرلینڈ کی کوٹھی بھی آس پاس ہے...... ہوسکتا ہے اس کی موت کے بعد اس کے ذاتی چڑیا گھر میں یہی ایک آخری اُلو بچا ہو جو نقل مکانی کر کے ادھر آ گیا ہو......''

''یہ تو بے حد خطرناک بات ہے شاہ جی...... آپ ہی بتائیے کہ اس کا کیا سدباب ہوسکتا ہے۔ ہماری زندگی کی ایک بڑی خوشی اس پارک میں سیر کرنا ہے۔ اگر یہاں اُلوؤں نے ڈیرہ جما لیا اور ہم پر حملہ آور ہونے لگے تو ہم کہاں جائیں گے۔''

''قبلہ چوہدری صاحب......'' شاہ صاحب کی اُلو تھیوری چونکہ ثابت ہو چکی تھی' اس لیے وہ بہت خوشگوار موڈ میں تھے۔ ''اُلوؤں نے تو ہر سو ڈیرے جمائے ہوئے ہیں' ہم

نے کہاں جانا ہے۔ لیکن فکر نہ کیجئے میں چھٹی کے روز گن مین کو لے کر آؤں گا اور اس نا ہنجار اُلو کو شوٹ کروا دوں گا۔"

اس دوران قاضی صاحب بھی ہماری ٹولی میں شامل ہو چکے تھے...... یاد رہے کہ قاضی صاحب فلسفے کے آدمی ہیں...... انہوں نے شاہ صاحب کی اس تجویز کو سخت ناپسند کیا۔ "جناب من آپ میرے ہوتے ہوئے کسی اُلو کی جان نہیں لے سکتے...... اُلو دانش کی علامت ہوتا ہے اور اگر ایک اُلو غلطی سے ایک ایسے معاشرے میں آ نکلا ہے جو دانش کا دشمن ہے تو اس غریب کو رہنے دیجئے......"

"کیا اس اُلو نے آپ پر اٹیک کیا ہے؟" شاہ صاحب نے چہک کر کہا......

"نہیں جناب عالی...... اُلو بھی دیکھ لیتا ہے کہ اس کو کس پر حملہ آور ہونا ہے۔"

قاضی صاحب کی یہ فلسفیانہ منطق ہماری سمجھ سے بالاتر تھی۔

اس سے اگلے روز میں جان بوجھ کر صبح سویرے منہ اندھیرے پارک میں گیا اور نرسری کے قریب تادیر ٹہلتا رہا...... درختوں کو بہ غور دیکھتا رہا۔ دراصل میری خواہش تھی کہ اُلو مجھ پر حملہ آور ہو اور میں دیکھوں تو سہی کہ وہ واقعی ایک اُلو ہے یا کچھ اور ہے...... لیکن یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ دیدار اُلو ہوتا۔ ایک دو کوّے میرے سر پر پھڑ پھڑائے لیکن اُلو کہیں دکھائی نہ دیا...... یعنی اگر وہاں کوئی اُلو تھا تو اس نے مجھے اس لائق نہیں سمجھا تھا کہ مجھ پر حملہ آور ہوتا۔

حیرت کی بات ہے کہ شاہ صاحب اور بیگ صاحب پر ان اولین حملوں کے بعد وہ اُلو پھر کبھی دکھائی نہیں دیا...... شاہ صاحب کے گن مین نے بھی کوشش کی لیکن وہ نہ مل سکا...... قاضی صاحب خوش ہیں کہ ایک اُلو کی جان بچ گئی...... لیکن ابھی تک یہ طے نہیں ہو سکا کہ اس نے میرے ساتھیوں پر کیوں حملہ کیا تھا...... ایک تھیوری یہ بھی ہے کہ ہو سکتا ہے کوّوں کی مانند انڈے دینے کے موسم میں اُلو بھی انسانوں پر حملہ آور ہوتے ہوں...... اس صورت میں یہ ایک مادہ اُلو یعنی اُلنی ہو سکتی ہے...... آپ حضرات میں سے اگر کوئی "اُلو شناس" ہو تو براہِ کرم اس مسئلے کا حل بتلا دے۔

گرمی سے ناک چپٹی ہو جاتی ہے

بھری تپتی آگ برساتی دوپہر میں خلیفہ خلفشاری پسینے میں شرابور ہانپتا ہوا میرے گھر آ گیا اور مجھے بھی پسینے میں شرابور دیکھ کر اور پھر ساکن پنکھے کو دیکھ کر کہنے لگا......

"یار کنجوسی کی بھی حد ہوتی ہے۔ اس قہر انگیز گرمی میں بھی پنکھے نہیں چلاتے......"

"نہیں چلاتے" میں نے بھی تاؤ میں آ کر کہا......

"کیوں نہیں چلاتے؟" خلیفہ چلائے۔

"ہمارا پنکھا ہے ہماری مرضی ہے کہ اسے چلائیں یا نہ چلائیں، تم ما ے لگتے ہو دخل دینے والے......" میں نے بھی چلا کر کہا......

"یار کچھ تو خدا کا خوف کرو...... اتنی دُور سے تم سے ملنے آیا ہوں اور تم میرے لیے پنکھا بھی نہیں چلاتے......"

"کیسے چلاؤں؟"

"اس کا ریگولیٹر آن کر دو......"

"وہ بھی آن کر دوں تو بھی نہیں چلتا......"

"لیکن کیوں؟"

"اس لیے کہ بجلی نہیں ہے......"

"تو میرا یہاں آنا اکارت گیا...... میرے گھر میں بھی صبح سے بجلی بند ہے۔ میں نے سوچا تمہارے ہاں چلتا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے تم مجھے ملنے نہیں آئے...... صرف پنکھے کے لیے آئے ہو......

اتنے خود غرض ہو......'' میں پھر چلایا۔

خلیفہ نے بھی بھنا کر مجھے خوب سنائیں اور جب ہم دونوں پاگل چیلوں کی مانند ایک دوسرے پر جھپٹتے لپکتے بالآخر ہانپنے لگے تو ہم نے صلح کر لی......

اور یہ سب گرمی کا شاخسانہ تھا......

مئی کا آن پہنچا تھا مہینہ...... اور چوٹی سے ایڑی تک پسینہ ہی پسینہ...... دراصل پچھلے کچھ برسوں سے مئی کا مہینہ ذرا کم اذیت کے ساتھ گزر جاتا تھا اور جون کے وسط میں جا کر چیل انڈہ چھوڑتی تھی اور فٹ پاتھ پر وہی انڈہ فرائی کیا جا سکتا تھا لیکن اس بار مئی ایک آتش فشاں کی مانند اُبل پڑا اور ہر سو ''النار...... النار'' کی دہائی مچ گئی...... پڈعیدن بلوچستان میں درجہ حرارت اکیاون سینٹی گریڈ...... نواب شاہ میں بچاس اور شہر لاہور میں چھیالیس کی قربت میں...... اب اتنی آتش بار گرمی میں اگر پنکھا بھی نہ چلے تو دماغ تو چلے ہی چلے...... چنانچہ میرا اور خلیفہ کا دماغ تو چلے ہی چلے...... چنانچہ میرا اور خلیفہ کا دماغ...... اگر کہیں تھا تو گرمی سے چل چکا تھا......

چونکہ ریفریجریٹر بھی کام نہیں کر رہا تھا اس لیے میں نے خلیفہ کو نلکے کا نیم گرم پانی پلایا اس یقین دہانی کے ساتھ کہ خلیفہ نیم گرم پانی صحت کے لیے نہایت مفید ہوتا ہے...... پورے چین میں نیم گرم پانی پیا جاتا ہے۔

''اسی لیے تو ان کی ناکیں بھی چپٹی ہو جاتی ہیں۔'' خلیفہ نے اُبلتے ہوئے کہا......

''یار نیم گرم پانی سے ناکیں کیسے چپٹی ہو سکتی ہیں؟''

''تو پھر تمام چینیوں کی ناکیں کیوں چپٹی ہوتی ہیں تم بتا دو۔''

''ان کی نسل کے خدوخال ہی ایسے ہیں۔''

''نہیں گرم پانی پینے کی وجہ سے ہوتی ہیں...... تم نے ابھی ابھی مجھے گرم گرم پانی پلایا ہے ناں تو مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میری ناک بھی چپٹی ہو رہی ہے؟''

''نہیں خلیفہ......''

''ہاں...... تم ذرا مجھے غور سے دیکھو۔''

اور جب میں نے ذرا غور سے دیکھا تو واقعی مجھے لگا کہ خلیفہ کی ناک پہلے سے کچھ

پھیلی ہوئی لگ رہی ہے......

یقیناً ہم دونوں کو گرمی کی شدت سے سرسام وغیرہ ہو چکا تھا ورنہ ہم عام طور پر تو اتنی بہکی بہکی باتیں نہیں کرتے تھے۔

یہ بُجھارت سمجھ میں نہ آتی تھی کہ گرمی ہر سال آتی تھی اور اکثر قہر انگیز آتی تھی پھر اس کی عادت کیوں نہیں ہوتی تھی۔ سردیوں میں ہم کیوں یکسر بھول جاتے ہیں کہ ایسے دن بھی آنے کو ہیں جب نلکوں میں سے ابلتا ہوا پانی نکلے گا...... کالم لکھتے ہوئے ماتھے کا پسینہ کاغذ پر ٹپکے گا اور آہنی گیٹ کھولتے ہوئے انگلیوں کے جلنے سے آبلے نمودار ہو جائیں گے۔ گرمیاں آتی ہیں تو ہم سردیوں کی خواہش کرتے ہیں اور سردیوں میں جب قلفی جمنے لگتی ہے اور وہی آہنی گیٹ کرنٹ مارنے لگتا ہے تو گرمیوں کی دُعا کرتے ہیں...... جمہوریت آتی ہے تو اس کی دھما چوکڑی سے تنگ آ کر فوجی حکومت کو یاد کرتے ہیں...... فوجی حکومت آتی ہے تو اس کے یکطرفہ فیصلوں اور وردیوں اور بھاری بوٹوں سے عاجز آ کر جمہوریت کی یاد میں آہیں بھرنے لگتے ہیں......

خوش قسمتی سے بجلی آ گئی اور پنکھا رواں ہو گیا......

خلیفہ قدرے بحال ہوا اور میرا دماغ بھی کچھ ٹھکانے لگ گیا......

''تمہیں پتہ ہے کہ اب ہمیں گرمی کیوں لگتی ہے......''

''گرمی تو ہمیشہ سے لگتی ہی رہی ہے خلیفہ......''

''نہیں پرانے زمانوں میں اتنی نہیں لگتی تھی...... اب زیادہ لگتی ہے کیونکہ اب ہم معزز ہو گئے ہیں...... پہلے نہ ایئر کنڈیشنر تھے...... نہ ریفریجریٹر...... نہ آئس کریم اور پنکھے بھی کم کم تھے...... ہمارے بزرگ دھوتی پہن کر شیشم کے درخت تلے چارپائی پر بیٹھ کر پنکھیاں جھلتے مزے سے دوپہریں گزار دیتے تھے اور انہیں کچھ نہ ہوتا تھا...... ہم خود بچپن اور جوانی میں گرمی کو انجوائے کرتے تھے...... ایک تربوز خرید کر لاہور کی نہر میں نہاتے تھے اور تربوز کو بھی نہلاتے تھے اور پھر وہ یخ ہو جاتا تھا تو اس کا لنچ کرتے تھے...... اب ہم چونکہ معزز ہو چکے ہیں اور ایسا نہیں کر سکتے......''

''لیکن خلیفہ لاہور کی نہر بھی تو بے حد آلودہ ہو چکی ہے...... اس میں گندگی......

پلاسٹک کے لفافے اور جانے کیا کیا تیرتا ہے...... بلکہ لوگ اس میں اپنے گھوڑے بھی نہلاتے ہیں اور ایک نہاتا ہوا گھوڑا کچھ بھی کرسکتا ہے۔''

''ان زمانوں میں بھی بہت کچھ ہوتا تھا نہر میں...... لیکن ہم پروا نہیں کرتے تھے...... ہمارے ایک تایا جان ہوا کرتے تھے اللہ بخشے...... اور نام بھی ان کا اللہ بخش تھا تو وہ پوری گرمیاں صرف دھوتی کے زور پر گزار دیتے تھے...... بدن کے بالائی حصے کو بنیان یا کُرتے وغیرہ سے ڈھانپنا معیوب گردانتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ بیٹا اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بدن استعمال کرنے کے لیے دیا ہے گرمیوں میں اسے ڈھانپ دینے سے یہ پلپلا ہو جاتا ہے......''

''لیکن خلیفہ اب تو یہ طریقہ پھر سے رائج کرنا مشکل ہے۔ تم ذرا خیال کرو کہ اگر میں ریفرنڈم کی نشریات کے لیے صرف ایک دھوتی زیب تن کرلوں اور بنیان تک نہ پہنوں اور سکرین پر نمودار ہو کر یہ کہوں کہ خواتین و حضرات آج تو بہت گرمی ہے میں ذرا اپنی توند کھجا کھجا کر نتائج کا اعلان کروں تو آپ مائنڈ نہ کیجئے گا...... تو یہ مناسب تو نہ ہوگا......''

''تم اپنی توند کھجاؤ یا نہ کھجاؤ نتائج تو وہی آنے تھے۔''

''نہ...... نہ...... تم گرمی میں خواہ مخواہ سیاست کو نہ گھسیڑو...... میں غیر سیاسی شخص ہوں...... میں تو اس بار اپنی طبیعت پر جبر کر کے کوٹ پہن کر ایک نہایت مہنگی ٹائی باندھ کر ٹیلی ویژن پر جلوہ افروز ہوا تھا...... ویسے آپس کی بات ہے اگر میرا بس چلتا اور مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ میں ٹیلی ویژن پر بین نہیں ہو جاؤں گا تو واقعی میں صرف ایک دھوتی پہن کر نمودار ہو جاتا......''

میں نے عرض کیا تھا ناں کہ گرمی سے ہمارے دماغ چل چکے تھے...... چلتے چلتے پتہ نہیں کہاں پہنچ چکے تھے...... پڈعیدن پہنچ چکے تھے جہاں درجۂ حرارت پچاس سینٹی گریڈ سے تجاوز کر چکا تھا...... نواب شاہ چلے گئے تھے اور ہم اور ہمارا دماغ چلتا گیا تھا......

تب خلیفہ خلفشاری نے ذرا جھوم کر کہا۔ ''بھئی گرم پانی کا ایک اور گلاس تو پلا دو......''

''کیوں؟''

''تا کہ اس کے پینے سے میری ناک مزید چپٹی ہو جائے......''

خلیفہ خلفشاری کی ناک واقعی چپٹی ہو رہی تھی......

اور مجھے یہ خدشہ ہو رہا ہے کہ گرمی کی شدت سے میرا یہ کالم بھی چپٹا ہو رہا ہے...... کچھ کچھ چینی ہوا جاتا ہے......

اگر صرف ناکیں چپٹی ہونے سے ہم بھی چینی بھائیوں کی مانند ترقی کر جائیں تو...... پھر گرم پانی پینے میں کیا مضائقہ ہے؟

***

رود بار انگلستان کا ٹھنڈا پانی اور شوکت اسلام

شوکت اسلام کی وجہ سے میں اپنے بچپن کے تین بیسٹ فرینڈ کھو بیٹھا ہوں۔

یہ وہ شوکت اسلام کاروان نہیں ہے جو بھٹو کے زمانے میں جماعت اسلامی نے ترتیب دیا تھا بلکہ یہ وہ شوکت اسلام ہے جو میرا اسکول فیلو ہے۔

اس سے پیشتر کہ میں اپنے تین بیسٹ فرینڈز کو کھو دینے کا نوحہ بیان کروں میں مناسب سمجھتا ہوں کہ شوکت اسلام کا تعارف کرا دوں۔

یہ تقریباً بیس برس پہلے کی بات ہے کہ میرے گھر کی گھنٹی بجی اور میں اتنی گرم دوپہر میں آنے والے اس مہمان کو کوستا گیٹ تک گیا اور وہاں ایک درمیانے قد کا کھلکھلاتا ہوا شخص کھڑا تھا جس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور مجھ سے لپٹ گیا اور بے دریغ بہ زبان انگریزی مجھ سے اظہار محبت کرنے لگا۔ میں نے بمشکل کچھ انگریزی بول کر اسے اپنے آپ سے الگ کیا اور پوچھا کہ جناب اپنا تعارف تو کروا دیجیے۔ اس پر وہ بدستور ہنستا رہا اور اس ہنسی میں فقرے ٹانکتا گیا...... مجھے پہچانا نہیں' میں تمہارے ساتھ سکول میں تھا...... فلاں ہیڈ ماسٹر کے زمانے میں...... فلاں ماسٹر تھے اور تم بزم ادب میں ''پاگل نگر کی خبریں'' پڑھا کرتے تھے اور ہم سب تمہیں پاگل نگر کہا کرتے تھے۔ ان صاحب کی یہ دیگر معلومات تو سو فیصد درست تھیں لیکن مجال ہے جو مجھے ان کی شکل میں پہچان کا کوئی شائبہ نظر آیا ہو۔ میں نے اُن کا دل توڑنا مناسب نہ جانا اور اُنہیں ''ارے تم...... کمال ہے'' کہہ کر بغلگیر ہو گیا۔ ''تمہارا نام بھول رہا ہوں۔''

''شوکت...... '' اور یہ نام اُنہوں نے انگریزی میں ہی بتایا جو شاؤ کیٹ تھا......

یہ شاؤ کیٹ اوائل عمری میں ہی انگلستان سدھار گیا اور چونکہ عمدہ تیراک تھا اس

لیے اس نے مناسب جانا کہ رود بار انگلستان عبور کر کے شہرت کمائے لیکن شاید رود بار انگلستان نے مناسب نہ جانا...... کہا جاتا ہے کہ شوکت پوری دھوم دھام سے رود بار عبور کرنے کے لیے ڈوور پہنچا۔ پانی میں ہاتھ ڈالا اور ''اوئی'' کہہ کر واپس کھینچ لیا اور کہنے لگا یہ تو بہت ٹھنڈا ہے...... رود بار عبور کرنے کا ارادہ ترک کر کے وہ کینٹربری میں مقیم ہو گیا اور وہاں اس نے جڑی بوٹیوں اور خوشبو آور جھاڑیوں کا ایک فارم بنایا جو اتنا کامیاب ہوا کہ ملکہ معظمہ نے اُسے اپنی خصوصی ٹی پارٹی پر مدعو کیا...... پھر شوکت کے مختلف آپریشن ہوئے جن کے نتیجے میں وہ دکھی ہونے کی بجائے مزید ہنس مکھ ہو گیا اور فرانس میں ایک چھوٹا سا ''شاتو'' خرید کر مزے کرنے لگا اور پینٹنگ کرنے لگا کیونکہ ڈاکٹروں نے اُسے صرف چار پانچ برس کی مہلت دی ہے...... پہلی ملاقات کے بعد وہ ہر دو تین برس کے بعد جب بھی پاکستان آتا کچھ وقت میرے ساتھ ضرور گزارتا...... اور وہاں اس دوران اُس نے تین شادیاں بھی کیں اور متعدد گورے بچے بھی پروڈیوس کیے جن میں سے کچھ شادی شدہ ہو چکے ہیں۔ شوکت صرف انگریزی بولتا ہے البتہ غصے میں آ جائے تو کچھ آبائی گالیاں بولتا ہے...... اس بار آیا تو اپنی تصویریں بھی ہمراہ لایا جن کی نمائش نیشنل کالج آف آرٹس کی گیلری ظہور الاخلاق میں منعقد ہوئی اور اُس نے زبردستی نمائش کا فیتہ مجھ سے کٹوایا...... تصویریں دلچسپ تھیں اور زیادہ تر پھولوں اور درختوں کی تھیں اور ان میں بچوں ایسی معصومیت اور شوخ رنگ تھے...... نمائش کے بعد کہنے لگا۔ ''یار مستنصر! کیا یہ ممکن ہے کہ تم مجھے کچھ پرانے سکول کے اولڈ بوائز سے ملا دو......'' چنانچہ میں نے اُسی شام تین اولڈ بوائز کو ایک ریستوران میں مدعو کر لیا۔

یہ خان صاحب' قریشی صاحب اور غزنوی صاحب تھے۔

سکول کے زمانے میں کچھ اور تھے اور ان دنوں ہمارے گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ بچے بڑے ہو کر خان صاحب وغیرہ ہو جائیں گے...... لیکن وہ ہو گئے۔

اب ایک جانب شوکت اسلام تھا۔ قہقہے لگاتا...... کھلنڈرا اور شوخ اور دوسری جانب یہ تین سکول فیلوز تھے جو اب معزز اور معتبر ہو چکے تھے اور بزرگ ہو چکے تھے' اس لیے نہایت سنجیدہ اور گمبھیر تھے۔ ہمارے ہاں یہ روایت ہے کہ انسان عمر رسیدہ ہو جائے تو وہ صرف موت اور مذہب کی باتیں کرتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ وہ ایک نہایت پُروقار بزرگ

ہے جو دانائی سے بھرپور اور زندگی سے عاری ہے۔

ریستوران میں بیٹھتے ہی شوکت نے پہلے تو اپنے سکول فیلوز کو "اولڈ راسکلز" کے لقب سے نوازا اور پھر باری باری ان کے شدید قسم کے بوسے لے کر اپنی خوشی کا اظہار کیا...... اس پر وہ تینوں نہایت شاکڈ ہوئے اور مزید گمبھیر ہو گئے...... اُنہوں نے شوکت کی اس حرکت کو شدید طور پر ناپسند کیا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ اُن تینوں کو بھی یہ یاد نہیں تھا کہ کبھی شوکت ان کا سکول فیلو ہوا کرتا تھا اور اُنہوں نے صرف میری گواہی پر یقین کر لیا تھا۔ اس لیے وہ اُس کے ساتھ زیادہ فری نہیں ہو رہے تھے...... لیکن مجال ہے شوکت پر اُن کی سرد مہری کا ذرہ برابر بھی اثر ہوا ہو۔ وہ بار بار اُن سے ہاتھ ملاتا اور اپنی خوشی کا اظہار کرتا۔ میں نے اُسے بتایا کہ خان صاحب ایک اعلیٰ سرکاری عہدے سے حال ہی میں ریٹائر ہوئے ہیں اور قریشی اور غزنوی بہت بڑے کاروباری میگنٹ ہیں۔

شوکت سب سے پہلے قریشی پر نثار ہوا اور کہنے لگا۔ "اوئے تمہارا نام تو علم الدین ہوا کرتا تھا' تم قریشی کب سے ہو گئے ہو۔ مجھے یاد ہے تمہارا گھر گندے نالے کے قریب تھا اور تم ہمیں وہاں لے جا کر گنے کا رس پلایا کرتے تھے......"

قریشی جو اب ڈیفنس میں ایک عالیشان سینٹرلی ایئر کنڈیشنڈ گھر میں رہتا تھا' متعدد فیکٹریوں کا مالک تھا' کھسیانی ہنسی ہنسا اور کہنے لگا۔ "چھوڑو بھئی وہ تو پرانے زمانے کی باتیں ہیں۔"

"یار میں تو اُنہی زمانوں کی باتیں کرنے آیا ہوں...... یاد ہے سکول کے باہر جو آلو چھولے بیچنے والا تھا تم اُس کے نان چرا لیا کرتے تھے...... اور آٹھویں جماعت کے امتحان میں حساب کا پرچہ میں نے تمہیں حل کر کے دیا تھا......"

قریشی نے ذرا ناگواری کا اظہار کیا اور ویٹر سے شکایت کی کہ کافی کے لیے جو کریم آئی ہے وہ زیادہ گاڑھی نہیں ہے۔

"اور تم غزنوی......" شوکت نے غزنوی کو ایک دھپ رسید کی۔ "یار تم کبھی غزنی گئے بھی ہو یا گھر بیٹھے غزنوی ہو گئے ہو...... تم ہمیشہ ٹنڈ کروا کے آتے تھے اور ہم تمہیں یوسف ٹنڈ کہا کرتے تھے...... میٹرک میں فیل ہو گئے تھے ناں پہلی مرتبہ......"

یوسف ٹنڈ یعنی غزنوی صاحب نے کچھ حوصلہ کیا اور مسکرا دیئے۔ "بھئی ہمارے آباؤ اجداد اُدھر غزنوی سے آئے تھے۔"

"یعنی تمہیں سکول کے زمانے میں علم نہیں ہوا تھا کہ وہ وہاں سے آئے ہیں۔" شوکت نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ "یاد ہے بس سٹاپ پر ایک کالے برقعے والی لڑکی نے تمہاری ٹھکائی کی تھی اور پھر تمہارے ابا جان نے بھی سکول آ کر تمہیں زدوکوب کیا تھا...... بھئی کیا زمانے تھے......"

غزنوی کو یاد آیا کہ اس کو باتھ روم جانا ہے اور وہ اُٹھ کر چلا گیا۔ اس دوران خان صاحب سگار پیتے رہے۔

اب ان کی باری تھی۔ "یار تم تو اُس زمانے میں بھی خان ہوا کرتے تھے اور کیا گورے چٹے لڑکے ہوا کرتے تھے۔ آدھا سکول تم پر عاشق تھا...... اور تم بھی فائدہ اٹھاتے تھے اور تحفے وصول کرتے تھے......"

خان صاحب کا رنگ مزید سرخ ہو گیا۔ "بس بھئی ہمیں تو سکول کا زمانہ کچھ یاد نہیں ایک مدت ہو گئی...... ویٹر ایک گلاس ٹھنڈا پانی لانا......"

میں نے سوچا' صورت حال کچھ بگڑتی جا رہی ہے' اُسے قابو میں لانا چاہیے۔ "یار شوکت کوئی اور بات کرو...... تم بھی کیا پرانے قصے لے بیٹھے ہو۔"

"لیکن مستنصر......" اُس نے حیرت سے کہا۔ "میں تو انگلینڈ چلا گیا تھا تو مجھے صرف وہی پرانے قصے یاد ہیں اور میں اُنہی کو دُہرانا چاہتا ہوں اور خوش ہونا چاہتا ہوں۔"

میں نے فوراً اُسے خان صاحب' قریشی صاحب اور غزنوی صاحب کی کامیاب زندگی' دولت کی فراوانی اور معاشرے میں اعلیٰ مقام کے بارے میں تفصیل سے بتایا تاکہ وہ مناسب طور پر متاثر ہو سکے۔ اس دوران غزنوی صاحب باتھ روم سے واپس آ چکے تھے۔

شوکت کچھ دیر چپ بیٹھا رہا اور پھر اُن تینوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "آپ لوگ خوش نہیں ہیں...... کیوں؟"

اُن تینوں نے اُسے یقین دلایا کہ وہ نہایت معزز ہیں اور مالدار ہیں اور خوش ہیں۔

"لیکن تم خوش دکھائی نہیں دیتے۔" وہ چلایا۔ "یہ زندگی اس لیے ہے کہ اسے ہنسی خوشی بسر کیا جائے...... اور آپ لوگ اتنے سنجیدہ بیٹھے ہو جیسے کوئی مر گیا ہو...... مسکراؤ یار...... کم آن یو راسکلو......"

وہ مسکرائے نہیں صرف خان صاحب نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "شوکت صاحب آپ بہت خوش ہیں...... کیوں؟"

"اس لیے کہ میرے ڈاکٹروں نے مجھے پورے چار برس دیے ہیں...... اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے...... میں اس زندگی سے لطف اٹھا رہا ہوں...... ہاہاہا......"

ان تینوں نے اس کے قہقہے کو ناپسند کیا اور باری باری کوئی بہانہ بنا کر چلے گئے۔

"انہیں کیا ہوا ہے؟" شوکت نے حیران ہو کر مجھ سے پوچھا۔

"یہ خوشی کو ناپسند کرتے ہیں شوکت...... تم ان کی پروا نہ کرو اور اپنے چار برس انجوائے کرو۔"

براہِ کرم میری عزت نہ کیجیے...

میں اپنی عزت افزائی سے تنگ آ گیا ہوں۔

جہاں جاتا ہوں، وہاں خوب خوب عزت ہوتی ہے اور ہوتی ہی چلی جاتی ہے اور عزت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

یہ نہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ جہاں جاؤں، وہاں میری بے عزتی ہو۔ جس محفل میں جاؤں وہاں سے نکالا جاؤں...... نہیں...... یہ نہیں چاہتا، ویسے کبھی کبھار بے عزتی بھی ہو جاتی ہے لیکن میں کسی کو بتاتا نہیں کہ کیوں ہوئی ہے۔

لیکن عزت افزائی کی بھی تو کوئی حد ہونی چاہیے۔

یہ بہار کے دن ہیں لیکن میرے لیے عذاب کے دن ہیں۔ جی نہیں مجھے اللہ کا شکر ہے کہ پھولوں سے الرجی نہیں ہے جو اپنے دوست خاور زمان کی مانند پورا موسم بہار ایک تولیے میں چھینکیں مارتے گزار دوں، بلکہ مجھے عزت افزائی سے الرجی ہے اور یہ وہ دن ہیں جب تعلیمی اداروں کے سالانہ فنکشن منعقد ہوتے ہیں۔ تقریری مقابلے ہوتے ہیں۔ ادبی اور غیر ادبی انجمنوں کے کارکن متحرک ہو جاتے ہیں اور شہر بھر کے ادیب، شاعر اور ٹیلیویژن پر نمودار ہونے والے لوگ ان کارکنوں سے منہ چھپاتے پھرتے ہیں کہ وہ ان کی عزت افزائی کرنے پر تلے ہوتے ہیں اور انہیں مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا طریقہ واردات نہایت سائنسی ہوتا ہے، عام طور پر اس واردات کا آغاز ٹیلیفون سے ہوتا ہے۔

"جی سلاما لیکم...... آپ بول رہے ہیں......" ایک نہایت مترنم آواز سنائی دیتی ہے۔

"جی میں بول رہا ہوں۔"

''تو بولیے......''

''کیا بولیے......'' میں بھنا کر کہتا ہوں۔

''کچھ بھی بولیے' ہم تو آپ کو بولتے ہوئے سننا چاہتے ہیں۔''

''آپ کچھ پوچھیں گی تو میں بولوں گا ناں......''

''آپ وہاں ٹیلی ویژن پر تو خواہ مخواہ بولے چلے جاتے ہیں۔ اب ہم نے فون کیا ہے تو نخرے دکھا رہے ہیں۔''

''دیکھیے محترمہ آپ براہ کرم فرما دیں کہ آپ کیا چاہتی ہیں۔''

''سوری سر...... وہ یکدم آفیشل ہو جاتی ہیں۔'' میں فلاں کالج کی پرنسپل صاحبہ کی جانب سے آپ کو فون کر رہی ہوں...... ہمارے کالج میں دوپٹے رنگنے کا کمپی ٹیشن ہو رہا ہے اور ہم آپ کو چیف گیسٹ کے طور پر بلانا چاہتے ہیں۔''

''لیکن دوپٹے رنگنے کے مقابلے میں آ کر میں کیا کروں گا......؟''

''آپ ہماری بچیوں کی حوصلہ افزائی کریں گے اور انعام تقسیم کریں گے۔''

''سوری جی...... میں نہیں آ سکتا......''

''واہ...... آپ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں...... ایک تو ہم آپ کی عزت افزائی کرنا چاہتے ہیں اور آپ کروانا نہیں چاہ رہے...... اور ہاں فنکشن کے اختتام پر آپ کو گلدستہ پیش کیا جائے گا اور پرنسپل صاحبہ کے دفتر میں چائے ہوگی جس میں فروٹ چاٹ اور پکوڑے ہوں گے...... تو آپ وقت پر پہنچ جائیے گا۔''

تو جناب میں اس قسم کی عزت افزائی سے تنگ آ گیا ہوں۔

ایک تو ان دنوں یہ بُوکے یا گلدستہ پیش کرنے کا رواج ہو گیا ہے چونکہ ایسے گُل دستوں میں جو پھول سجے ہوتے ہیں اُن کو کاٹ کر اور کوئی خاص کیمیکل چھڑک کر چمکیلا اور ترو تازہ بنایا جاتا ہے تو انہیں آپ گھر واپسی پر گلدان میں سجا بھی نہیں سکتے...... ایسے بوکے سے آپ زیادہ سے زیادہ جھاڑ پونچھ کا کام لے سکتے ہیں یا کسی کو زدوکوب کر سکتے ہیں...... کچھ عرصہ پیشتر میں اسی قسم کی عزت افزائی کروا کے گھر واپس آیا تو میری کار کی پچھلی نشست پر تین بُوکے پڑے ہوئے تھے اور یاد رہے کہ یہ بقر عید سے کچھ روز پہلے کا وقوعہ

ہے...... میری بیگم کار کی آواز سن کر پورچ میں آئی اور کہنے لگی۔ ''تو کیسا رہا تمہارا فنکشن......؟''

''بڑی عزت افزائی ہوئی بیگم...... ڈیڑھ سو بچوں میں انعام اور سرٹیفکیٹ تقسیم کیے' سٹیج پر اتنی دیر کھڑا رہا کہ ٹانگیں پتھر کی ہو چکی ہیں اور دن میں تارے نظر آ رہے ہیں لیکن عزت افزائی بہت ہوئی۔''

''یہ عزت افزائی ہوئی ہے؟'' اس نے پچھلی نشست پر پڑے گلدستوں کی جانب اشارہ کیا۔

''بالکل...... عام قسم کی شخصیات کو تو صرف ایک بُوکا پیش کیا جاتا ہے مگر میری اتنی عزت افزائی ہوئی کہ تین بُوکے پیش کیے گئے۔''

بیگم قطعی طور پر متاثر نہ ہوئیں اور کہنے لگیں۔ ''ان سے بہتر تھا کہ وہ تمہیں کچھ چارا پیش کر دیتے' کم از کم اس بکرے کو کھلا دیتے جو صبح سے باں باں کر رہا ہے...... انہیں تو بکرا بھی منہ نہ لگائے گا...... جاؤ اس غریب کے لیے بازار سے چارا خرید کر لاؤ......''

پرانی کہاوت ہے کہ انگریزوں نے طعنہ دیا کہ ہم جب میدان جنگ میں اترتے ہیں تو عزت کے لیے لڑتے ہیں اور فرانسیسی دولت حاصل کرنے کے لیے لڑتے ہیں۔ اس پر فرانسیسی حضرات کی جانب سے جواب آیا کہ بالکل درست فرمایا کیونکہ جس قوم کے پاس جس چیز کی کمی ہوتی ہے وہ اسی کے لیے لڑتی ہے۔

اب میرا بھی یہی حال ہے کہ عزت تو دھڑا دھڑ مل رہی ہے لیکن دولت کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ بھلا ہو شہر کے دو تین شاعروں کا اور ایک دو ریٹائرڈ جج حضرات کا کہ وہ اس نوعیت کی محفلوں میں اڑتے ہوئے پہنچ جاتے ہیں اور خوب عزت کرواتے ہیں......

پچھلے برس ایک پرائیویٹ سکول کی جانب سے دعوت موصول ہوئی کہ بچوں کا فینسی ڈریس کا مقابلہ ہے' آپ چیف گیسٹ کے طور پر تشریف لائیں...... میں واقعی کہیں اور مصروف تھا اس لیے معذرت کر دی اور اس معذرت پر پرنسپل صاحب نے بہت برا منایا اور کہنے لگے۔ ''تارڑ صاحب! ادیب اور دانشور وغیرہ ہمیشہ رونا روتے رہتے ہیں کہ قوم ہماری قدر نہیں کرتی...... ہم آپ کی جگہ کسی مخیّر شخصیت کو بلا سکتے تھے جو ہمارے سکول کو ڈونیشن بھی دے

کر جاتے...... آپ نے کیا دینا تھا۔" اور فون بند...... اس سے اگلے روز ان کا پھر فون آیا اور کہنے لگے۔ "میں آپ کو صرف یہ بتانے کے لیے فون کر رہا ہوں کہ آپ تو نخرے کر رہے تھے ناں، عزت افزائی نہیں کروانا چاہتے تھے تو ہم نے فلاں ریٹائرڈ جج صاحب سے درخواست کی تو نہ صرف وہ تشریف لا رہے ہیں بلکہ اپنے ہمراہ کچھ پریس فوٹو گرافروں کو بھی لا رہے ہیں...... سمجھے آپ......؟"

کچھ لوگ تو اس قسم کی دعوت بڑے ادب اور احترام سے دیتے ہیں...... گھر آ کر درخواست کرتے ہیں اور یہ پیشکش بھی کرتے ہیں کہ سرگاڑی بھیج دیں گے تاکہ آپ وقت پر پہنچ جائیں لیکن کچھ ایسے حضرات ہوتے ہیں اور یہ حضرات جمہوری دور میں زیادہ پائے جاتے ہیں جو باقاعدہ دھونس جماتے ہیں اور تقریباً دھمکی آمیز انداز میں دعوت دیتے ہیں۔

"جی آپ بول رہے ہیں...... میں نے آپ ہی سے بات کرنی تھی، میں فلاں سٹوڈنٹ یونین کے سیکرٹری جناب فلاں کی جانب سے بول رہا ہوں...... ہم تعلیم کے فروغ کے لیے کتابوں کا میلہ منعقد کر رہے ہیں جس میں آپ کو شمولیت کی دعوت ہے...... پورے وقت پر پہنچ جائیے گا، یونین کا نمائندہ گیٹ پر ہوگا...... آپ اگر نہ آئے تو پھر یہ دیکھ لیجیے گا کہ ہمارے کارکن بے حد جوشیلے ہیں۔"

ریڈیو پاکستان کے ایوارڈز کی ایک جیوری میں اشفاق احمد صاحب کے ہمراہ میں بھی تھا...... جب ہم نے اپنا فیصلہ قلمبند کر دیا تو اشفاق صاحب کہنے لگے۔ "یار تارڑ! تم سے کچھ مشورہ کرنا ہے۔"

میں نے عرض کیا "خان صاحب! مشوروں کے تو آپ ماسٹر ہیں، بہر حال فرمائیے۔"

کہنے لگے۔ "میں اور تمہاری بانو آپا کل ایک ایکشن پلان بنا رہے تھے کیونکہ ہم محفلوں اور یونیورسٹی کالجوں میں صدارتیں کرتے کرتے تنگ آ چکے ہیں۔"

"خان صاحب......" میں اچھل پڑا۔ "آپ بھی عزت افزائی کرواتے کرواتے تنگ آ گئے ہیں، سبحان اللہ...... تو کیا ایکشن پلان بنایا بانو آپا کے ساتھ......"

نہایت سنجیدگی سے داڑھی کھجاتے ہوئے بولے۔ "لوگ موچی سے ایک کیل جوتے میں لگواتے ہیں تو اسے دو چار روپے اجرت دے دیتے ہیں اور ہم لوگ جو اتنے مخجل

خوار ہو کر بالآخر ادیب اور دانشور ہو جاتے ہیں تو ہماری خدمت کی کوئی اُجرت نہیں دی جاتی چنانچہ تمہاری بانو آپا نے طے کیا ہے کہ آئندہ فنکشن کی صدارت کے لیے دس ہزار روپے...... فیتہ کاٹنے کے پانچ ہزار...... تقریر کرنے کے پندرہ ہزار اور فی تصویر ایک ہزار روپے...... کیا خیال ہے کیونکہ ہم تمہیں بھی اس ایکشن پلان میں شامل کرنا چاہتے ہیں......"

اشفاق صاحب کا ایکشن پلان ہے تو نہایت عمدہ لیکن مجھے ڈر ہے کہ عزت افزائی کے شوقین کچھ دانشور اور ریٹائر افسر اسے سبوتاژ کر دیں گے بلکہ اپنے پلّے سے اتنی رقم دے کر صدارتیں کرتے رہیں گے۔

چنانچہ میں بھی فی الحال صرف عزت افزائی پر گزارہ کروں تو بہتر ہے اگرچہ گزارہ نہیں ہوتا۔

بن مانس بیوہ کا پرابلم

خلیفہ خلفشاری ایک زمانے میں بہت خوش قسمت ہوا کرتا تھا...... پھر وقت کے گزرنے سے دھیرے دھیرے تنہائی اور اداسی کی صورت میں اسے بدقسمتی ملنے لگی......

ہم سب اس کی قسمت پر رشک کیا کرتے تھے۔ جب اس کے بڑے بیٹے نے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی اور اسے ایک امریکی یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا تو اس نے محلے میں لڈو بانٹے اور ہم شدید حسد میں مبتلا ہوئے کہ اب خلیفہ کے گھر میں ڈالروں کی بارش شروع ہو جائے گی اور وہ ہوئی بھی......

بڑے بیٹے نے چھوٹے بھائی کو جو یہاں صرف ڈنڈے بجاتا تھا' سپانسر کر کے اپنے پاس بلا لیا تو خلیفہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا...... اور ہمارے حسد کی کوئی حد نہ تھی......

چند برس پیشتر اس کا سب سے چھوٹا بیٹا بھی کینیڈا چلا گیا...... اس دوران خلیفہ کی بیوی بھی چلی گئی لیکن اس کی منزل ملک عدم تھی...... بچوں میں سے کوئی بھی اس کے جنازے میں شریک نہ ہو سکا......

اب خلیفہ کے مختصر گھر کی دیواروں پر اس کے بیٹوں کی تصویریں سجی ہیں اور وہ تنہا رہتا ہے۔ اس کو روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں۔

بیٹے اس کی ضرورت سے کہیں زیادہ رقم اسے باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں کہ وہ ناخلف ثابت نہیں ہوئے اور اپنے باپ کو نہیں بھولے...... لیکن وہ واپس آنے کا نام نہیں لیتے...... خلیفہ اپنے دن کا بیشتر حصہ اخبار پڑھنے میں گزارتا ہے اور شام کے وقت محلے کے دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرتا ہے...... وہ بہت مطمئن زندگی گزار رہا تھا لیکن ان دنوں وہ کچھ بجھا بجھا سا رہتا ہے اسے احساس ہو گیا ہے کہ جسے وہ اپنی خوش قسمتی سمجھتا تھا وہ تنہائی اور

اداسی کی صورت میں بدقسمتی میں بدل گئی ہے۔ اسے راتوں کو نیند نہیں آتی صرف اس خوف سے کہ اگر وہ سوتے ہوئے مر گیا تو محلے میں کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا کیونکہ گھریلو ملازم کام کر کے چلے جاتے ہیں اور وہ رات کو تنہا ہوتا ہے۔

خلیفہ آج صبح میرے پاس آیا تھا اور اس کی گفتگو میں کہیں بھی وہ طنز اور کاٹ نہ تھی جو مجھے لطف دے جاتی تھی...... کہنے لگا۔ "یار میں تم سے ایک مشورہ کرنا چاہتا ہوں...... میں اپنی تنہائی کو کم کرنے کے لیے گھر میں کوئی جانور رکھنا چاہتا ہوں......"

"تم ایک ہاتھی رکھ لو...... گھر بھر جائے گا...... اور شام کو اس پر سوار ہو کر فوڈ سٹریٹ میں سیر کیا کرنا......" میں نے اس کا موڈ بہتر کرنے کی خاطر ہانک دی۔

"یار مجھ سے مسخری مت کرو میں سنجیدہ ہوں......" اور واقعی خلیفہ بے حد سنجیدہ تھا...... "مجھے رفاقت کی ضرورت ہے میں اکیلا نہیں رہ سکتا۔"

"تو پھر شادی کر لو......"

"تم پھر مسخری کر رہے ہو...... میں اس عمر میں کسی بھی اجنبی ذات کے ساتھ نہیں رہ سکتا...... تمہیں جانوروں سے دلچسپی ہے' ان کی خصلت سمجھتے ہو' اس لیے سنجیدگی سے مشورہ دو کہ کون سا جانور پالوں......"

"جانور چاہیے یا پرندہ؟"

"کچھ بھی ہو۔"

"اگر زیادہ رقم خرچ نہیں کرنا چاہتے تو ایک جھینگر پال لو۔"

"میں تمہیں ایک جھانپڑ دوں گا۔" خلیفہ پہلی بار مسکرایا۔ "جھینگر کیسے پالا جا سکتا ہے؟"

"خلیفہ میں نے چین میں دیکھا تھا کہ تنہا بوڑھے ایک جھینگر پال لیتے ہیں اور اسے جام جیلی کی خالی بوتل میں بند کر کے اس کے اوپر ململ باندھ کر کان سے لگا کر پہروں بیٹھے اس کے گیت سنتے رہتے ہیں...... میں سچ کہتا ہوں بلکہ ایک دوست نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ بالآخر تم نے بھی کبھی نہ کبھی تنہا رہ جانا ہے تو اپنے حصے کا جھینگر یہیں چین سے لے جاؤ...... چینی جھینگر نہایت سریلے ہوتے ہیں۔"

''اس کے علاوہ......''

''باتیں کرنے والا طوطا......''

''نہیں یار...... طوطے بہت عیار ہوتے ہیں...... تم پر کڑی نظر رکھتے ہیں کہ کہاں جا رہے ہو...... کس کا فون آیا ہے اور پھر نہایت طنز آمیز گفتگو کرتے ہیں...... میرے ایک جاننے والے نے طوطا پالا تھا اور وہ ہر وقت ایک ہی رٹ لگاتا تھا...... اوئے بوڑھے ہو گئے ہو اوئے بوڑھے ہو گئے ہو...... تو اس نے تنگ آ کر اس کی گردن مروڑ دی تھی۔''

''ویسے خلیفہ تمہیں بیٹھے بٹھائے کیسے خیال آ گیا کہ تمہیں ایک جانور کی رفاقت درکار ہے......''

''یوں تو بہت دن سے سوچ رہا تھا لیکن کل ایک غیر ملکی چینل پر فلم دیکھ رہا تھا...... وقفے کے دوران اشتہار چلنے لگے۔ سکرین پر ایک خط ٹائپ کیا جانے لگا کہ...... میں ایک بیوہ ہوں۔ میرے دو بچے ہیں۔ میں بے سہارا ہوں۔ براہ کرم میری مدد کیجئے...... یہ خط ختم ہوا تو سکرین پر ایک مادہ بن مانس دکھائی گئی اپنے دو بچوں کے ہمراہ...... معلوم ہوا کہ جانوروں کی بہبود کی کسی آرگنائزیشن کا اشتہار ہے چندے کے لیے...... دیکھ لو اہل مغرب کتنے نرم دل ہیں۔ افریقہ میں ایک مادہ بن مانس بیوہ ہو جائے تو اس کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ افغانستان' کشمیر یا فلسطین میں بے شک ہزاروں بیوائیں ہوں' لاکھوں یتیم بچے ہوں' ان کا خیال صرف اس لیے نہیں رکھتے کہ وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں مصروف ہیں۔ بہرحال مجھے تب خیال آیا کہ اگر ایک مادہ بن مانس تنہا نہیں رہ سکتی میں تو پھر انسان ہوں۔''

''اس مادہ بن مانس کے بارے میں کیا خیال ہے؟......''

''کیا تم سنجیدہ نہیں ہو سکتے؟''

''چلو ہو گیا...... اب باقی تو کُل دنیا کا سب سے پسندیدہ جانور کتا رہ جاتا ہے۔''

''کتا تو نجس ہوتا ہے......''

''لیکن...... وفادار ہوتا ہے۔''

''لیکن اس کو بوسہ بازی کی بہت عادت ہوتی ہے۔''

''کیا مطلب......؟''

''میرے ایک دوست نے ایک نہایت لحیم شحیم کتا پالا اور اسے سختی سے منع کر دیا کہ وہ اسے یا اس کے بچوں کو چومنے چاٹنے سے پرہیز کرے...... کتا عقلمند تھا۔ دو چار بار کوشش کی اور جوتے پڑے تو سیدھا ہو گیا...... لیکن کرنا خدا کا کیا ہوا کہ اس کا ایک بچپن کا دوست ایک عرصہ یورپ میں قیام کے بعد اسے ملنے آیا تو اس کی بیوی انگریز تھی اور پانچ عدد بچے بھی کافی انگریز تھے۔ انہوں نے جو اس مزیدار اور موٹے تازے کتے کو دیکھا تو رہ نہ سکے اور اس سے خوب لاڈ پیار کیا اور نہایت رغبت سے اسے چوما۔ کتے نے اس سے بھی زیادہ والہانہ رغبت سے زبان نکال کر انہیں چوما چاٹا...... وہ تو چلے گئے لیکن کتے کو لت پڑ چکی تھی...... وہ صبح سویرے بچوں کے کمرے میں گھس جاتا اور اس سے پیشتر کہ وہ بیدار ہو کر اسے جوتے لگاتے وہ اپنا کام دکھا جاتا...... چنانچہ اس کتے کی ان قبیح عادتوں کی وجہ سے اسے فروخت کر دیا گیا...... میں نہیں چاہتا کہ اس عمر میں ایک کتا مجھے چومے چاٹے......''

''ہاں یہ کتے بس ایسے ہی ہوتے ہیں...... غیر کی صحبت میں انہیں یہ خو پڑ جاتی ہے اور التجا کیے بغیر یہ حرکت شروع کر دیتے ہیں...... اور کوئی اعتراض؟''

''میں نے یہ بھی نوٹ کیا ہے کہ انسان جس جانور کے ساتھ زیادہ عرصہ گزارے آہستہ آہستہ اس کی شکل اسی جانور سے ملنے لگتی ہے...... ہمارے ایک قریشی صاحب ہیں جن کے گھر میں انسانوں سے زیادہ کتے ہیں...... انہیں ملنے جاؤ تو جب دروازہ کھلتا ہے تو یکدم یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ قریشی صاحب ہیں یا ان کا پسندیدہ راٹ ویلر...... میں یہ رسک بھی نہیں لینا چاہتا کہ پہلے میری شکل بدل جائے اور پھر میں اداسی کے لمحوں میں بھونکنا شروع کر دوں۔''

''ہاں خلیفہ تمہارا مشاہدہ درست لگتا ہے...... دیکھو ناں یورپ والے ایک خاص جانور کو بہت عزیز رکھتے ہیں تو ان کی شکلیں...... بہرحال...... اب ہمارے خاندان کو ہی دیکھو ہم سب کی ناکیں بہت تیکھی ہیں جس کا مطلب ہے کہ ہم لوگ کبھی نہ کبھی طوطے پالا کرتے تھے......''

''اب تمہارا طوطا چشم ہونا بھی سمجھ میں آتا ہے......''

''چونکہ تم میرے دوست ہو خلیفہ اس لیے میں یہ بے عزتی برداشت کر جاؤں گا۔
بہتر یہی ہے کہ تم ایک عدد بکرا پال لو...... اس میں کوئی رسک نہیں ہے کیونکہ تمہاری شکل پہلے سے ہی کچھ اسی قسم کی ہے...... اور اگلی عید پر قربانی کے کام بھی آجائے گا......''

''وہ تو دن رات باں باں کرے گا اور اس کی بُو ہوگی......''

''تو پھر یہی ہو سکتا ہے کہ تم اس بن مانس بیوہ سے رجوع کر لو...... اور کچھ نہیں ہو سکتا...... البتہ یہ دیکھ لینا کہ بے شک ایک بن مانس ہو اس کی بھی ایک حس جمال ہوتی ہے...... پتہ نہیں وہ تمہیں قبول کرے یا نہ کرے۔''

ہم ڈارلنگ اونٹوں سے پیار کیوں نہیں کرتے

ہم نے ایک محاورہ گھڑ رکھا ہے کہ بدو خیمے سے باہر اور اونٹ اندر...... اس محاورے میں بھی اونٹ کی ہتک کا پہلو نکلتا ہے کہ وہ اتنا بدتمیز ہے کہ اپنے مالک کو خیمے سے باہر کر کے خود اس کے اندر گل چھرّے اڑاتا ہے حالانکہ بدوؤں کا خیمہ اتنا بڑا نہیں ہوتا کہ اس میں گل چھرّے اڑانے کی گنجائش ہو۔ اس محاورے میں تکنیکی خامی بھی یہی ہے' اتنا بڑا جانور ایک خیمے کے اندر کیسے جا سکتا ہے...... اس نقطہ نظر کو ثابت کرنے کے لیے میں اپنے دو خیمے کسی بھی عوامی جگہ پر ایستادہ کرنے کو تیار ہوں اور چیلنج کرتا ہوں کہ کوئی صاحب ایک اونٹ کو ان میں داخل کر کے دکھا دیں...... اگر وہ ایسا کر دکھائیں تو میں ان کو ایک اور اونٹ انعام کے طور پر دوں گا۔

اونٹوں کے ساتھ یہ زیادتی ختم ہونی چاہیے...... ہم اپنے بکروں کے ساتھ پیار کرتے ہیں...... بلیوں اور کتوں کے ساتھ پیار کرتے ہیں لیکن اونٹ سے ہم نے کبھی پیار نہیں کیا...... میں مانتا ہوں کہ ایسا کرنے میں کچھ دشواریاں بھی ہیں...... اس کی تھوتھنی اتنی بلندی پر پائی جاتی ہے کہ وہاں تک پہنچنے کے لیے ایک سیڑھی درکار ہوتی ہے اور تب جا کر آپ اسے ''ڈارلنگ کیمل'' کہہ سکتے ہیں...... حد تو یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کو طرح طرح کے نامناسب جانوروں سے منسوب کر کے ان سے لاڈ کرتے ہیں...... یہاں تک کہ انہیں برسرِ عام اوئے میرے گدھے کے بچے کہتے ہیں لیکن کبھی اتنی وسیع الظرفی کا مظاہرہ نہیں کیا کہ انہیں اوئے میرے چھوٹے سے اونٹ کہیں......

اب ذرا عاشق معشوقی کی جانب آئیں تو وہاں بھی اونٹوں کے خلاف واضح تعصب نظر آتا ہے...... اگر محبوب قدرے فربہ ہو تو اسے کتنے پیار سے ریچھ کا خطاب دے

دیا جاتا ہے...... ذرا جھگڑالو ہو تو اسے میرے پیارے باگڑ بلّے کہا جاتا ہے اور اگر وہ دراز قامت ہو تو اسے کبھی میرے ڈارلنگ اونٹ نہیں کہا جاتا...... آخر کیوں......؟ یہاں تک کہ لیلیٰ اور مجنوں کی ٹرانسپورٹ سہولت صرف اونٹوں تک محدود تھی اور اس کے باوجود مجنوں نے لیلیٰ کی یاد میں آہیں بھرتے ہوئے کبھی یہ نہ کہا کہ اے میری پیاری اونٹنی تو کہاں ہے...... شعرو شاعری میں بھی یہی حال ہے کہ وہاں گھوڑوں اور گدھوں کا تذکرہ تو مل جاتا ہے' اونٹ کہیں نہیں ملتا...... لے دے کے ایک پرانے زمانوں کا وہ عید کارڈ رہ گیا تھا جس پر ہلال عید کی تصویر کے سائے میں ایک اونٹ کھڑا ہوتا تھا اور اونٹ پر ایک عرب پتا نہیں کیا دعائیں مانگ رہا ہوتا تھا تو اب وہ عید کارڈ بھی آؤٹ آف فیشن ہو گیا ہے...... اگرچہ عید کارڈوں اور تہنیتی کارڈوں پر اب بھی جانوروں کی تصویریں شائع ہوتی ہیں جن میں سرفہرست کارٹون ہاتھی اور کتے تو پائے جاتے ہیں لیکن میں نے آج تک کسی کارڈ پر اونٹ کی تصویر نہیں دیکھی حالانکہ اونٹ میں یہ سہولت ہے کہ اس کا کارٹون بنانے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی...... میرا خیال ہے اونٹ کے خلاف اس سازش میں مغرب کا بھی ہاتھ ہے...... ایک تو مغرب میں اونٹ نہیں پایا جاتا اور وہ ہر اس شے کے خلاف ہیں جو ان کے ہاں نہیں ہوتی...... اس کے علاوہ وہ جب بھی ایک اونٹ کی تصویر دیکھتے ہیں تو انہیں اس پر اسامہ بن لادن بیٹھا نظر آتا ہے...... شکر ہے انہوں نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اونٹوں کو شامل نہیں کیا۔

اونٹ کو صحرا کا جہاز بھی کہا جاتا ہے حالانکہ سب جانتے ہیں کہ صحرا میں کسی قسم کا جہاز نہیں چل سکتا...... یہ صرف اونٹ کا مذاق اڑانے کے لیے کہا جاتا ہے کیونکہ اس حساب سے بحری جہاز کو بھی تو سمندر کا اونٹ کہا جانا چاہیے جو نہیں کہا جاتا...... کبھی کوئی طویل قامت شخص اونٹ پر بیٹھ جائے تو پھبتی کسی جاتی ہے کہ دیکھو اونٹ پر اونٹ بیٹھا ہے جو صریحاً زیادتی ہے...... اگر کسی طویل قامت شخص پر اونٹ بیٹھ جائے تو پھر دیکھیں گے کہ کیا کہا جاتا ہے۔

غرض کہ پوری تاریخ اونٹ کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں سے بھری پڑی ہے...... گھوڑے کو ہمیشہ اونٹ پر فوقیت دی جاتی ہے اور اس کی خوبصورتی کے گیت گائے جاتے ہیں...... حالانکہ گھوڑا بے وفا جانور ہے اور جو بھی اس پر سوار ہو جائے' اس کے ساتھ

چلا جاتا ہے جبکہ اونٹ کی جانب اگر کوئی غیر بڑھے تو وہ بلبلا بلبلا کر آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے اور اسے نزدیک نہیں آنے دیتا...... بعض اوقات تو اپنے مالک کو بھی نزدیک نہیں آنے دیتا...... اونٹ کی گھوڑے پر برتری کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ گھوڑا کھایا نہیں جاتا جبکہ اونٹ نہ صرف حلال ہے بلکہ اس کی قربانی بھی افضل ہے...... حلال ہونے کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن اونٹ کو کھانا البتہ مشکل ہے...... ویسے اس کے سری پائے البتہ بہت عمدہ بنتے ہیں...... چین کے مسلمان اونٹ کے روسٹ پاؤں نہایت رغبت سے کھاتے ہیں بقیہ اونٹ کا کیا کرتے ہیں' یہ معلوم نہیں...... اونٹ کی سری میں بھی ایک خصوصیت ہے کہ اسے کھانے کے بعد اس کے ڈھانچے سے دشمنوں کو زدوکوب کیا جا سکتا ہے...... قیاس غالب ہے کہ سیمسن نے جس جانور کے جبڑے کی مدد سے پوری فوج کا کچومر نکال دیا تھا' وہ اونٹ کا تھا۔

اونٹ کے خلاف ایک اور الزام یہ ہے کہ اس میں کینہ بہت ہوتا ہے...... جسے شتر کینہ کا نام دیا جاتا ہے جبکہ یہ خصلت صرف اونٹ میں ہی نہیں پائی جاتی' تمام جانوروں میں پائی جاتی ہے...... آپ کسی بھی جانور سے پنگا لیں گے تو وہ جواب میں کچھ نہ کچھ تو کرے گا...... بلی کی دُم پکڑ کر دیکھیں لہولہان کر دے گی چاہے آپ مالک ہوں...... کتے پر پاؤں رکھ دیں تو تیرہ ٹیکے لگوانے پڑیں گے...... کسی گھوڑے کے دانت گننے کی زبردستی کوشش کریں تو پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے...... کسی بھیڑ و بکرے سے چھیڑ چھاڑ کیجیے تو وہ ٹکریں مار مار کر اَدھ موا کر دے گا...... غرض کہ تمام جانور زیادتی پر ردعمل ظاہر کرتے ہیں' اس کے باوجود اونٹ کو برا کہا جاتا ہے...... یاد رہے کہ اس معاملے میں بھی اونٹ دیگر جانوروں کی نسبت زیادہ جنٹل مین ہے' وہ بہت کم اپنے مالک کے خلاف کینہ پالتا ہے جبکہ باقی جانور اپنے مالکوں کا قطعی لحاظ نہیں کرتے...... ہو سکتا ہے کہ گیارہ ستمبر سے پیشتر واقعی اونٹ کینہ پروری میں کمال رکھتا ہو لیکن اس کے بعد اس پر یہ الزام قطعی طور پر لاگو نہیں کیا جا سکتا...... امریکہ جس طرح پنجے جھاڑ کر اسامہ کے پیچھے پڑا ہے بلکہ اس سے پہلے عراق کے پیچھے بھی پڑ چکا ہے تو اب بیچارے اونٹ کو کینہ پرور کہنا اونٹ کے ساتھ تاریخی زیادتی ہوگی...... اب تو امریکہ کینہ نہایت موزوں اصطلاح ہوگی۔

پچھلے دنوں ایک ملک میں اونٹوں کا مقابلہ حُسن منعقد ہوا تھا...... میں سمجھتا ہوں کہ اس مقابلے کو منعقد کروانے والے مبارکباد کے مستحق ہیں...... کم از کم انہوں نے اونٹ کو اس کا جائز مقام دلانے کے لیے پہلی کوشش کی ہے...... میں ان کو اس احسن اقدام پر یقین دلاتا ہوں کہ پوری دنیا کے اونٹ اور میں ان کے ساتھ ہیں...... بلکہ اس مقابلے میں جو اونٹ یا اونٹنی مسٹر ورلڈ یا مس یونیورس کا اعزاز حاصل کرے گی، میں اس کی تصویر فریم کروا کر ایک عالمی رہنما کی تصویر کے برابر میں لگاؤں گا تا کہ ان کے درمیان بھی ایک مقابلہ حُسن ہو جائے اب یہ مت پوچھئے کہ کس عالمی رہنما کی تصویر کے برابر......!!

ہماری بے عزتی خراب ہوگئی...

کہا جاتا ہے کہ بے عزت ہونے کے لیے کوئی خاص وقت یا موقع نہیں ہوتا...... گھر میں تو بندہ اگر خوشگوار شادی شدہ زندگی بسر کر رہا ہو تو مسلسل بے عزت ہوتا ہی رہتا ہے لیکن گھر سے باہر بھی لاتعداد مواقع ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر آپ پھل فروٹ خرید رہے ہیں اور یونہی بے دھیانی میں ٹوکری میں سے ایک کیلا اٹھا کر کھا لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں دکاندار نے دیکھا نہیں اور وہ پھل کے پیسے وصول کرتے ہوئے دیگر گاہکوں کی موجودگی میں کہہ دیتا ہے کہ تارڑ صاحب اس میں اُس کیلے کی قیمت شامل نہیں جو آپ چوری چھپے کھا رہے تھے تو آپ ہی بتائیں کیا عزت رہ جائے گی...... اور یہ پہلی بار ہے کہ آپ نے بے دھیانی میں ایک کیلا اٹھا کر کھا لیا ہے حالانکہ بیگمات اتنا پھل فروٹ خریدتی نہیں جتنا بے دھیانی میں کھا جاتی ہیں...... اسی طرح آپ بے دھیانی میں سرخ بتی کراس کر جاتے ہیں اور ٹریفک کا سپاہی آپ کو روک کر کہتا ہے۔ ''باباجی اپنی عمر دیکھو اور کرتوت دیکھو......''

ایک تو ہوتا ہے بے عزتی ہونا اور ایک ہوتا ہے بے عزتی خراب ہونا...... جو بہت آگے کی چیز ہوتی ہے۔ کل مجھے گھر سے نزدیک ہی کسی فنکشن پر پہنچنا تھا اس لیے ذرا سیر کرکے ادھر جا رہا تھا کہ ایک سکول کے سامنے ایک صاحب نے مسکرا کر مجھے روک لیا کہ جناب بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ سے ملاقات ہوگئی...... ایک عرصے سے آپ کا قاری ہوں آپ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، آپ قوم کا سرمایہ ہیں وغیرہ وغیرہ...... کہنے لگے آپ پیدل کیوں جا رہے ہیں میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ بس یہ اگلے چوک تک جانا ہے

کی بات ہوگی آیئے کار میں تشریف رکھیئے...... چنانچہ میں نے کار میں تشریف رکھ لی...... راستے میں کہنے لگے۔ ویسے آپ مجھے جانتے ہیں...... میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو بولے...... میرے والد صاحب آپ کے دوست تھے آپ دونوں جناح باغ میں سیر کیا کرتے تھے۔ پھر انہوں نے اپنے والد صاحب کا کوئی بھلا سا نام بتایا تو وہ میری یادداشت میں کہیں نہ تھا...... اس پر سنجیدہ ہو کر کہنے لگے...... جناب میں بھنبھیری صاحب کا بیٹا ہوں......

''عجیب سا نام ہے......'' میں نے حیران ہو کر کہا......

''آپ ہی نے دیا تھا...... بلکہ اپنے ایک کالم میں آپ نے ان کا ذکر بھی کیا تھا......''

ذہن پر خاصا زور دیا تو یاد آیا کہ ہاں باغ جناح میں ایک صاحب ہوا کرتے تھے جو بڑی سپیڈ سے بھاگتے ہوئے کبھی سامنے سے نمودار ہوتے تھے اور کبھی عقب سے برآمد ہو کر یہ جا اور وہ جا...... چنانچہ ہم نے ان کی تیز رفتاری اور شوں کر کے نکل جانے کی وجہ سے بھنبھیری کا نام دے دیا۔ ظاہر ہے انہیں تو اس خطاب کا علم نہیں تھا' علم ہو جاتا تو شاید مرنے مارنے پر اتر آتے...... کہیں کسی کالم میں یہ تذکرہ بھی آ گیا جو ان کے اس وقت مجھے کار میں لفٹ دیتے صاحب زادے نے پڑھ لیا اور وہ اب اس کا حوالہ دے رہے تھے اور میری حالت وہی جس میں کاٹنے سے بدن میں لہو وغیرہ نہیں ملتا۔

میں نے اپنی خفت مٹانے کی خاطر کہا۔ ''بس جی ہم لکھنے والے تھوڑے سے بدتمیز ہوتے ہیں اور آپ کے والد صاحب سے ذرا بے تکلفی تھی ورنہ وہ کہاں اور ایک بھنبھیری کہاں......''

انہوں نے مسکرا کر کہا ''کوئی بات نہیں۔''

اس دوران میں سوچنے لگا کہ ایک اور صاحب ہمیشہ درختوں کے ساتھ لٹکتے ورزش کرتے پائے جاتے تھے جنہیں ہم چمگادڑ کہتے تھے اور ایک صاحب کو یکدم جھاڑیوں میں سے برآمد ہو کر ''السلام وعلیکم جناب قبلہ تارڑ صاحب'' کہنے کا شوق تھا ہم نے انہیں لومڑ کا خطاب دے رکھا تھا...... تو اگر کہیں ان دونوں میں سے کسی کے صاحبزادے سے ملاقات ہوئی تو انہیں کیا منہ دکھائیں گے...... بہر حال یہ مختصر سفر شرمندگی میں کٹا...... کار سے اترتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا تو پھر مسکرائے اور کہنے لگے۔ ''آپ کہتے ہیں کہ لکھنے والے

تھوڑے سے بدتمیز ہوتے ہیں۔ تھوڑے سے نہیں بہت بدتمیز ہوتے ہیں۔''

چنانچہ اب میں نے طے کر لیا ہے کہ آئندہ دل ہی دل میں جو کچھ بھی کسی کا نام رکھوں اس کا تذکرہ تحریر میں ہرگز نہیں کروں گا...... خواہ مخواہ بے عزتی خراب ہو جاتی ہے۔ باغ جناح میں سیر تو ایام جوانی و جہالت میں ہوتی تھی اب ماڈل ٹاؤن پارک میں ہمارا آنا جانا ہے...... وہاں بھی بڑے بڑے دلچسپ کردار ہیں جن میں ایک انجن بھائی جان ہیں جو اپنے بھاری تن و توش کے ساتھ لوگوں کو روندتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ ایک صاحب ذرا مختصر قد کے ہیں اور سو فیصد چارلی چپلن کی طرح چلتے ہیں صرف ہیٹ اور چھتری کی کسر ہے...... دو تین پینگوئن بابا ز ہیں...... ہمیشہ صاف ستھرے سفید لباس میں عصا ٹیکتے ہوئے ذرا لڑکھڑا کر چلے آتے ہیں اور دور سے بالکل پینگوئن لگتے ہیں...... مجھے معلوم ہے کہ اسی طرح لوگوں نے مجھے بھی کچھ نام دے رکھے ہوں گے اور آئینے میں اپنی شکل پر غور کروں تو شاید بابا گدھ یا باگڑ بلا وغیرہ نہایت موزوں ہوں گے...... یہ تو ان لوگوں کا قصہ ہے جن کے ساتھ بہت بے تکلفی نہیں ہے لیکن جو یار دوست ہیں ظاہر ہے ان کے نام اور بیجنل ہی چلتے ہیں...... مثلاً شاہ صاحب' چوہدری صاحب' بیگ صاحب وغیرہ وغیرہ۔ اب ہوا یہ کہ ان میں سے ایک کو بھی ایک خطاب سے نواز دیا گیا ہے...... اور نوازنے والا میں نہ تھا۔ اشفاق صاحب تھے جو اگرچہ جاٹ ہوا کرتے ہیں لیکن بیچتے تیل ہیں...... پچھلے دنوں دھند بہت تھی اور ہم ایک مقام پر کھڑے شیخ صاحب کے نمودار ہونے کا انتظار کر رہے تھے...... شیخ صاحب کو سردی بہت لگتی ہے اور جب سے ان کی بیگم فوت ہوئی ہیں کچھ زیادہ ہی لگتی ہے چنانچہ پوری بکتر بند حالت میں سیر کرتے ہیں اور سر کو ایک ''باندر ٹوپی'' سے ڈھانکتے ہیں...... اور یہ ٹوپی واقعی باندر یعنی بندر ٹوپی کہلاتی ہے لیکن سر اور چہرے کو گرم رکھنے کے لیے پچھلے دو ہزار برس سے اس سے بہتر ٹوپی ایجاد نہیں ہوئی...... شیخ صاحب دیگر شرفاء کی مانند ٹریک پر سیر کرنے میں یقین نہیں رکھتے بلکہ پارک میں داخل ہوتے ہی راستے چھوڑ کر سر سبز گھاس میں کچھ قلابازیاں لگاتے ہیں پھر اچھلتے ہوئے ایک عجیب سی ورزش کرتے ہیں۔ اور یاد رہے کہ موصوف کم سن نہیں ہیں دو تین برس میں ماشاءاللہ ستر کے پیٹے میں چلے جائیں گے لیکن عمر کے باوجود نہایت پوپٹ اور نوخیز لگتے ہیں...... چنانچہ ہم انہی شیخ صاحب کے منتظر

تھے کہ وہ آئیں اور ذرا گپ بازی کا سیشن لگے...... وہ دھند میں سے نمودار ہوئے۔ ذرا جھکے ہوئے تھکے ہوئے باندر ٹوپی پہنے ہوئے...... کبھی رک کر ایک گہرا سانس لیتے اور کبھی ٹوپی درست کرتے...... انہیں یوں دھند میں اپنی جانب چلتے ہوئے دیکھ کر چوہدری صاحب کہنے لگے "تارڑ صاحب ذرا غور فرمایئے کہ اس لمحے شیخ صاحب کیا لگ رہے ہیں؟"

میں نے غور فرما کر کہا۔ "بس شیخ صاحب ہی لگ رہے ہیں......"

"بابا لالٹین نہیں لگ رہے؟"

"کون سے بابا لالٹین؟"

"پرانی فلموں میں اکثر یہی منظر ہوتا تھا کہ ایک بوڑھا شخص اسی قسم کی ٹوپی اوڑھے پہاڑی علاقے کی رات میں لالٹین تھامے دھند میں سے نمودار ہوتا تھا قریب آ کر لالٹین اٹھا کر اس ہیرو کا چہرہ دیکھتا تھا جس کی کار اس ویرانے میں خراب ہو گئی ہے اور کہتا تھا "بابو جی میں ڈاک بنگلے کا چوکیدار ہوں...... تو شیخ صاحب وہی چوکیدار نہیں لگ رہے۔"

اور واقعی وہ لگ رہے تھے......

چنانچہ حاشیہ آرائیاں شروع ہو گئیں کہ اس کے بعد کیا ہوتا تھا......

"اس کے بعد یہ ہوتا تھا......" شاہ صاحب نے خلاف توقع غالب کا کوئی برموقع شعر پڑھنے کی بجائے ہنس کر کہا "بابا لالٹین بابو جی کو اپنے ساتھ ویران ڈاک بنگلے میں لے جاتا تھا جہاں اس کی چنچل اور اکلوتی نوجوان بیٹی ایک بکری کے بچے کو سینے سے لگائے ادھر ادھر زقندیں بھر رہی ہوتی تھی اور بوڑھا چوکیدار کہتا تھا "تمہارا بچپنا نہیں گیا لاڈو...... دیکھو تو سہی کون آیا ہے...... بابو جی آئے ہیں......"

"سٹوری مکمل کی جائے شاہ جی!" بیگ صاحب ہمفری بوگارٹ کے سٹائل میں مسکرائے......

"بس جی پھر تو...... عشق پر زور نہیں اور ہے یہ وہ آتش غالب۔" شاہ صاحب نے موقع غنیمت جان کر چچا غالب کا حوالہ دے دیا۔ "لیکن انجام یہ ہوتا ہے کہ ہیرو کو اس کا سخت گیر باپ شہر طلب کر لیتا ہے اور اس کی شادی کر دیتا ہے اور لاڈو جدائی کے گیت گانے لگتی ہے...... اگر انجام بہت ہی ٹریڈیجک ہو تو لاڈو اپنے چوکیدار باپ پر ایک ایسا انکشاف

کرتی ہے کہ وہ غریب صدمے سے فوت ہو جاتا ہے......"

اس دوران شیخ صاحب ہمارے پاس آ گئے اور ہمیں ہنستا دیکھ کر کہنے لگے۔ "اوئے تم تو جھلے لوگ ہو ٹریک پر دوڑتے رہتے ہو۔ اصل تازہ ہوا تو پارک کے اندر ہوتی ہے...... لیکن تم لوگ ہنس کیوں رہے ہو......"

اب ہم انہیں کیا بتاتے کہ ہم کیوں ہنس رہے تھے...... ہم ایک اچھے دوست کو گنوانا نہیں چاہتے تھے اور ان سے اپنی بے عزتی خراب نہیں کروانا چاہتے تھے۔ انہیں یہ نہیں بتانا چاہتے تھے کہ اب وہ.. شیخ صاحب نہیں.. بابا لالٹین ہیں۔

آج کل ڈراؤنی فلمیں کیوں نہیں بنتیں؟

ہمیں خیر سے بچپن سے ہی فلمیں دیکھنے کا شوق تھا......

ان دنوں فلمیں دیکھنے کا اسی لڑکے کو شوق ہوتا تھا جسے مار کھانے کا بھی شوق ہوتا تھا کہ یہ دونوں لازم و ملزوم ہوا کرتے تھے...... آپ چوری چھپے فلم دیکھ کر گھر لوٹے ہیں اور نہایت احتیاط سے دروازہ کھول کر اپنے بستر کی جانب بڑھ رہے ہیں تو ادھر سے ایک گرجدار آواز قبلہ والد صاحب کی آتی تھی کہ اوئے نالائق فلم دیکھ کر آیا ہے...... ذرا ادھر تو آ...... چنانچہ ہم نے اس معاملے میں ذرا منصوبہ بندی سے کام لینا شروع کر دیا کہ فلم صرف تین سے چھ والے شو میں دیکھی جائے اور بہتر یہ ہے کہ قریبی ریگل سینما میں دیکھی جائے اور جونہی انٹرول ہو آپ سینما ہال سے نکل کر بگٹٹ بھاگیں۔ پھر اپنے گھر تک کی باون سیڑھیاں چڑھ کر نہایت معصومیت سے گھر میں موجود افراد خاص طور پر والد اور والدہ صاحبہ کے آگے پیچھے پھرا جائے...... خواہ مخواہ لاڈ پیار کی باتیں کی جائیں اور پھر پورے دس منٹ بعد چپکے سے غائب...... سیڑھیاں اتر' دوڑ لگا' فلم کا دوسرا حصہ شروع ہونے کو ہے اور آپ پھر سینما ہال میں موجود......

اس منصوبہ بندی میں کبھی کبھی شدید گڑبڑ بھی ہو جاتی تھی کہ انٹرول کے وقت بھاگم بھاگ گھر پہنچے ہیں تو معلوم ہوا کہ بڑی پھوپھی جان گاؤں سے آئی ہوئی ہیں اور وہ آپ کو گلے سے لگا کر چومنا اور پیار دینا شروع کرتی ہیں کہ پندرہ منٹ اسی میں ضائع ہو جاتے ہیں اور پھر بھی ہاتھ تھامے رہتی ہیں کہ بیٹا میرے پاس بیٹھو اور سناؤ پڑھائی کا کیا حال ہے...... اور بیٹا اس لمحے پھوپھی جان کو قطعی طور پر پسند نہیں کر رہا کہ ان کو آج ہی اور اسی وقت آنا تھا جب کہ "لو پھر بہار آئی" کے دوسرے نصف میں ابھی جینا لولو برجیڈا کا

ڈانس باقی ہے جو اب ہم دیکھ نہ پائیں گے...... ظاہر ہے ہمیں جینا اپنی پھوپھی جان سے زیادہ پسند تھی......

عید بقر عید پر طے ہے کہ فلاں مشہور فلم دیکھنی ہے اور پہلے شو میں دیکھنی ہے اور دیکھنی بھی دس آنے کلاس میں بنچوں پر بیٹھ کر ہے...... چنانچہ عید کی نماز سے فارغ ہوتے ہی سینما گھر میں دس آنے والی کھڑکی کے سامنے جا کر جگہ سنبھال لی...... یہ وہ زمانے تھے جنہیں میں "معصومیت کا عہد" کہا کرتا ہوں...... فلمیں بھی معصوم تھیں...... شاعر اور ادیب کا نکما اور بیکار ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا...... سب سے بڑی عیاشی فلم دیکھنا اور اس کے بعد لکشمی چوک میں دال چاول کھا کر مولا بخش کا پان کلے میں دبا کر مال روڈ پر چہل قدمی کرنا ہوتا تھا...... اگر طبیعت شدید عیاشی پر مائل ہو گئی تو ایک سگریٹ سلگا لیا...... کسی لڑکی نے اگر اتفاق سے آپ پر نظر ڈال لی تو آپ فوراً مجنوں ہو گئے...... ساحر لدھیانوی کی "تلخیاں" سرہانے دھری ہیں...... اختر شیرانی کی "سلمیٰ" ہر جانب نظر آ رہی ہے...... پہروں خلا میں گھورتے رہتے ہیں' ہر فلمی گانا تیر کی طرح دل پہ لگتا ہے اور آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتی ہیں اور پورے محلے کو پتا چل جاتا ہے کہ بچے کو عشق ہو گیا ہے...... اور بچے کو مجال ہے پتا ہو کہ وہ کون تھی' اس کا نام کیا ہے اور رہتی کہاں ہے کیونکہ یہ تفصیلات ان دنوں کے عشق کے لیے قطعی غیر ضروری ہوتی تھیں۔

ہر نوجوان کو فلمی ہیرو بننے کا شوق ہوا کرتا تھا چاہے اس کے اپنے ماں' باپ بھی اس کی جانب کبھی کبھار ہی دیکھتے ہوں...... آہیں بھرتے ہوئے فلمی ڈائیلاگ بولنا نہایت پسندیدہ مشغلہ ہوتا تھا...... اب تو کیبل' ٹیلی ویژن نے فلموں کا ستیاناس کر دیا ہے...... درجنوں فلمیں بیک وقت چل رہی ہوتی ہیں اور آپ ریموٹ کا بٹن دباتے چلے جاتے ہیں...... ان پرانی فلموں کو دوبارہ دیکھتے ہیں تو نہایت بور اور سست لگتی ہیں اور احساس ہوتا ہے کہ ہم بھی کتنے احمق ہوا کرتے تھے کہ اس فلم کو بارہ مرتبہ دیکھا تھا۔

میں نے عرض کیا ناں کہ وہ "معصومیت کا عہد" ہوا کرتا تھا...... مجھے یاد ہے کہ جب ان زمانوں کی مشہور فلم "سیمسن اینڈ ڈیلائلہ" چل رہی تھی تو ایک دوست کے والد صاحب کو بھی شوق چرایا اور وہ اپنے برخوردار کو بھی ہمراہ لے گئے' شیر سے لڑائی وغیرہ تک تو

صورت حال قابو میں رہی لیکن جب سکرین پر ایک مختصر سا قابلِ اعتراض منظر آیا تو ہمارے دوست والد صاحب کی موجودگی میں اتنے شرمندہ ہوئے کہ بے ہوش ہو گئے..... ادھر والد صاحب بھی کئی روز تک برخوردار سے آنکھیں چراتے رہے اور اب تو یہ ہے کہ فلم کم چلتی ہے اور دیگر سرگرمیاں زیادہ چلتی ہیں اور پورا خاندان آنکھ جھپکے بغیر اکٹھے بیٹھ کر دیکھتا ہے اور کوئی بھی بے ہوش نہیں ہوتا..... اگر منظر حد سے بڑھ گیا تو زیادہ سے زیادہ والد صاحب اٹھ کر چلے گئے اور بچے ملاحظہ کرتے رہے.....

ان دنوں ''ہارر مووِیز'' یعنی ڈراؤنی فلموں کا بھی بڑا رواج تھا اور ان میں سرفہرست ''فرینکن سٹائن'' اور ''ڈریکولا'' تھیں۔ ''ڈریکولا'' میں اوّلین کردار بورس کارلوف نے ادا کیا تھا لیکن اسے لازوال شہرت کرسٹوفر لی نے دی..... اگرچہ یہ فلم صرف بالغوں کے لیے تھی لیکن بالغوں کی وہ فلم ہی کیا جسے بچے نہ دیکھیں چنانچہ ہم بھی دیکھ آئے..... گھر آتے ہی خوف سے بخار ہو گیا..... رات کو ہر جانب ڈریکولا کا سیاہ لبادہ نظر آنے لگا..... چنانچہ پناہ ملی تو امی جان کے بستر میں ملی..... ماں کی گود وہ واحد جگہ ہے جہاں دنیا کا کوئی ڈریکولا نہیں آ سکتا.....

میں پچھلے دنوں سوچ رہا تھا کہ اب ڈراؤنی فلموں کا رواج نہیں رہا..... شاید لوگ معصومیت کے عہد سے نکل آئے ہیں اور سیانے ہو گئے ہیں..... جانتے ہیں کہ یہ سب دکھاوا ہے..... کمپیوٹر کا کمال ہے..... یا لوگوں نے اتنا ڈراتنا ہارر اپنی زندگیوں میں دیکھ لیا ہے کہ ایسی فلمیں بننی بند ہو گئی ہیں۔

انہی دنوں مجھے اپنی اس الجھن کا جواب مل گیا کہ ڈراؤنی فلمیں کیوں نہیں بنتیں..... اب ذرا وہ مختلف مناظر ملاحظہ کیجیے جو ان دنوں ٹیلی ویژن اور اخباروں میں نظر آ رہے ہیں۔

مزار شریف کے قریب قلعہ جنگی کے کچے صحن میں سینکڑوں مسخ شدہ لاشیں ڈھول میں اٹی پڑی ہیں جن میں سے بیشتر کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں..... امریکہ کے بی-52 طیارے ان پر کلسٹر بم گرا کر گئے ہیں۔

ایک تصویر کو سال کی بہترین تصویر قرار دیا گیا ہے..... اس تصویر میں ایک چھوٹا سا افغان بچہ کفن میں لپیٹا ہوا قبر میں اتارا جا رہا ہے..... بچے کی پسلیاں کفن میں سے نظر

آ رہی ہیں کیونکہ وہ بھوک سے مرا ہے.....

ہندوستان کے شہر گجرات کے قریب ایک پورا گاؤں جل کر راکھ ہو چکا ہے اور اس کے باہر کچھ جلی ہوئی لاشیں پڑی ہیں جن میں بچے بھی شامل ہیں.....

کابل کے گندے نالے میں ایک پاکستانی کی لاش تیر رہی ہے.....

رملا اور غزہ کی شہری آبادی پر اسرائیلی راکٹوں اور میزائلوں کی بارش ہو رہی ہے جس میں صرف چالیس فلسطینی شہری ہلاک ہوئے ہیں جن میں بچے بھی شامل ہیں.....

اسرائیلی ٹینک کے گولے سے ہلاک ہونے والے ایک کار میں سوار پانچ بچے اور ان کی ماں کے مشترکہ جنازوں کی تصویر.....

اور یہ تصویری قبرستان دن رات دکھائی دیتا ہے..... شاید اسی لیے ڈراؤنی فلمیں بننی بند ہو گئی ہیں کہ اب ان زمانوں میں ان کی کوئی مارکیٹ نہیں، کوئی ڈیمانڈ نہیں.....

جب پبلک کو سچ مچ کی لاشیں دیکھنے کو مل رہی ہیں تو جھوٹ موٹ کے مُردے سینما میں جا کر کون دیکھے.....

جب ایک فلم رپورٹ میں ایک فلسطینی (اور یہ ایک اسرائیلی بھی ہو سکتا ہے) اپنے کسی پیارے کے بدن کے لوتھڑے اکٹھے کر رہا ہے تو عوام کو کیا ضرورت ہے کہ جیب سے پیسے خرچ کر کے ایسا کوئی منظر سکرین پر دیکھے۔

اور تو اور وہاں تو صرف ایک کاؤنٹ ڈریکولا تھا جو راتوں کو اپنے تابوت میں سے اٹھ کر لوگوں کا خون پی جاتا تھا..... کم از کم دن کو تو سویا رہتا تھا اور اب ایک نہیں کئی ڈریکولے ہیں جو نفیس سوٹوں میں ملبوس لوگوں کا خون پیتے ہیں..... اور دن رات کی بھی کوئی تخصیص نہیں رکھتے.....

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ ماں کی گود واحد جگہ ہے جہاں دنیا کا کوئی ڈریکولا نہیں آ سکتا۔ لیکن یہ تو معصومیت کے عہد کی بات تھی، ان دنوں کے ڈریکولے بچوں کو ماؤں کی گود میں سے بھی اٹھا لے جاتے ہیں اور انہیں لاشیں بنا دیتے ہیں.....

آپ بیوی کو زدوکوب کر سکتے ہیں.. ہمت مرداں..

کل مجھے زندگی کی ایک بہت بڑی خوشی ملی......
ایک عرصے کے بعد میں بے پایاں مسرت سے سرشار ہوا......
مجھے گمان تک نہ تھا کہ میری بے کیف زندگی میں اتنی بڑی خوشی بھی آئے گی......
میں سر اٹھا کر چل سکوں گا...... معزز ہو جاؤں گا......

میری اس خوشی کا سرچشمہ وہ مسرت انگیز خبر تھی کہ دبئی کی ایک عدالت کے قابل تعظیم جج صاحب نے فیصلہ دیا ہے کہ خاوند کو قانونی طور پر یہ حق حاصل ہے کہ اگر بیوی اس کا کہا نہ مانے تو وہ اسے بے دریغ زدوکوب کر سکتا ہے...... اگرچہ یہ فیصلہ تیس برس پہلے آ جانا چاہیے تھا جن دنوں ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی لیکن...... دیر آید درست آید...... میں نے اتنے برس بیگم کے سامنے سرنگوں ہو کر گزارے تھے...... اس کی ڈانٹ ڈپٹ سنی تھی اور میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک دن ایسا آئے گا جب مجھے قانونی طور پر اپنی بیگم کو چھینٹی لگانے کا حق مل جائے گا۔

ان دنوں عورتوں کے حقوق کا بڑا چرچا ہے کہ ان پر بہت ظلم ہو رہا ہے اور اس سلسلے میں مختلف اعداد و شمار پیش کیے جاتے ہیں اور بڑھا چڑھا کر پیش کیے جاتے ہیں تاکہ اعداد و شمار اکٹھے کرنے والی این جی اوز اُن کے سہارے غیر ملکی امداد حاصل کر سکیں...... میرا ہمیشہ سے یہ سٹینڈ رہا ہے کہ مردوں پر ہونے والے مظالم کے اعداد و شمار بھی اکٹھے کیے جائیں تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے لیکن میری کوئی سنتا ہی نہیں...... میں نے ایک بار ''انجمن مظلوم خاوندان'' کا ڈول ڈالا تھا اور جس خاوند سے بھی ممبر شپ کے لیے رابطہ کیا تھا' اس نے یہی کہا تھا کہ میں اپنی بیوی سے پوچھ کر بتاؤں گا...... اور ان میں سے

کسی نے بھی دوبارہ مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔ پتا نہیں ان پہ کیا گزری......

وہ کیسے روشن اور شاندار دن تھے جب خاص طور پر دیہات میں خاوند گھر لوٹتا تھا تو سب سے پہلے خواہ مخواہ بیوی کو زدوکوب کرتا تھا اور پھر پوچھتا تھا کہ بھلی لوک آج رات کے کھانے کے لیے کیا پکایا ہے...... اور میں گواہ ہوں کہ ایسی شادیاں کم از کم آج کی نسبت زیادہ کامیاب اور کامران ہوتی تھیں بلکہ جس روز خاوند محبت کے اس اظہار کو بھول جاتا تھا یا کام کاج سے اتنا تھکا ہوا گھر لوٹتا تھا کہ اس میں بیگم کو زدوکوب کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی تو بیوی کا بدن ٹوٹنے لگتا تھا کہ ہائے ہائے آج میرے سرتاج بوٹے خان کو پتا نہیں کیا ہوا ہے...... کہیں مجھ سے ناراض تو نہیں...... بلکہ ایک پرانے لوک گیت میں تو اس خواہش کا اظہار ملتا ہے کہ کب وہ میرا محبوب' میرا گھر والا آئے گا اور مجھے پیار سے چھینٹی لگائے گا......

لیکن یہ سنہری دن تمام ہوئے اور خاوندوں کے حقوق چھن گئے...... تعلیم زیادہ ہو گئی...... خواتین کی انجمنیں بن گئیں...... چھینٹی کے بجائے لاڈ پیار کے دوسرے فضول طریقے رائج ہونے لگے کہ بیگم تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تو میں برتن صاف کر دیتا ہوں...... گھر میں جھاڑو دے دیتا ہوں پھر تمہیں آؤٹنگ پر لے جاؤں گا اور برگر کھلاؤں گا...... اس قسم کے ناروا سلوک سے بیویاں بالکل چوڑ ہو گئیں اور اب یہ حالت ہے کہ مدتوں بعد کوئی ایسی خوشگوار خبر آتی ہے کہ خاوند نے بیوی کی پٹائی کی...... اور اس میں کہیں یہ درج نہیں ہوتا کہ اس سے پہلے بیوی نے خاوند کو زدوکوب کیا تھا جس کے نتیجے میں خاوند غریب نے صرف اپنے دفاع کی خاطر اسے صرف ایک جھانپڑ رسید کر دیا...... اب اسے نہیں تو بے انصافی کسے کہتے ہیں......

اس سلسلے میں' میں ایک درخشاں مثال پیش کروں گا اور میں آپ سے قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ مثال سو فیصد سچ پر مبنی ہے' محض کالم کو چٹپٹا بنانے کے لیے خود سے نہیں گھڑی...... پچھلے دنوں لاہور سے باہر جانے کا اتفاق ہوا تو ایک میاں بیوی مجھ سے ملنے آئے کہ وہ میرے پڑھنے والوں میں سے تھے اور میں ان کی خوشگوار ازدواجی زندگی سے بے حد متاثر ہوا...... بیگم جس پیار اور اُلفت سے اپنے خاوند کو دیکھتی تھیں' اس سے انسان حسد میں مبتلا ہو جاتا تھا اور ادھر خاوند بھی جیسی بیگم کی بلائیں لیتا تھا' اس کی تفصیل بیان نہیں کی جا سکتی۔

کھانے کے دوران وہ اپنے ہاتھوں سے ایک دوسرے کو کھلاتے رہے...... جب وہ رُخصت ہوگئے تو میرے میزبان نے میری حیرت کو بھانپتے ہوئے کہا کہ ''تارڑ صاحب میرے تمام جاننے والوں کی نسبت اس جوڑے کی زندگی مثالی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ کیوں......؟''

ظاہر ہے میں نے پوچھا کہ ''فرمائیں کیوں......؟''

تو وہ کہنے لگے۔ ''ہماری بھابی ہر ہفتے ہمارے دوست کی باقاعدگی سے ٹھکائی کرتی ہیں۔''

''نہیں......'' میں نے ہنستے ہوئے بے یقینی سے کہا۔

''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں...... سب لوگ جانتے ہیں کہ ایسا ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات کہیں نہ کہیں پٹی باندھے آتے ہیں اور بڑے فخر سے اعلان کرتے ہیں کہ دراصل آج بیگم کا دن تھا...... اور یقین کیجیے تارڑ صاحب کہ نہایت خوش وخرم زندگی گزار رہے ہیں بلکہ میرے یہ دوست اس بات پر نازاں رہتے ہیں کہ بیگم نے کبھی بھی بچوں کے سامنے ٹھکائی نہیں کی' ہمیشہ انہیں کہتی ہیں کہ بچو تم ذرا باہر جا کر کھیلو میں نے تمہارے ابو سے کوئی پرائیویٹ بات کرنی ہے...... اتنا خیال رکھتی ہیں۔''

ویسے میں نے تو اللہ کا شکر ادا کیا کہ میری بیگم چاہے کتنی بھی ظالم رہی ہوں' انہوں نے کبھی بھی مجھے زدوکوب نہیں کیا...... ہم اللہ تعالیٰ کی کن کن نعمتوں کا شکر ادا کریں...... کہا تو یہ جاتا ہے کہ ہر بڑے شخص کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے...... لیکن کہا یہ جانا چاہیے کہ ہر بڑے شخص کے پیچھے ایک عورت کا جھانپڑ ہوتا ہے کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ کم از کم ادب میں وہی لوگ کامیاب اور کامران ٹھہرے ہیں جن کی گھریلو زندگی نہایت تلخ تھی...... بیوی جھگڑالو تھی اور ہمہ وقت ڈانٹ ڈپٹ کرتی رہتی تھی بلکہ اکثر اوقات نادر مسودے بھی چولہے میں ڈال دیتی تھی...... اس کی واضح مثال ہماری چچی جان ہیں...... چچا غالب کی بیگم جن کے جوروستم کا تذکرہ وہ اکثر اپنے خطوط میں کرتے ہیں...... لیو ٹالسٹائی کی بیگم اتنی خوفناک تھیں کہ انہیں گھر سے نکال دیا اور بے چارے کاؤنٹ ٹالسٹائی کسی ریلوے سٹیشن کی بنچ پر بیٹھے بیٹھے اللہ کو پیارے ہوگئے۔

میرا ادبی تجربہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے اور اس نظریے کی روشنی میں جب اکثر بڑے

شاعروں اور ادیبوں کی بیگمات کا جائزہ لیتا ہوں تو ان میں جوروستم کو بدرجہ اتم پاتا ہوں...... میں بوجوہ ان کے نام نہیں لے سکتا...... کبھی خودنوشت لکھنے کا اتفاق ہوا تو تفصیل سے بیان کروں گا...... ایک بڑے شاعر جب کبھی اپنے گھر مدعو کرتے ہیں تو بیگم کے سامنے ان کی گھگھی بندھی ہوتی ہے۔ ایک اور بڑے نثرنگار کو میں نے بیوی کی موجودگی میں کبھی بھی بولتے نہیں دیکھا...... سر جھکا کر بیٹھے رہتے ہیں...... ادیبوں اور شاعروں کو جو دیر تک گھر سے باہر رہنے کی عادت ہوتی ہے تو اس کا باعث یہی نیک بیویاں ہوتی ہیں...... ویسے آپس کی بات ہے کہ اگر گھریلو زندگی بے حد خوشگوار ہو...... بیوی آپ پر نچھاور ہوتی رہے تو کون کمبخت ایسے التفات چھوڑ کر اپنی سٹڈی میں قید ہو کر بیٹھا رہے...... ناآسودگی نہ ہو تو شعر نازل ہو ہی نہیں سکتا...... گھر سے جھاڑ نہ پڑی ہو تو افسانہ ذہن میں آ ہی نہیں سکتا...... چنانچہ کسی حد تک ادیبوں اور شاعروں کو اپنی اس قسم کی بیویوں کا شکرگزار ہونا چاہیے...... ہماری ٹریجڈی یہ ہے کہ بیگم کے ظلم وستم کے باوجود ہم غالب اور ٹالسٹائی نہیں بن سکے۔

چنانچہ ان رُوح فرسا حالات میں جب میں نے یہ خبر پڑھی کہ دبئی کی ایک عدالت نے خاوندوں کو قانونی طور پر اختیار دے دیا ہے کہ وہ حسب منشا اپنی بیویوں کو زدوکوب کر سکتے ہیں تو خوشی سے دل باغ باغ ہوگیا اور میں نے اپنی بیگم کو بلایا...... یہ قانونی حق استعمال کرنے کے لیے نہیں بلکہ یونہی اس کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے تاکہ وہ جان جائے کہ میں قانونی طور پر اب کیا کر سکتا ہوں اور نہیں کرتا تو یہ میری مہربانی ہے...... بیگم نے یہ خبر سن کر کچھ کہا نہیں' صرف بڑے بیٹے کو آواز دی کہ بیٹا ذرا آؤ اور دیکھو کہ تمہارے ابو کیا کہہ رہے ہیں...... وہ آیا تو کہنے لگی۔ اب سناؤ یہ خبر...... آپ جانتے ہیں کہ اولاد جوان ہو جائے تو والدہ ہیروئن ہو جاتی ہے اور والد ولن...... میرا دماغ خراب تھا جو میں بیٹے کو یہ خبر سناتا اور پھر وہ دونوں مل کر مجھے پھینٹی لگا دیتے...... اس لیے میں نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بیٹے کو پیار کیا اور کہا...... بیٹے تم جاؤ اپنا کام کرو' امی تو یونہی مذاق کر رہی تھیں۔

یوں بھی دبئی کی عدالتوں کے فیصلے شاید پاکستان میں لاگو نہیں ہوتے...... کاش!

توند کے حق میں کچھ ناقابل تردید دلائل

یہ تقریباً تین چار ماہ پہلے کا قصہ ہے کہ میں ایک شام اپنے تئیں نہایت بن سنور کر اور سمارٹ ہو کر ایک ۔نیلے شلوار قمیص اور نیلے بلیزر میں ملبوس سرخ رومال لگا کر ایک فنکشن میں جانے کے لیے کمرے سے باہر آیا اور بیگم کو داد طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں بیگم کیسا لگ رہا ہوں؟''

مجال ہے بیگم نے آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا ہو اور بن دیکھے کہا۔ ''تم کبھی بھی کچھ بھی نہیں لگے تھے تو اس عمر میں جا کر اب تم نے کیا لگنا ہے۔''

میں تو جل بھن کر کوئلہ ہو گیا بلکہ نیلا پیلا ہو گیا۔ ''بس اب میری سمجھ میں آیا کہ مرد دوسری شادی کیوں کر لیتے ہیں۔''

''شکر ہے تمہیں سمجھ آ گئی ہے۔'' بیگم نے اب بھی میری جانب نگاہ نہ کی۔ ''تو کر لو دوسری شادی...... میری طرف سے اجازت ہے۔''

''اب جا کر اجازت دے رہی ہو جب چڑیاں چگ گئیں کھیت......''

''تو چڑیوں کو نہیں چگنے دینا تھا ناں کھیت...... میرے حصے میں تو آیا ہی کچھ نہیں۔''

بیگم سے آج تک تو میں جیت نہیں سکا تھا اس لیے بحث فضول تھی چنانچہ میں فوراً بھیگی بلی بن گیا اور نہایت لجاجت سے کہا۔ ''کم از کم ایک نظر تو دیکھ لو......''

اس نے پلکیں اٹھا کر مجھے ایک نظر دیکھا اور پھر سے ٹیلی ویژن دیکھنے لگی لیکن منہ سے کچھ نہ کہا۔

''ہاں تو پھر؟'' میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

''ہاں تو پھر کیا؟ تم نے کہا کہ مجھے ایک نظر تو دیکھ لو...... میں نے دیکھ لیا۔''

''پلیز کہہ دو کہ میں بے حد سمارٹ لگ رہا ہوں۔''

''مجھے اندھی سمجھتے ہو۔''

''ویسے ہی دل رکھنے کے لیے کہہ دو۔''

''میں جھوٹ بولنا گناہ سمجھتی ہوں۔ گناہ کی ترغیب دے رہے ہو؟ تمہیں پتا نہیں کہ میں اس برس حج کر کے آئی ہوں اور ایک حاجن سے کہہ رہے ہو کہ وہ جھوٹ بولے...... خدا کا خوف کرو۔''

''چلو مائی حاجن......'' میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''جھوٹ مت بولو...... سچ بول دو۔''

''سچ یہ ہے کہ تم نہایت بھدے اور بے ہودہ لگ رہے ہو اور میرا خیال ہے کہ تم نے قمیص تو اپنی پہنی ہے لیکن شلوار بیٹے کی پہن لی ہے۔''

میں نے نیچے نگاہ کی تو واقعی شلوار اتنی لمبی تھی کہ میرے بوٹ نظر نہیں آ رہے تھے شاید اسی لیے چلنے میں دشواری ہو رہی تھی کہ پائینچے بوٹوں پر سے گزرنے کے بعد بھی گھسٹ رہے تھے۔ میں نے نہایت تحمل سے اس مسئلے پر غور کیا کہ ایسا کیوں ہے۔ کیونکہ شلوار بیٹے کی نہیں میری اپنی تھی اور پھر مجھ پر انکشاف ہوا کہ یہ تو میری دن بہ دن ترقی پذیر توند کا کیا دھرا ہے...... کمر تو کب کی غائب ہو کر کمرے میں بدل چکی تھی اور وہاں شلوار ٹھہرتی نہیں تھی، کھسک کر نیچے ہو جاتی تھی۔ اسی لیے پچھلے کچھ عرصے سے میں اسے ایک ہاتھ سے تھام کر چلتا تھا کہ کہیں گر نہ جائے۔

میری وہ شام غارت ہو گئی۔ میری توند واقعی آپے سے باہر ہو چکی تھی۔ شدید ڈپریشن ہوا کہ اب کیا کروں۔ سیر بھی باقاعدگی سے کرتا تھا۔ پہاڑوں پر بھی باقاعدگی سے جا کر دھکے کھاتا تھا اور اس کے باوجود ایک ناہنجار توند کا مالک تھا۔ میں نے ہمیشہ توند والے حضرات کا مذاق اڑایا تھا اور اب مجھے اس کی سزا مل رہی تھی۔

قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا تو اس میں میری بجائے ایک کنگرو کھڑا تھا۔ جی ہاں وہی کنگرو جو آسٹریلیا میں پھدکتے پھرتے ہیں...... لیکن سوال یہ پیدا ہو رہا تھا کہ اس پاکستانی آئینے میں ایک کنگرو کہاں سے آ گیا۔ میں نے جب بہت ہی غور

سے عینک اتار کر اور پھر عینک پہن کر آئینے میں دیکھا تو معلوم ہوا کہ عکس تو میرا ہی ہے لیکن سراپا سراسر ایک کنگرو کا تھا اور اس کی وجہ میری توند تھی۔ لگ یہ رہا تھا کہ ایک کنگرو اپنی بدنی تھیلی میں اپنا بچہ سنبھالے کھڑا ہے...... ایک انسان کی اس سے بڑی تحقیر کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ایک معزز جانور لگنے کے بجائے ایک بے ہنگم کنگرو لگ رہا ہو۔

اور یہ سب کچھ میری بے جا محبّ الوطنی کی وجہ سے ہوا تھا۔ اچھا بھلا ایک زمانے میں سوٹ وغیرہ پہنتا تھا۔ پتلون قمیض پہنتا تھا اور پھر قومی لباس اپنانے کے شوق میں شلوار قمیص اور ویسٹ کوٹ پہننے لگا۔ پتلون کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ آپ کی کمر پر اگر ایک انچ بھی چربی آ جائے تو اس کے بٹن بند ہونے سے انکاری ہو جاتے ہیں اور آپ فوری طور پر اپنے موٹاپے کو کم کرنے کی جستجو میں جُت جاتے ہیں جبکہ شلوار قمیض کی سب سے بڑی برائی یہ ہوتی ہے کہ آپ بیشک ہاتھی ہوتے چلے جائیں' آپ کو احساس تک نہیں ہوتا جب تک کہ ازار بند کی لمبائی سے کمر کا گھیر نہ بڑھ جائے۔ پتلون پہننے میں آسانی بھی ہے کہ اگر وہ ڈھلکنے پر آ جائے تو انگریز بابوں کی طرح اس کے ساتھ گیلس باندھ کر کام چلایا جا سکتا ہے۔

لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں محبّ الوطن ہونے کے شوق میں کنگرو ہو چکا تھا۔ جب ڈپریشن بے حد بڑھ گیا تو میں نے اپنے آپ کو تسلی دینے کی خاطر توند کے فوائد پر غور کرنا شروع کر دیا بالکل اسی طرح جیسے ہمارے ایک مختصر قد کے دوست ہمیشہ سینہ پُھلا کر اعلان کرتے ہیں کہ نپولین بھی تو چھوٹے قد کا تھا' اس نے دنیا فتح کر لی اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اس کے بعد واٹرلو میں اس کا کیا حال ہوا تھا...... بلکہ کچھ ناہنجار حضرات تو اپنی قبیح عادتوں کے دفاع میں یہ بھی کہتے ہیں کہ جی سکندر اعظم کو بھی اسی قسم کی عادتیں لاحق تھیں۔

چنانچہ میں نے توند کے حق میں مختلف دلائل اکٹھے کر لیے۔ ایک تو یہ کہ میں اب آسانی سے کسی پاکستانی فلم کا ہیرو ہو سکتا تھا جس کی توند سکرین پر پہلے نمودار ہوتی ہے اور بعد میں وہ خود نمودار ہوتا ہے اور اپنی وِگ درست کرتا ہوا والدہ صاحبہ سے کہتا ہے کہ امی جان مبارک ہو میں بی اے کے امتحان میں پاس ہو گیا ہوں...... اگرچہ میں چرچل کا حوالہ بھی استعمال کر سکتا تھا جس کی توند اس کے سگار سے آگے نکلی ہوتی تھی لیکن چرچل کی مسلم دشمنی اور

ہندوستانیوں سے حقارت کے باعث اسے رد کر دیا۔ کہتے ہیں کہ مشہور تاریخ دان ''ڈیکلائن اینڈ فال آف رومن ایمپائر'' کا مصنف ایڈورڈ گبن اتنا موٹا تھا کہ اپنی محبوبہ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھا تا کہ اس سے شادی کی درخواست کر سکے تو بعد میں اس سے اٹھا نہ گیا اور محبوبہ نے بڑی مشکل سے اسے گھسیٹ گھساٹ کر کھڑا کیا۔ یہ تفصیل ہمیں کہیں نہیں ملتی کہ محبوبہ نے اس کی درخواست قبول کر لی تھی یا نہیں...... قبول ہی کر لی ہوگی نہیں تو وہ اسے سہارا دے کر اٹھاتی کیوں' وہیں پڑا رہنے دیتی۔

لیکن مجھے اس حوالے سے بھی تسلی نہ ہوئی کیونکہ بقول میری بیوی کے اب چڑیاں کھیت چُگ چکی تھیں۔ ایک اور شادی ہمارے نصیب میں کہاں ہو سکتی تھی۔ البتہ ایک ادیب ہونے کے ناتے توند کا ایک بہت بڑا فائدہ ہو سکتا تھا...... یعنی آپ لکھتے ہوئے جب ذرا دم لینے کے لیے رُکتے ہیں تو اپنا قلم اپنی توند پر رکھ سکتے ہیں جو بعد میں اِدھر اُدھر تلاش نہیں کرنا پڑتا فوری طور پر مل جاتا ہے۔

یہ تمام دلائل مجھے مکمل طور پر مطمئن نہ کر سکے اور میں اب تک ایک بے کیف اور مضمحل زندگی گزارتا رہا اور تب کل کے اخبار میں میں نے ایک ایسی خبر پڑھی جس نے مجھے مسرت سے سرشار کر دیا اور میں اپنی توند پر فخر کرنے لگا۔

خبر یہ تھی کہ ایک سرکاری اعلان کے مطابق پاکستان ایئر فورس کے افسران اور عملے کو خبردار کیا گیا ہے کہ ان میں سے بیشتر توندوں کے مالک ہیں یعنی ان کا وزن زیادہ ہے اور وہ فوری طور پر ڈائٹنگ یا ورزش کے ذریعے اپنا وزن مناسب حد تک گھٹا لیں اور اگر چھ ماہ کے اندر اندر انہوں نے ایسا نہ کیا اور ان کی توندیں برقرار رہیں تو ان کی ملازمت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اب ہمارے ذہن میں دکانداروں' مجھ ایسے بیٹھے رہنے والے ادیبوں اور پولیس والوں کی توندیں تو آ سکتی ہیں...... شاہین بچے موٹے ہو جائیں یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ بہرحال پاکستان ایئر فورس کا شکریہ کہ انہوں نے مجھے توندیلے ہونے کے ڈپریشن سے بچا لیا ہے...... اور اب میں اپنے وطن کے سجیلے جوانوں کے شانہ بشانہ اپنی توند پر فخر کر سکتا ہوں۔

میں دوبارہ نکاح پڑھوا رہا ہوں

میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں آئندہ واک کرنے کی بجائے سیر کیا کروں گا۔

جی ہاں میں بھی ایک عرصہ تک اسی غلط فہمی کا شکار رہا کہ واک کرنا اور سیر کرنا ایک ہی عمل کے دو مختلف نام ہیں۔ ایک انگریزی میں اور ایک اردو میں...... لیکن کل سویرے جب میں ایک طویل مدت کے بعد باغ جناح جا نکلا تو مجھ پر کھلا کہ میں تو لاعلمی میں مارا گیا ہوں اور پچھلے سولہ سترہ برس سے سیر نہیں کر رہا بلکہ واک ٹکر رہا ہوں اور یوں ایک اور نکاح سے محروم رہا ہوں...... اور اس لیے نہ صرف یہ کہ میں موٹا ہو چکا ہوں بلکہ چڑچڑا اور بدمزاج بھی ہو گیا ہوں...... جب پارک میں' میں روزانہ جاتا ہوں وہاں تو میں واک کرتا ہوں اور آج باغ جناح میں آیا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ ہر کوئی سیر کر رہا ہے۔

یہ باریک سا فرق مجھے اللہ بخشے ملک صاحب نے سمجھایا تھا...... ملک صاحب اندرونِ شہر کے باسی تھے' میرے اباجی کے عزیز دوست تھے۔ ہمیشہ تھری پیس سوٹ زیب تن کرتے تھے لیکن کوشش کے باوجود ''چوک'' کو ''چونک'' کہتے تھے اور ''سیر'' کو ''سَیل'' ہی بولتے تھے...... ملک صاحب نے ایک روز میرے بڑھتے ہوئے وزن کو تشویش کی نظروں سے دیکھا اور فرمانے لگے۔ ''برخوردار تم سَیل نہیں کرتے؟'' ظاہر ہے سَیل سے ان کی مراد سیر تھی اس لیے میں نے انہیں چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''چاچا جی آپ کا مطلب سیر سے ہے؟''

ناراض سے ہو گئے اور کہنے لگے۔ ''نہیں میرا مطلب سَیل سے ہے...... سیر اور چیز ہوتی ہے''۔ ''مثلاً وہ کیا چیز ہوتی ہے؟''

''مثلاً سیر تو صرف بے مقصد گھومنے پھرنے کو کہتے ہیں اور سَیل کرنے کا

مطلب ہے کہ اس کے ساتھ دنیا دیکھنا...... ہر شے سے لطف اندوز اور ذرا لاپروا ہو جانا تو تم سَیل نہیں کرتے؟''

''کرتا ہوں چاچا جی...... روزانہ کرتا ہوں...... ماڈل ٹاؤن پارک جا کر پانچ کلومیٹر کی واک کرتا ہوں۔''

''واک کرتے ہو؟'' وہ سر ہلا کر مایوسی سے بولے۔ ''تبھی...... اس کا مطلب ہے سَیل نہیں کرتے۔''

''چاچا جی میں نے عرض کیا ہے کہ میں روزانہ پانچ کلومیٹر واک کرتا ہوں تو وہ سَیل ہی تو ہوتی ہے۔''

''نہیں ہوتی...... واک اور چیز ہے اور سَیل اور چیز ہوتی ہے...... واک کرنے والے دل پر پتھر رکھ کر صبح بیدار ہوتے ہیں۔ اپنا وزن کرتے ہیں' پھر کسی ماڈرن پارک میں جا کر قیدیوں کی طرح مشقت کرنے لگتے ہیں...... نہ دیکھتے ہیں کہ درختوں کے پتے کس رنگ کے ہو رہے ہیں کیونکہ خزاں کا آغاز ہو رہا ہے...... نہ پارک کی دیوار سے ملحقہ کسی کوارٹر میں پکنے والے دیسی گھی کے پراٹھے کی خوشبو کو ناک اوپر کر کے ہوا میں سونگھتے ہیں اور نہ کسی سے دُعا سلام کرتے ہیں کہ ان کا سانس اکھڑنے کا خدشہ ہوتا ہے...... بس مارو مار کرتے چلے جاتے ہیں تو یہ واک ہوتی ہے......''

''اور سَیل کیا ہوتی ہے؟''

''سَیل کرنے والا صبح بیدار ہو جائے تو سَیل پر چلا جاتا ہے ورنہ سوتا رہتا ہے اپنے آپ پر جبر نہیں کرتا...... من کی موج کو مانتا ہے۔ گھڑی کی سوئیوں کا غلام نہیں ہوتا...... باغ میں جاتا ہے تو اگر پیدل چلنے کا موڈ نہ ہو تو قریبی بنچ پر بیٹھ کر اونگھتا رہتا ہے...... اور جب موڈ بن جائے تو یوں نہیں بھاگتا جیسے اس کے پیچھے پُلس لگی ہوئی ہے (ملک صاحب پولیس کو بھی ہمیشہ پُلس ہی کہتے تھے)۔ مزے مزے سے چلتا ہے...... دوسروں کا حال احوال پوچھتا ہے...... بچوں کو دیکھ کر رُک جاتا ہے اور انہیں پیار کرتا ہے...... اگر پھولوں کا موسم ہو تو انہیں قریب جا کر دیکھتا ہے۔ انہیں سونگھتا ہے اور پھر ان میں سے کسی ایک کو توڑ کر کان میں اڑس لیتا ہے...... سَیل کرتے ہوئے سنجیدہ بوتھی بنا کر نہیں چلتا بلکہ اکثر مسکراتا رہتا ہے...... اور

خوش وخرم رہتا ہے تم یقیناً روزانہ سَیل نہیں کرتے بلکہ واک کرتے ہو اسی لیے تمہاری صحت بہتر نہیں ہوتی...... میاں واک کو چھوڑو سَیل کیا کرو۔

کل سویرے باغ جناح میں مجھے ملک صاحب بہت یاد آئے کیونکہ وہاں بیشتر لوگ سَیل کر رہے تھے اور جس پارک میں، میں جاتا ہوں اس کی نسبت یہاں چہروں پر رونق تھی۔ لاپروائی تھی اور زندگی تھی...... مجھے ان کی عادت نہیں ہو رہی تھی کیونکہ میں واک کرنے والوں میں سے تھا...... ایک پرانے بنچ پر ایک نہایت گورے چٹے خوش نما پہلوان آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اور صرف دھوتی میں ملبوس بیٹھے تھے۔ کرتہ اتار کر گود میں رکھا ہوا تھا اور جسم کو ہوا لگوا رہے تھے کیونکہ حبس بہت تھا...... ہر چند لمحوں بعد اپنے کرتے سے پسینہ پونچھتے اور کہتے۔ ''بھئی آج تو بڑی نامانیم گرمی ہے۔''...... چوڑے چکلے تن و توش کی اندرون شہر سے آنے والی خواتین سَیل بھی کر رہی تھیں اور تازہ ترین سکینڈل بھی ڈسکس کر رہی تھیں...... بچے چڑی چھکا یعنی بیڈمنٹن کھیلنے میں مشغول تھے...... ایک صاحب سے عرصہ دراز بعد ملاقات ہوئی اور ان کے ہاتھ میں اب بھی پوٹلی تھی۔ جس میں پرندوں کے لیے ڈبل روٹی اور دال تھی...... وہ آج بھی درختوں کے ایک جھنڈ میں بیٹھے تھے اور بے شمار چڑیاں، ہدہد، بلبلیں اور کوّے ان کے گرد جمع تھے جیسے کسی دوست کو ملنے آئے ہوں...... یہ دوست ان کے لیے روزانہ خوراک لاتا تھا اور انہیں چگتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتا تھا اور یہی اس کی سَیل تھی...... لیکن سب سے دلچسپ شخصیت جس سے کل ملاقات ہوئی وہ ایک مولانا تھے...... درمیانی عمر کے یہ مولوی صاحب موٹے تازے اور پرخشونت نہ تھے بلکہ نہایت چست اور دانشمند تھے...... نزدیکی مسجد میں امام ہیں اور باقاعدگی سے سَیل کرنے آتے ہیں۔ دوران گفتگو یکدم کہنے لگے۔ ''تارڑ صاحب...... میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور یاد کیجئے گا...... بندہ آپ کا نکاح پڑھا سکتا ہے۔''

نکاح کے نام پر میرے دل میں فوری طور پر خوشی کے لڈو پھوٹے اور مسرت کی چند پھلجھڑیاں چھوٹیں لیکن فوراً ہی یاد آیا کہ یہ وقوعہ تو ایک عرصہ ہوا ہم پہ گزر چکا چنانچہ میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ''مولانا میں آپ کو غیر شادی شدہ نظر آتا ہوں؟''

کہنے لگے۔ ''میں جانتا ہوں کہ آپ شادی شدہ ہیں لیکن پھر بھی نکاح ہو سکتا ہے۔''

اس پر خوشی کے لڈو جو پھر پھوٹے تو پھوٹتے ہی چلے گئے کہ گویا ابھی گنجائش موجود ہے چنانچہ میں نے بظاہر لاپروائی سے کہا۔ ''جناب میری بیوی نہیں مانے گی۔''

کہنے لگے۔ ''مانے گی کیوں نہیں...... شرعی مسئلہ ہے۔''

''وہ مان گئی تو وہ کیسے مانے گی جس کے ساتھ آپ میرا نکاح کرنا چاہتے ہیں۔''

اس پر مولانا نے شرارت سے تبسم کیا اور کہنے لگے۔ ''حضرت یہ نکاح کسی اور خاتون سے نہیں ہوگا بلکہ آپ کی موجودہ بیوی کے ساتھ ہی ہوگا...... اور دھوم دھام سے ہوگا۔''

''لیکن نکاح پر اک نکاح اور سہی کیسے ہو سکتا ہے، قبلہ؟''

''بالکل ہو سکتا ہے...... آپ اگر تیار ہیں تو میں حاضر ہوں...... دراصل میں کچھ عرصہ پہلے جنوبی افریقہ کے دورے پر گیا اور وہاں جو مسلمان کمیونٹی ہے ان سے ملاقات ہوئی...... ان میں ایک کامیاب تاجر میرے بہت اچھے دوست بن گئے اور انہوں نے کہا کہ وہ اپنی شادی کی پچاسویں سالگرہ منا رہے ہیں اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ اس روز ان کی بیگم کے ساتھ دوبارہ ان کا نکاح پڑھوایا جائے......''

''کیا شرعی طور پر جائز ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل ہے...... اور میں نے اس سلسلے میں مختلف علماء سے بھی مشورہ کیا ہے اور دینی کتابوں کے حوالے بھی دیکھے ہیں...... اس میں کوئی حرج نہیں...... چنانچہ سالگرہ کے روز دونوں میاں بیوی دولہا دلہن کے روپ میں آئے اور میں نے ان کا نکاح پڑھا دیا۔ اب فرمائیں کہ بندہ آپ کے نکاح کے لیے کب حاضر ہو؟''

''مولانا کوئی اور سبیل ہوتی تو ہم یقیناً نکاح کے لیے مائل تھے لیکن اسی پرانی بیوی کے ساتھ پھر سے نکاح کروانے میں ہمارے لیے چنداں کشش نہیں ہے۔'' میں نے ان کی گفتگو سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

''بہرحال اگر کبھی ارادہ بدل جائے تو میں حاضر ہوں......''

اب ملاحظہ کیجئے کہ میں اتنا عرصہ واک کرتا رہا لیکن کسی نے رسماً بھی دریافت نہیں کیا کہ بھائی صاحب ایک اور نکاح کرواؤ گے...... اور صرف ایک دن سَیل کے لیے نکلا ہوں تو وہاں پیشکش ہو گئی...... تو جناب یہ ہوتا ہے واک کرنے اور سَیل کرنے میں فرق......

لیکن بدقسمتی سے اب میں دوبارہ سَیل نہیں کرسکوں گا...... میں نے مولانا سے ملاقات کا تذکرہ اپنی بیوی سے کیا تو وہ کہنے لگی کہ خبردار! جو آئندہ جناح باغ میں سَیل کرنے کے لیے گئے تو...... میں نے اسے بتایا بھی کہ پیشکش تمہارے ساتھ ہی نکاح دوبارہ پڑھوانے کی ہے لیکن وہ نہیں مانی اور کہنے لگی...... تمہارا کچھ پتا نہیں...... عین آخری لمحوں میں کچھ ادل بدل کر لو...... اس لیے تمہارا سَیل پر جانا بند...... کل سے سیدھی طرح واک پر جایا کرو۔

بچوں کے آنسوؤں کا رنگ ایک ہوتا ہے

ایک بچے کو سمجھاتے ہوئے ایک بزرگ نے کہا۔ ''تم تو اچھے بچے ہوناں!''

بچے نے فوراً نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ''نہیں میں اچھا بچہ نہیں ہوں۔''

اس بزرگ نے حیران ہو کر سوال کیا۔ ''لیکن کیوں؟''

تو بچہ بولا۔ ''اس لیے کہ بچے دو ہی اچھے ہوتے ہیں اور میں اپنے والدین کا تیسرا بچہ ہوں...... چنانچہ میں اچھا بچہ نہیں ہوں۔''

اور یہ حقیقت ہے کہ سارے بچے اچھے بچے نہیں ہوتے۔ اگر وہ بچہ تیسرا ہو یا یہ کہہ لیجیے کہ تیسری دنیا کا ہو تو وہ بالکل ہی اچھا نہیں ہوتا۔

یہ تیسری دنیا محض جغرافیائی ہی نہیں' معاشرتی اور طبقاتی بھی ہے۔

ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے ٹاورز دراصل بابل کے وہ مینار تھے جو زمین بوس ہوئے تو ان کے بعد امریکہ وہ نہ رہا جو گیارہ ستمبر سے پہلے تھا...... اس غیر متوقع بربادی نے وہاں کے لوگوں کی سائیکی ہی بدل کر رکھ دی...... اور یہ ایک قدرتی عمل ہے کیونکہ گھر میں اگر موت ہو جائے تو پورے خاندان کی سائیکی بدل جاتی ہے چہ جائیکہ سات ہزار کے قریب لوگ لقمۂ اجل بن جائیں...... وہاں سے طرح طرح کی خبریں آ رہی ہیں...... ایک اطلاع کے مطابق تقریباً پچاس فیصد امریکی یہ چاہتے ہیں کہ تمام کے تمام چودہ لاکھ امریکی عربوں کو...... چاہے وہ مسلمان ہوں' عیسائی ہوں یا یہودی ان سب کو کیمپوں میں منتقل کر دیا جانا چاہیے کہ وہ خطرناک ہیں...... ایئر لائن پائلٹ مسافروں میں کسی ایک عربی شکل کے مسافر کو دیکھ کر نروس ہو جاتے ہیں اور اس کو اپنے ہمراہ لے جانے سے انکار کر دیتے ہیں بلکہ ایسے دو مسافروں کو دیکھ کر پائلٹ کاک پٹ سے ہنگامی طور پر ایک رسّے کی مدد سے اتر کر ایئر پورٹ کی جانب بھاگ گئے کہ ہمیں ان سے ڈر

آتا ہے...... شکاگو کے ایک انڈر گراؤنڈ سٹیشن میں چند لوگوں نے شکایت کی کہ ان کا دم گھٹ رہا ہے اور آنکھیں جل رہی ہیں تو اسے دہشت پسندوں کی جانب سے کیمیائی حملہ سمجھا گیا اور سٹیشن کو فوری طور پر خالی کروالیا گیا...... ان مسافروں کو جب طبی امداد کے لیے ہسپتال لے جایا گیا تو وہ بالکل نارمل تھے اور صرف نفسیاتی طور پر سمجھنے لگے تھے کہ کیمیائی حملہ ہوگیا ہے......

لیکن میں تو بچوں کی بات کر رہا تھا...... کچھ بچے اچھے ہوتے ہیں اور تیسرے یا تیسری دنیا کے بچے اچھے نہیں ہوتے......

امریکہ سے ہی آنے والی ایک اور خبر کے مطابق ٹریڈ سنٹر ٹاورز کے تباہ ہونے کی وجہ سے جہاں بڑے متاثر ہوئے ہیں وہاں بچوں کی سائیکی پر بھی بہت برا اثر پڑا ہے کیونکہ جب وہ نیویارک کی سکائی لائن کو دیکھتے ہیں تو اس میں جو سب سے بلند دو عمارتیں' دو ٹاور تھے وہ غائب ہوتے ہیں ان کی جگہ ایک خلا نظر آتا ہے تو وہ بہت اپ سیٹ ہوتے ہیں۔ بہت پریشان ہوتے ہیں اور ان کی سائیکی پر بہت مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں یہاں تک کہ کئی بچوں کو ''کونسلنگ'' کی ضرورت پڑ گئی ہے اور نفسیات دان ان کا علاج کر رہے ہیں۔

یہ اچھے بچے ہیں جو اپنے ایک شہر کی دو عمارتوں کے منہدم ہو جانے سے اپ سیٹ ہو جاتے ہیں۔

جو بچے اچھے نہیں ہوتے وہ بالکل اپ سیٹ نہیں ہوتے...... نفسیاتی طور پر بالکل متاثر نہیں ہوتے کیونکہ ان کی سرے سے کوئی نفسیات ہی نہیں ہوتی اس لیے کہ وہ تیسرے ہوتے ہیں۔

میں اس قسم کے بے شمار بچوں کو جانتا ہوں۔

ان میں سے ایک بچے کا پورا وطن ہی غائب ہوگیا ہے...... ابھی چند لمحے پیشتر اس کا ایک چھوٹا سا گھر تھا جس میں اس کے کھلونے تھے' کتابیں تھیں اور مستقبل تھا...... اخبار میں اس کی تصویر چھپی تھی کہ وہ اس گھر کے ملبے پر بیٹھا ہے اور رو رہا ہے کیونکہ اسرائیلی فوج کے بلڈوزروں نے ایک گھر کو مسمار کر دیا ہے...... اس کی ماں ملبے میں سے کچھ تلاش کر رہی ہے۔ آج کے بعد اس کے سر پر کوئی چھت نہ ہوگی اس کی روٹی کے لیے کوئی چولہا نہیں جلے گا لیکن اس بچے کی نفسیات کو کچھ بھی نہیں ہوگا کیونکہ یہ اچھا بچہ نہیں ہے۔

ایک اور بچہ ہے نہایت ہی پیاری شکل والا لیکن وہ اس لمحے اپنے باپ کے ساتھ ایک

دیوار کی اوٹ میں دُبکا ہوا ہے اور سامنے اسرائیلی فوجی آٹومیٹک اسلحے سے آگ برساتے آرہے ہیں اور یہ بچہ بھی خوف کے مارے رو رہا ہے...... یہ تصویر اترنے کے چند لمحے بعد وہ گولیوں کی بوچھاڑ سے ہلاک ہو جاتا ہے...... اس کی یہ تصویر اور بعد میں ہلاک ہو جانے والی تصویریں اخباروں میں چھپتی ہیں...... چونکہ یہ مر گیا تھا اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ جب اسرائیلی گولیاں' جو امریکہ سے آئی تھیں اس کے بدن میں داخل ہوئیں تو اس کی سائیکی پر کیا اثر ہوا تھا۔

ایک بارہ سالہ بچہ ایسا بھی دیکھا تھا جس کے ماتھے میں ایک سوراخ تھا...... اس کے باپ نے اپنے بچے کے بدن کو دوسروں کے لیے وقف کر دیا تھا اور ان کا کہنا تھا کہ بے شک میرے بچے کے بدن کا کوئی حصہ کسی اسرائیلی بچے کے کام آجائے مجھے اعتراض نہیں' کیونکہ سب بچے اچھے ہوتے ہیں۔

میں اس قسم کے ہزاروں بچوں کو جانتا ہوں...... ابھی کل میں نے سی این این پر اپنی جانب بڑھتی اسرائیلی آرمرڈ کاروں پر غلیلیں چلاتے چند بچے دیکھے تھے...... اور کل ہی چار فلسطینیوں کے مارے جانے کی خبر آئی تھی اور اس کے ساتھ ہی شیرون کا بیان آیا تھا کہ یہ لوگ ہماری فوج پر حملہ آور ہو رہے تھے اس لیے مار دیئے گئے اور فلسطینی جنگ بندی کے معاہدے پر عمل نہیں کر رہے...... یاد رہے کہ اس جنگ بندی کی خلاف ورزی کرنے پر کوئی اسرائیلی ہلاک نہیں ہوا تھا۔

اپنے بچوں کو خبردار کرنے کے لیے فلسطینی علاقے میں دیواروں پر پوسٹر لگے ہوئے ہیں ان میں ایک اسرائیلی فوجی بچوں پر فائر کر رہا ہے اور لکھا ہے ''یہ بچوں کو مار ڈالنے والے لوگ ہیں' ان سے بچیں۔''

بیروت کے صابرہ اور شتیلہ فلسطینی کیمپوں پر جب شیرون نے حملہ کروایا تھا تو عورتوں کے علاوہ سینکڑوں بچے ہلاک ہوگئے تھے۔

مجھے وہ سنہری بالوں والی بچی بھی یاد ہے جسے اسرائیلیوں نے ہلاک کیا اور اس کی لاش کئی ماہ بعد جب کھیتوں میں ملی تو اس کے سنہری بالوں میں سے گندم کے سنہری خوشے جھانک رہے تھے۔

یہ فہرست بہت طویل ہے...... ہزاروں سے بڑھ کر لاکھوں تک پہنچتی ہے اور

چونکہ یہ سب غیر تہذیب یافتہ دنیا کے تھے اس لیے ان کی سائیکی پر کچھ اثر نہیں ہوا تھا...... سائیکی صرف تہذیب یافتہ دنیا کے اچھے بچے کی ہوتی ہے......

میں یہاں بغداد میں بمباری کے دوران ہلاک ہو جانے والوں اور خوراک اور دوائیوں کی کمی کے باعث مر جانے والے ہزاروں عراقی بچوں کی بات نہیں کروں گا کہ اس میں وہاں کے لیڈروں کا بھی قصور تھا۔

صرف ایک اور بچی کا ذکر کر دوں...... آپ نے بھی وہ تصویر دیکھی ہوگی...... امریکی نیپام بموں سے جلتے ہوئے ایک پورے جنگل اور گاؤں میں سے بھاگتی ہوئی ایک چھوٹی سی بچی ہے۔ اس کے فاقہ زدہ بدن پر کوئی کپڑا نہیں اور وہ چیختی اور روتی ہوئی آگ میں جلتے اس گاؤں سے باہر آ رہی ہے جس میں اس کے ماں باپ اور بھائی بہن جل کر کوئلہ ہو چکے ہیں...... اس بچی کی بھی کوئی سائیکی نہیں ہوگی کیونکہ وہ اچھی بچی نہیں تھی...... اگلے روز ایک امریکی چینل پر ایک "مذہبی" پروگرام ہو رہا تھا جس میں ایک نہایت مزاحیہ طبیعت کا پادری کہہ رہا تھا کہ اسرائیل ہمارا چھوٹا بھائی ہے اور بائبل میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں لارڈ ایک ایسا خطّہ عنایت کرے گا جس میں دودھ اور شہد ہوگا اور سمندر ہوگا چنانچہ اسرائیل تو حضرت ابراہیمؑ کے دعوے کے مطابق خدا کی جانب سے عطیہ ہے...... اور اس کی مخالفت کرنے والے خدا کے باغی ہیں اور انہیں ملیامیٹ کر دینا چاہیے...... اگرچہ ایک اور مذہبی پروگرام میں' میں نے ایک پادری کو صلح اور امن کا درس دیتے ہوئے بھی سنا...... یہاں تک کہ دہشت پسندوں کو بھی معاف کر دینے کے بارے میں بھی سنا...... لیکن اس نیک دل شخص کی باتیں ان دنوں کون سنتا ہے......

مجھے دنیا بھر کے بچے اچھے لگتے ہیں...... ٹریڈ سنٹر میں جن بچوں کے باپ اور مائیں مر گئی ہیں ان کے لیے جو دکھ محسوس کرتا ہوں وہ بیان نہیں کر سکتا...... میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ٹریڈ سنٹر کے سانحہ میں کوئی بچہ ہلاک نہیں ہوا۔

بچہ چاہے کسی بھی نسل کا' کسی بھی رنگ کا ہو اس کے آنسوؤں کا رنگ ایک ہی ہوتا ہے۔

بچے...... سب کے سب اچھے ہوتے ہیں۔

تالیاں بجانے والی باجیاں..

سیانے کہتے ہیں کہ تحریر میں تنوع ہونا چاہیے۔ ورائٹی ہونی چاہیے تاکہ پڑھنے والوں کی دلچسپی برقرار رہے' اس لیے میری تحریر میں انسانوں کے علاوہ مگرمچھ' گدھے' مرغیاں' لگڑ بگڑ وغیرہ عام ملتے ہیں۔ لیکن میرے ساتھ ٹریجڈی یہ ہوتی ہے کہ میں کالم گدھوں کے بارے میں لکھتا ہوں اور اکثر دوست اور سیاستدان مجھ سے خفا ہو جاتے ہیں...... ادھر انسانوں کے بارے میں کچھ لکھتا ہوں تو اُلو مائنڈ کر جاتے ہیں۔ چنانچہ آج میں ایک محفوظ راستہ اختیار کر رہا ہوں یعنی میرے کالم میں نہ مرد ہیں اور نہ عورتیں اور نہ جانور بلکہ ایک اور جنس ہے......

یہ جنس تالیاں بہت بجاتی ہے۔

ویسے تو ہم سب تالیاں بہت بجاتے ہیں...... ٹیلی ویژن کے میزبان حضرات کا بھی بنیادی کام یہی ہوتا ہے کہ کسی بھی اُوٹ پٹانگ اور احمق شخصیت کو سٹیج پر بلاتے ہوئے عوام سے کہا جائے کہ خواتین و حضرات زوردار تالیوں سے استقبال کیا جائے' بلکہ بعض اوقات تو نہایت سوگوار پروگراموں کے دوران بھی نہایت منجھے ہوئے میزبان لوگوں سے درخواست کرتے ہیں کہ خواتین و حضرات اب سٹیج پر وہ شخصیت تشریف لا رہی ہیں جن کا پورا گھر اور خاندان آگ لگنے سے راکھ ہو گیا تھا ان کے لیے بہت ساری تالیاں۔

لیکن ہم لوگ...... یعنی خواتین و حضرات عام طور پر بات کرنے کے بعد تالیاں بجاتے ہیں اور میں جس جنس کی بات کر رہا ہوں وہ تالی بجانے کے بعد بات کا آغاز کرتی ہے۔ بلکہ دوران گفتگو بھی تالی بجا کر اور وہ بھی ایک خاص لے میں تالی بجا کر مخاطب کی توجہ حاصل کرتی ہے...... آپ سیانے ہیں یقیناً سمجھ گئے ہوں گے کہ میں کس جنس کی بات کر رہا

ہوں۔ اگر نہیں سمجھے تو آپ بھی تالی بجائیے......

بدقسمتی سے میں اس جنس کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتا کیونکہ میرے ملنے والوں میں بظاہر تو اس جنس سے تعلق رکھنے والا کوئی نہیں ہے' اندر کے بھید تو خدا جانتا ہے...... میں اس جنس کے بارے میں لکھنے پر یوں ملتفت ہوا کہ نارنگ منڈی میں ایک وقوعے کی خبر پڑھ بیٹھا اور اس سے انسپائر ہو گیا...... خبر میں بتایا گیا ہے کہ وہاں ایک نوجوان کی شادی کسی حسین دوشیزہ سے ہو گئی...... شادی کی پہلی شب جب دولہا میاں حجلۂ عروسی میں داخل ہوئے...... دلہن کا گھونگھٹ اٹھایا تو اسے نہایت خوبصورت پا کر تالیاں بجانے لگے اور کہنے لگے...... ہائے ہائے تم کتنی حسین ہو...... اللہ جی میں کیا کروں آپ کتنی خوبصورت ہیں...... ہائے میں مرجاؤں صدقے واری تم کتنی حسین ہو...... اب بظاہر تو یہ معمول کا ردِ عمل لگتا ہے کہ اگر شادی کی رات دلہن حسین نکل آئے تو آپ خوشی کا اظہار کریں لیکن یہاں خوشی کے اس اظہار کے لیے دولہا میاں تالی پہلے بجاتے تھے اور پھر ہائے ہائے میں مرجاؤں سے بات کا آغاز کرتے تھے اور تالی بھی ایک مخصوص لے میں بجاتے تھے...... ویسے بات اگر یہیں تک رہتی تو بھی خیریت رہتی لیکن خبر میں بتایا گیا کہ دولہا میاں ساری رات دلہن کو دیکھ دیکھ کر تالیاں بجاتے رہے اور صبح کر دی...... چنانچہ اگلے روز جب دلہن اپنے ماں باپ کے گھر گئی تو اس نے سسرال واپس جانے سے انکار کر دیا اور کسی سہیلی کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ اب یہاں تک بھی معاملات اتنے دگرگوں نہیں تھے کہ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں...... تو بس ہو گیا...... لیکن دولہا کے والدین نے یہ موقف اختیار کیا کہ دراصل ہمارے بیٹے میں قطعی طور پر کوئی گڑبڑ نہیں' صرف یہ ہے کہ ہیجڑوں کی صحبت میں بہت بیٹھا تھا اس لیے اسے یوں تالیاں بجانے کی عادت ہو گئی ہے ورنہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے...... لیکن بدقسمتی سے ان کا یہ استدلال قبول نہ کیا گیا اور علیحدگی ہو گئی۔

یہ تیسری جنس ہمارے بچپن میں تو بہت عام ہوتی تھی اور بیاہ شادی اور پیدائش کے موقعوں پر ان کے دل پذیر رقص اور سریلے گانے خوشیوں میں اضافے کا موجب بنتے تھے...... لیکن اُن دنوں آسانی یہ تھی کہ ہر کوئی جانتا تھا کہ فلاں محلے میں ہیجڑے رہتے ہیں اور ان کے نام یہ ہیں...... بلکہ ان میں کئی بہت ہی دانا اور سنجیدہ ہیجڑے ہوتے تھے جو ناچنے

گانے سے گریز کرتے تھے اور ان کا بزرگوں کی طرح احترام کیا جاتا تھا...... یہ رشتے کروانے میں بھی معاون ثابت ہوتے تھے...... پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا توں توں ہیجڑے کم ہوتے ہوتے غائب ہو گئے۔ اب یہ یا تو ٹیلی ویژن سکرین پر نظر آتے ہیں...... نہیں نہیں آپ غلط سمجھ رہے ہیں' میں ٹی وی کے ستاروں کی بات نہیں کر رہا بلکہ ٹیلی ویژن کے ان ڈراموں کی بات کر رہا ہوں جن میں سے ایک میں محمود اسلم بطور ''ریما'' بہت ہٹ ہوئے تھے اور پھر ڈراموں اور سٹیج پر ہیجڑوں کی قطاریں لگ گئی تھیں...... معین اختر نے بھی اسی نوعیت کا کردار ادا کر کے اپنے آپ کو مشکوک کر لیا تھا...... تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہیجڑے کہاں گئے...... وہ یقیناً پیدا تو ہوتے ہوں گے لیکن اب نظر کیوں نہیں آتے...... شاید وہ ہم میں کچھ اس طرح گھل مل گئے ہیں جس طرح عید بقرعید پر حکمران عوام میں گھل مل جاتے ہیں اور کچھ پتا نہیں چلتا کہ کون' کون ہے...... کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جب بھی حکومت تبدیل ہوتی ہے تو نئے حکمرانوں کو سب سے پہلے خوش آمدید کہنے والے اسی نوعیت کے ہوتے ہیں کیونکہ وہ بھی تالیاں بجاتے ہوئے کہیں سے نمودار ہوتے ہیں کہ آہا جی آپ آ گئے اب تو ملک کی قسمت سنور جائے گی' ہائے اللہ آپ کتنے حسین ہیں...... چند برس پیشتر ایک نہایت افسوسناک واقعہ ظہور پذیر ہوا تھا۔ ہمارے ایک جاننے والے خشکی کے راستے چین کے شہر کاشغر گئے تو اکثر چینیوں نے اور کاشغری حضرات نے ان سے ملتے ہوئے کہا کہ اچھا آپ ہیجڑے ہیں...... وہ صاحب بے حد برہم ہوئے کہ بال بچے دار تھے اور انہیں کس بیہودہ خطاب سے نوازا جا رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ ان دنوں کچھ لوگ ہیجڑوں کو ہمراہ لے جاتے تھے اور کاشغر کے بازاروں میں کلچرل شو منعقد کر کے پیسہ اکٹھے کرتے تھے۔ چنانچہ وہ یہی سمجھنے لگے کہ ادھر سے آنے والوں کا نام یہی ہے۔

پچھلے برس جب میں شمالی علاقہ جات سے واپس آ رہا تھا تو ہم مانسہرہ سے باہر ایک چھپر ہوٹل میں ناشتے کے لیے رُکے۔ ہوٹل کے مالک ایک نہایت سنجیدہ قسم کے بزرگ تھے اور ہمیں ان کے پراٹھے بہت پسند آئے...... روانگی سے پیشتر کہنے لگے۔ تارڑ صاحب آپ تو دانشور ہیں تو میرا ایک مسئلہ حل کر دیجئے۔ میں نے کہا بزرگو اگر میں دانشور ہوتا تو اپنے مسئلے حل نہ کر لیتا یا کسی حکومتی ادارے کا سربراہ نہ ہوتا۔ بہرحال فرمائیں آپ ٹیلی

ویژن پر اداکاری کرنا چاہتے ہیں؟ ہنس کر بولے نہیں مسئلہ بہت سنجیدہ ہے۔ یہاں جو دانا لوگ ہیں ان سے بھی رابطہ کیا ہے لیکن کوئی خاطر خواہ جواب نہیں ملا اور مسئلہ یہ ہے کہ اگر ایک ہیجڑا مر جائے تو کیا اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور اگر پڑھی جائے گی تو وہ مرد کی ہوگی یا عورت کی...... میری تو ہنسی گم ہوگئی اور کچھ رنج بھی ہوا کہ بزرگ کس مسئلے میں الجھے ہوئے ہیں چنانچہ میں نے مذاق سے پوچھا کہ بزرگو آپ کے عزیز و اقارب میں کوئی ایسے حضرات ہیں جن کی وفات کے بعد آپ کو یہ مسئلہ درپیش ہوگا تو آپ ابھی سے تیاری کرنا چاہتے ہیں...... اس پر وہ ناراض ہو کر بولے کہ تارڑ صاحب میں بے حد سنجیدہ ہوں' یہ مسئلہ حل ہونا چاہیے کہ اس سلسلے میں کیا حکم ہے...... ظاہر ہے میں نے تو اپنی کم علمی کا اقرار کر لیا اب اگر کسی صاحب کو اس مسئلے کے بارے میں کچھ علم ہے تو مانسہرہ جا کر ان بزرگوں کی مشکل حل کر دیں...... اور اگر وہ صاحب میرا یہ مسئلہ بھی حل کر دیں کہ اب ہیجڑے نظر کیوں نہیں آتے...... کہاں گئے ہیں تو میں بھی شکر گزار ہوں گا...... ویسے میں نے کچھ اندازے لگائے ہیں جو غلط بھی ثابت ہو سکتے ہیں کہ یہ کہاں گئے...... ہمارے ٹیلی ویژن پر بھی چند ایک ایسی ہستیاں ہیں جنہیں جانے کیوں ''باجیاں'' کہا جاتا ہے...... یقیناً سیاست دانوں اور ادیبوں اور صحافیوں وغیرہ میں بھی اسی قسم کی باجیاں ہوں گی۔ اکثر مشہور گلوکاراؤں اور اداکاراؤں کے ہمراہ بھی اسی قسم کے کردار ہوتے ہیں کہ جب وہ میک اپ کروا کے میک اپ روم سے باہر آتی ہیں تو وہ تالی بجا کر کہتے ہیں۔ ہائے اللہ جی آپ کتنی حسین ہیں۔

بہر حال میرا مشورہ تو یہی ہے کہ آپ اپنے آس پاس ذرا غور سے دیکھئے...... دوستوں وغیرہ پر کڑی نظر رکھئے' خاص طور پر جس انداز میں وہ تالی بجاتے ہیں کیونکہ وہ ہم میں ہی گھل مل گئے ہیں۔

قتل قتل کو جنم دیتا ہے.. ہمیشہ انصاف کے نام پر..

اس کالم کی اشاعت تک مجھے یقین ہے کہ صورت حال تبدیل ہو چکی ہوگی' جو ہونا ہے وہ ہو چکا ہوگا...... یا ہونے والا ہوگا لیکن اس کے باوجود میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ کو کچھ سنجیدہ اور کچھ غیر سنجیدہ کہانیاں سناؤں۔ اگر ان کہانیوں کا تعلق موجودہ صورت حال سے جا ملا تو یہ محض ایک اتفاق ہوگا۔

کہا جاتا ہے کہ کسی گاؤں سے ایک پیشہ ور' جسے ہم کمی کمین کہتے ہیں' اگرچہ ہم اسلام کے پیروکار ہونے کے ناتے ذات پات پر قطعی طور پر یقین نہیں رکھتے...... تلاش روزگار کے سلسلے میں دبئی چلا گیا اور وہاں چند برس محنت مزدوری کر کے کم از کم اپنے گاؤں کے سٹینڈرڈ سے متمول ہو گیا۔ گاؤں واپس آیا تو سب سے پہلے چوہدری کے گھر کے عین سامنے ایک شاندار حویلی تعمیر کی...... پانچ چھ ملازم رکھے...... دو تین کاریں پورچ میں کھڑی کیں اور گاؤں کی فلاح و بہبود میں مصروف ہو گیا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا...... بلکہ فوجی حکومت کا کرنا کیا ہوا کہ ملک میں الیکشنوں کا اعلان ہو گیا۔ کئی پشتوں سے چوہدری کا خاندان ہی الیکشن میں کھڑا ہوتا تھا لیکن اس بار اس کمی کمین کے حواریوں اور بہی خواہوں نے کہا کہ دیکھو تم کیا چوہدری سے کمتر ہو...... تمہاری حویلی اس سے بڑی ہے۔ کاروں میں گھومتے ہو۔ گاؤں کے لوگ بھی تمہیں پسند کرتے ہیں۔ تم الیکشن لڑو اور چوہدری کے خلاف کھڑے ہو جاؤ۔ تجویز معقول تھی' وہ الیکشن میں کھڑا ہو گیا۔ چوہدری کو خبر ہوئی تو اس نے اسے بلا بھیجا کہ آؤ میرے ساتھ مذاکرات کرو۔ وہ کمی کمین اپنے بہی خواہوں کے ہمراہ چوہدری کے گھر پہنچا جہاں اس سے درخواست کی گئی کہ آپ اپنے ساتھیوں کو باہر ہی چھوڑ جائیں کیونکہ چوہدری صاحب آپ سے ون ٹو ون ملاقات کرنا چاہتے ہیں...... چنانچہ وہ اپنی پگڑی

سنبھالتا چوہدری کی بیٹھک میں داخل ہوا۔ چوہدری نے نہایت احترام سے پوچھا کہ تم الیکشن لڑنا چاہتے ہو میرے خلاف...... کمی کمین نے کہا۔ جی چوہدری بالکل تمہارے خلاف الیکشن لڑوں گا۔ اس پر چوہدری نے اپنے بہی خواہوں کو اشارہ کیا جنہوں نے کمی کمین کو خوب زدوکوب کیا۔ چوہدری نے پھر پوچھا اب بتاؤ الیکشن لڑو گے۔ کمی کمین نے زمین پر گری ہوئی پگڑی اٹھائی اور ہاتھ باندھ کر کہنے لگا۔ نہیں مائی باپ میری توبہ...... آپ واقعی سپر پاور ہیں۔ میری یہ مجال کہ آپ کی مرضی کے خلاف جاؤں...... لیکن میں بھی عزت دار شخص ہوں۔ آپ نے لوگوں کو یہی کہنا ہے کہ ہم دونوں کے مذاکرات ہوئے تھے جن کے نتیجے میں میں نے اپنی مرضی سے الیکشن نہ لڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔ چوہدری نے کہا بے شک ایسا ہی ہوگا۔ کمی کمین باہر آیا تو بہی خواہوں نے پوچھا کہ مذاکرات کا کیا نتیجہ نکلا ہے تو کمی کمین نے کہا کہ مذاکرات کامیاب رہے ہیں۔ انہوں نے بھی میری ایک بات مان لی اور میں نے بھی کھلے دل سے ان کی ایک بات مان لی۔ بہی خواہوں نے پوچھا کہ مثلاً؟ کمی کمین کہنے لگا کہ چوہدری نے درخواست کی تھی کہ الیکشن نہ لڑو میں مان گیا اور میں نے چوہدری سے یہ کہا تھا کہ وعدہ کرو آئندہ تم مجھے زدوکوب نہیں کرو گے۔ وہ بھی مان گیا۔

اس کہانی سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا اور یہ محض اتفاق ہے کہ امریکہ چھوٹے ممالک کے ساتھ گفت وشنید کر رہا ہے اور کچھ مطالبات وہ مان لے گا اور کچھ ظاہر ہے چھوٹے ممالک بھی مان لیں گے۔

کہا جاتا ہے کہ ترک سلطان بایزید قسطنطنیہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا اور قریب تھا کہ رومی عیسائی ہتھیار ڈال دیتے کہ اسے امیر تیمور کی افواج کی آمد کی خبر ملی۔ اسے مجبوراً قسطنطنیہ کا محاصرہ اٹھانا پڑا اور وہ انگورا یعنی موجودہ انقرہ کی قربت میں جا پہنچا اور امیر تیمور کی افواج کے سامنے صف آرا ہوا۔ اگرچہ بہادری سے مقابلہ کیا لیکن بری طرح شکست کھا گیا۔ فوج تباہ ہوگئی۔ سلطنت چھن گئی لیکن جب تیمور کے سامنے پیش ہوا تو ایک سلطان کی طرح اس کے مقابل جا کھڑا ہوا۔ پروقار اور شاندار انداز میں۔ اس نے تیمور سے برابری کی سطح پر بات کی۔ یہاں تاریخ دان ایڈورڈ گبنز اس ملاقات کو بیان کرتے ہوئے ایک فقرہ لکھتا ہے۔ "بایزید اپنی شکست کو بھول گیا لیکن...... اپنی عزت نفس کو یاد رکھا۔"

گیارہ ستمبر کے بعد اگر دنیا کو "تہذیب یافتہ" اور "غیر تہذیب یافتہ" میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور غریب ممالک "غریب تہذیب یافتہ" دنیا میں شامل کر دیئے گئے ہیں لیکن اس کے باوجود غریب ممالک اپنی کمزوری اور غربت بھول کر...... اپنی عزت نفس کو تو یاد رکھ سکتے تھے۔

ہسپانوی ناول نگار سروانٹس کے مشہور ناول "ڈان کے خوتے" کا مرکزی کردار اپنے گھوڑے روزی نانتے اور ایک ٹٹو پر سوار اپنے نائب سانچو کے ہمراہ بہادری کے کارنامے دکھانے کے لیے گھر سے نکلتا ہے اور اپنے دہشت پسند دشمنوں کا قلع قمع کر دینا چاہتا ہے۔ اگرچہ وہ نہیں جانتا کہ وہ دشمن کون ہیں...... کبھی کسی وادی میں بھیڑوں کے گلے کے چلنے سے جو دھول اٹھتی ہے اسے اپنا دشمن جان کر اس پر حملہ آور ہو جاتا ہے اور کبھی دور سے ہوائی چکیوں کو گھومتے دیکھ کر انہیں اپنی تہذیب کی بلائیں سمجھ کر ان پر حملہ کر دیتا ہے اور ہوا میں نیزے چلاتا رہتا ہے۔

اس کہانی سے بھی کچھ ثابت نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ...... اپنے گھر سے نکلنے سے پیشتر کم از کم دشمن کا تعین تو کر لیا جائے۔ اعلان جنگ کرنے سے پہلے پتا تو ہو کہ مجرم کون ہے...... یا پھر کہہ دیا جائے کہ ہمیں صرف دس بارہ ہزار لاشیں اور بربادی درکار ہے۔ وہ کسی کی بھی ہو۔

میں ہمیشہ سے امریکہ کا بے حد معترف رہا ہوں۔ میں امریکہ گیا نہیں لیکن پاکستان اور یورپ میں بے شمار امریکیوں سے ملا ضرور ہوں اور یہ میرا تجربہ ہے کہ وہ یورپی لوگوں کی نسبت زیادہ فراخ دل اور دوست لوگ ہوتے ہیں۔ میں امریکہ کا اس لیے بھی معترف ہوں کہ یہ دنیا کا واحد ملک ہے جہاں تقریباً ہر کوئی جا سکتا ہے اور قسمت آزما سکتا ہے۔ رزق تلاش کر سکتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتا ہے اور وہ وہاں اجنبی نہیں ہوتا کہ پورے ملک کی بنیاد ہی تارکین وطن ہیں۔ ایسے شاندار ملک کو قائم رہنا چاہیے۔ پاکستان کے شہروں میں شاید ہی کوئی خاندان ہو جس کا کوئی نہ کوئی فرد امریکہ میں نہ ہو...... اور یہی بات دنیا کے دیگر ملکوں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ اس لیے امریکہ ایسا ملک ہونا چاہیے جس سے پوری دنیا محبت کرتی ہو...... اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اس کی وجوہات کیا

ہوسکتی ہیں۔ امریکہ میں جو تباہی ہوئی ہے وہ کسی طور قابل ستائش نہیں۔ دہشت گردی کہیں بھی ہو نا قابل برداشت ہے اور مجھے دکھ ہے اور ہمدردی ہے ان تمام لوگوں سے جن کے عزیز اور پیارے نیویارک اور واشنگٹن میں مارے گئے۔ امریکیوں کا غصہ سمجھ میں آتا ہے۔ ذرا ایسی ہی ہولناک صورت حال کو پاکستان میں رونما ہوتے ہوئے تصور میں لائیے تو کیا ہم غصے میں نہیں آئیں گے...... لیکن امریکی حکام کچھ زیادہ غصے میں ہیں۔ انہیں ٹریڈ سنٹر اور پنٹاگون میں ہونے والے جانی نقصان کے بدلے میں کچھ لاشیں درکار ہیں۔ چاہے وہ کسی بھی قوم کی ہوں اور چاہے وہ قوم اس جرم میں ملوث ہو یا نہ ہو...... امریکہ میں مقیم مسلمان اور پاکستانی ان کا ٹارگٹ ہیں۔ ایک پاکستانی کو قتل بھی کر دیا گیا ہے۔ میرے ایک دوست کی بیٹی جو فلوریڈا میں ڈاکٹر ہے' پچھلے ایک ہفتے سے اپنے اپارٹمنٹ میں سے نہیں نکلی اور اس کے ہاں خوراک کا ذخیرہ ختم ہو رہا ہے۔ حجاب نوچے جا رہے ہیں اور مسجدوں پر حملے جاری ہیں اور یہ خبریں امریکی میڈیا بالکل سامنے نہیں لا رہا۔

مجھے لاشیں پسند نہیں ہیں...... چاہے وہ امریکیوں کی ہوں' اسرائیلیوں کی ہوں یا فلسطینیوں کی......

اور ایک ایرانی کہاوت...... ایک اور کہانی...... کسی گاؤں میں ایک نہایت طاقتور پہلوان رہتا تھا جس کی دہشت پورے علاقے میں تھی۔ اس کے سامنے کوئی دم نہیں مار سکتا تھا۔ پہلوان ہر صبح اپنے گھر سے باہر آتا...... اور گاؤں کے ایک غریب اور لاغر شخص کو زدوکوب کرتا' ٹھڈے مارتا اور پھر پوچھتا کہ بول اس پورے علاقے میں سب سے طاقتور اور ناقابل تسخیر شخص کون ہے اور وہ لاغر شخص ہاتھ باندھ کر کہتا حضور آپ ہیں۔ آپ سے زیادہ طاقتور اور کوئی نہیں۔ یہ سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا۔ ایک روز لاغر شخص نے اپنے آپ پر لعن طعن کی کہ میری بھی کیا زندگی ہے۔ روز مار کھاتا ہوں' منت کرتا ہوں اور ہاتھ جوڑ کر اس پہلوان کو "طاقتور" مانتا ہوں تو یہ کیا زندگی ہے۔ میں طاقت میں اس کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا لیکن یہ تو کر سکتا ہوں کہ اسے پہلوان ماننے سے انکار کر دوں۔ چنانچہ اگلی صبح جب پہلوان نے اسے پھر مارا اور پوچھا کہ بتا اس علاقے میں سب سے طاقتور شخص کون ہے تو لاغر شخص نے کہا۔ تم نہیں ہو۔ میں تمہیں پہلوان نہیں مانتا۔ اس پر پہلوان آگ بگولہ ہو گیا

اور اسے اتنا مارا کہ وہ مر گیا...... لیکن ہوا یہ کہ لاغر شخص کی موت کے بعد گاؤں کے دوسرے لوگوں نے بھی اس سے ڈرنا چھوڑ دیا اور اس پہلوان کے دل میں شک کی ایک کونپل پھوٹی کہ اگر ایک لاغر شخص میری طاقت کے آگے نہیں جھکا تو شاید میں اتنا طاقتور نہیں ہوں...... اور اس شک کی کونپل نے اسے مسمار کر دیا۔

شک کی کونپل پھوٹ چکی ہے...... اور یہ اب مسلی نہیں جا سکتی۔

اور آخر میں شیکسپیئر کا ایک حوالہ۔ "قتل' قتل کو جنم دیتا ہے...... تاریخ کے آخر تک اور ہمیشہ انصاف کے نام پر......"

نوٹ:۔ افغانستان پر امریکی حملے سے قبل لکھا گیا۔

جان صاحب کا باورچی اور جنٹلمین بسم اللہ..

مجھے زوروں کی بھوک لگی تھی اور میں نہایت پراشتیاق ہو کر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا انگلیاں چٹخا رہا تھا اور کھانے کا انتظار کر رہا تھا' باورچی خانے سے برتنوں اور چمچوں کی ملی جلی آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں...... میں منتظر تھا کہ کب میری پسندیدہ دال ماش اور مکھن سے چپڑی ہوئی روٹیاں میز پر آئیں اور میں ان پر پل پڑوں کہ آج صبح میں نے اپنی بیگم سے اسی خوراک کی فرمائش کی تھی...... جب باورچی خانے سے تادیر صرف برتنوں اور چمچوں کے کھڑکنے کی آوازیں ہی آتی رہیں اور کھانا نہ آیا تو میں نے بیتاب ہو کر بیگم کو پکارا۔ ''بھئی اب آ بھی چکو...... بھوک سے نڈھال ہو رہا ہوں۔''

''ایک تو تم میں صبر نہیں ہے۔'' اس کی غصیلی آواز آئی۔ ''اگر ایک وقت کا کھانا نہ بھی کھاؤ تو قیامت تو نہیں ٹوٹ پڑے گی...... آ رہی ہوں۔''

میری بیگم اگرچہ کھانا تو نہایت عمدہ بناتی ہے لیکن اپنی پسند کا بناتی ہے...... اگر کہوں کہ آج تھوڑا سا گوشت بھون لو تو یقیناً اس روز دال ہی بنائے گی' اگر دال کی فرمائش کروں تو آلو شوربہ پکا کر سامنے رکھ دے گی...... لیکن آج اس نے کمال مہربانی سے میری درخواست قبول کر لی تھی اور دال ماش بنانے پر آمادہ ہو گئی تھی...... بالآخر وہ باورچی خانے سے برآمد ہوئی اور ایک بڑی پلیٹ' جو خوراک سے لبریز تھی' میرے سامنے رکھ دی...... یہ جو کچھ بھی تھا بہر طور دال ماش نہیں تھی اور نہ ہی دُور دُور تک مجھے مکھن سے چپڑی روٹیاں نظر آ رہی تھیں...... ''یہ کیا ہے؟'' میں نے غصے سے کہا۔

''مجھے کیا پتا کیا ہے......'' اس نے بے رُخی سے جواب دیا۔ ''چکھ کر دیکھ لو کہ کیا ہے''۔

''لیکن وہ میری دال ماش کیا ہوئی......'' میں نے دہائی دی۔ ''بیگم تم نے وعدہ کیا

تھا''۔ ''ایک تو تم چٹورے بہت ہو...... جو ملتا ہے' اس پر شکر نہیں کرتے...... کھا کر تو دیکھو بہت مزیدار ہے''۔ اب اس پلیٹ میں جو کچھ بھی تھا' اس کی صورت شکل سے قطعی طور پر پتا نہیں چلتا تھا کہ اسے کیسے کھایا جا سکتا ہے...... کیا روٹی کے ساتھ کھانا ہے' چھری کانٹے کے ساتھ نوش کرنا ہے...... بہر حال میں نے پہلے جھک کر اسے سونگھا تو اس میں سے جو ہڑوں پر جمی ہوئی کائی کی عجیب سی مہک آ رہی تھی اور جب چکھا تو یقین ہو گیا کہ کائی ہی ہے...... اس میں کچھ سویاں تھیں...... گاجریں اور پیاز تھے...... شاید گوشت کے کچھ قتلے بھی تھے...... دو چار نوالے نگلنے کے بعد میں نے بیگم پر نظر ڈالی تو وہ مزے سے اخبار کا مطالعہ کرنے میں مگن تھی۔ ''تم کیوں نہیں کھاتیں؟''

''لو میرا دماغ خراب ہے جو یہ بدبلا کھاؤں۔'' اس نے ناک چڑھا کر کہا۔

''تو پھر تم نے یہ بدبلا پکایا کیوں ہے؟''

''میں نے تو نہیں پکایا...... جان صاحب کے گھر سے آیا ہے' ان کا ملازم کہہ رہا تھا کہ تارڑ صاحب کے لیے ہے' اسے کھا کر جان صاحب کو اطلاع کریں کہ یہ کیسا ہے۔''

میں فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ جان صاحب نے ایک اور باورچی رکھ لیا ہے۔''

جان صاحب ہمارے محلے میں رہتے ہیں اور نہایت عمدہ ذوق وشوق رکھتے ہیں...... ذوق رکھتے ہیں انواع واقسام کے کھانوں کا اور شوق ہے گھوڑے رکھنے کا...... ایک زمانے میں گھر میں جو کچھ پکتا تھا' میری طرح صبر شکر کر کے کھا لیا کرتے تھے...... پھر ایک روز پلاؤ کی دیگ پکانے کے لیے ان کا ملازم کہیں سے شاہی باورچی کو لے آیا...... جان صاحب کو اس کا پلاؤ پسند آ گیا اور اسے ہمہ وقتی ملازم رکھ لیا...... شاہی باورچی سے پوچھا جاتا کہ تم شاہی کیوں ہو تو وہ کہتا صاحب میرے آباواجداد مغل شہنشاہوں کے لیے پلاؤ پکایا کرتے تھے اور انہیں اس کے عوض جاگیروں سے نوازا گیا...... ان جاگیروں کے نام بھی تاریخ میں ان کھانوں کے حوالے سے مشہور ہیں جو میرے دادا کے پردادا کے بھی دادا جان پکایا کرتے تھے...... ان میں پلاؤ جاگیر اور کوفتہ شاہی جاگیر مشہور زمانہ تھیں...... اب یہ وقت آن پڑا ہے کہ ہم فٹ پاتھوں پر بیٹھ کر انتظار کرتے ہیں کہ کوئی آئے اور ہم سے شاہی

دیگ پکوائے...... جان صاحب نے پورے تین ماہ اس باورچی کو اپنے پاس ملازم رکھا اور پھر جواب دے دیا کیونکہ وہ روزانہ مسلسل تین ماہ صرف پلاؤ کھا کھا کر عاجز آ گئے تھے...... شاہی باورچی کو کہتے کہ میاں کچھ اور بھی بناؤ تو وہ کہتا جان صاحب ہم کوئی ہوٹلوں کے خانسامے وغیرہ تو نہیں ہیں کہ جو جی میں آیا' بناتے رہے...... ہم تو صرف پلاؤ کے ماہر ہیں...... صرف اتنا کر سکتا ہوں اور وہ بھی صرف آپ کے لیے کہ گوشت مختلف قسم کا ڈال دوں یا کبھی مٹر پلاؤ تیار کر لوں...... چنانچہ شاہی باورچی کی چھٹی ہو گئی...... کچھ عرصے بعد اسے فٹ پاتھ پر حجامتیں بناتے ہوئے دیکھا گیا' جہاں وہ شاہی ہیئر کٹنگ سیلون کا بورڈ لگائے بیٹھا تھا۔

کچھ عرصہ تو جان صاحب نے گھریلو خوراک پر گزارہ کیا پھر شکایت کرنے لگے کہ یہ آج کل کے بچے لوگ کو جانے کیا ہوا ہے...... گھر کے کھانے سے دُور بھاگتے ہیں اور باہر جا کر برگر' سینڈوچ اور جانے کیا کیا اوٹ پٹانگ خوراکیں کھاتے ہیں...... روزانہ سینکڑوں روپوں کا خرچا ہو جاتا ہے چنانچہ انہوں نے مناسب جانا کہ ایک ایسا باورچی ملازم رکھا جائے جو یہ اشیائے خوردنی گھر میں ہی بنا لے تاکہ بچے باہر نہ جائیں اور اخراجات میں بھی کمی واقع ہو جائے...... البتہ یہ باورچی اپنے آپ کو شیف کہلوانا پسند کرتا تھا...... بچے بدستور باہر جا کر ہی کھاتے رہے کیونکہ ان کا بنیادی مقصد اپنے والد کی ڈانٹ ڈپٹ سے دُور ہو کر کسی غیر ملکی ریستوران میں دوستوں یاروں سے گپ لگانا ہوتا تھا...... چنانچہ یہ شیف صاحب اب جان صاحب کے لیے طرح طرح کے یورپی کھانے پکانے لگے...... لیکن اس سے پیشتر انہوں نے ایسے کھانے تخلیق کرنے کی غرض سے سینکڑوں قسم کے درآمدی ساس' چٹنیاں' پنیر اور ٹین بند زیتون وغیرہ خریدے بلکہ بیشمار مناسب برتن بھی حاصل کیے گئے...... ان اخراجات پر بیس ہزار سے زائد رقم اٹھ گئی...... شیف نے جب پہلا یورپی کھانا پکایا تو جان صاحب نے فوراً بہ نفس نفیس حاضر ہو کر میری خدمت میں پیش کر دیا...... کہنے لگے کہ شیف کہتا ہے کہ یہ فرانسیسیوں کا مرغوب کھانا ہے اور بولے ڈی لا کیو ہے...... آپ نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے' ظاہر ہے صرف پانی تو نہیں پیا ہوگا' پہلے کھانا بھی کھایا ہوگا تو آپ ذرا کھا کر بتایئے کہ کیسا ہے...... میں ان کی اس نوازش کا ازحد شکر گزار ہوا اور پھر وہ

کھانا کھایا...... کچھ پتا نہ چلا کہ کیا ہے...... اس دوران جان صاحب میرے سامنے بیٹھے مجھے غور سے دیکھتے رہے...... پوچھنے لگے۔ ''جی تو کیسا ہے؟''

''جان صاحب غور کرنے کے لیے کچھ مدت دیجیے...... یکدم پتا نہیں چل رہا۔''

اس پر جان صاحب جانے کیوں خوش ہو گئے اور بولے۔ ''چلیے جی ذائقہ جیسا بھی ہے' ایک بات کی تسلی ہو گئی ہے۔''

''کس بات کی؟'' میں نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

''بس اسی بات کی کہ اس کے کھانے سے کم از کم بندہ مرتا تو نہیں ہے۔''

یعنی موصوف مجھے تجرباتی جانور کے طور پر استعمال کر رہے تھے اور اسی لیے کھانے کے دوران مجھے غور سے دیکھ رہے تھے کہ کیا اس خوراک کے کھانے سے میں جاں بحق ہوتا ہوں یا نہیں...... غصہ تو مجھے بہت آیا لیکن ضبط کر گیا کہ اتنے عرصے سے محلے داری ہے اور محبت کرنے والے شخص ہیں...... اب میری روٹین یہ ہو گئی کہ جب کبھی جان صاحب کی جانب سے کوئی نئی ڈش آتی تو سب سے پہلے اپنے ڈوگی کی خدمت میں پیش کرتا...... اگر وہ رغبت سے کھا کر زندہ بھی رہتا تو میں بھی چند نوالے لے کر جان صاحب کو اطلاع کر دیتا کہ خوراک مضر صحت نہیں ہے...... لیکن آج میں بے خبری میں مارا گیا تھا...... میرا خیال تھا کہ بیگم نے دال ماش کی بجائے کچھ اور پکا دیا ہے...... ورنہ کبھی ہاتھ نہ لگاتا...... بہرحال فوراً ہاتھ کھینچ لیا اور جان صاحب کو فون کیا...... انہوں نے فوراً پوچھا کہ آپ خود میرا بھیجا ہوا کھانا کھا رہے ہیں یا ابھی کھانا ہے...... جب میں نے اطلاع کی کہ کھا چکا ہوں تو نہایت خوش ہوئے کہ اچھا اب میں بھی چکھ کر دیکھوں گا...... یہ بھی معلوم ہوا کہ نیا باورچی چینی کھانے بنانے کا ماہر ہے اور یہ جو کچھ بنایا گیا' چین کے منگ خاندان کے شہنشاہ دیوار چین بنانے والے مزدوروں کو کھلایا کرتے تھے...... دیوار چین کی تعمیر کے دوران لاکھوں مزدور ہلاک ہوئے اور انہیں اسی دیوار میں چن دیا گیا تھا...... اغلباً یہ مزدور اسی کھانے کے بعد فوت ہوئے تھے...... بہرحال قسمت اچھی تھی' میں بچ گیا ورنہ مجھے گھر والے دیوار چین تک کیسے لے جاتے...... یہ چینی کھانے بنانے والا باورچی تقریباً تین ماہ اپنے کمالات دکھاتا رہا اور اس کی برکت سے میں بھی طرح طرح کے مخدوش چینی سوپ وغیرہ نوش کرتا

رہا...... پھر جان صاحب حسب معمول اس کے کھانوں سے اکتا گئے اور ایک روز جب وہ بازار سے لایا ہوا گوشت تو خود بھون کر کھا رہا تھا اور بلی کے لیے حاصل کردہ چھیچھڑوں سے تنگ ٹانگ سوپ تیار کر رہا تھا تو جان صاحب نے اسے فارغ کر دیا...... البتہ اس باورچی تاریخ میں میرے لیے جو نسبتاً سنہری زمانہ آیا' وہ لاہوری باورچی تھا جو سری پائے' گردہ' چانپ' بٹیرے' نہاری' چکڑ چھولے اور قیمے والے نان وغیرہ بنانے کا ماہر تھا...... جان صاحب حسب روایت پہلا کھانا مجھے ہی روانہ کرتے اگرچہ ان خوراکوں کے ایک مرتبہ کھانے سے بندہ ہلاک نہیں ہوتا...... لیکن ان کے مسلسل اور روزانہ استعمال سے کچھ عجیب سے نتائج برآمد ہونے لگے...... جان صاحب انہیں کھانے سے ست ہوتے چلے گئے' ان کا وزن بڑھ گیا' بلڈ پریشر بھی اسی حساب سے زیادہ ہو گیا...... کاروباری میٹنگوں میں اونگھتے رہتے' بھنا ہوا مغز کھاتے کھاتے اپنے دماغ کے جو چند ایک خلیے تھے' انہیں بھی برباد کر بیٹھے اور ہمہ وقت کچھ نہ کچھ ہڑپ کرتے رہتے اور کچھ نہ کرتے تو پیڑوں کی لسی ہی چڑھاتے رہتے' اس کے نتیجے میں کاروبار ٹھپ ہو گیا...... بینکوں کا قرضہ سر پر چڑھ گیا...... سنگی ساتھی ساتھ چھوڑنے لگے کہ جان صاحب ہمیں بھی لے ڈوبیں گے...... پھر یہ ہوا کہ لاہوری باورچی نے کوئی ایسا پنگا لے لیا جس میں کوئی جہاز آگے پیچھے ہو گئے اور وہ جیل یاترا پر چلا گیا...... ان دنوں صورت حال نسبتاً پرسکون ہے کیونکہ لاہوری باورچی کی جگہ ایک اور باورچی آ گیا ہے...... یہ نہ چینی کھانے بناتا ہے نہ یورپی اور نہ ہی لاہوری' کیونکہ ان پر خرچا بہت اٹھتا ہے اور گھریلو معیشت کو دھچکا پہنچتا ہے...... خود بھی فی الحال نہایت کفایت شعار ہے...... نہایت سادہ خوراک بناتا ہے...... اکثر اوقات دال پکاتا ہے اور جان صاحب کے سامنے رکھ کر کہتا ہے "جنٹلمین، بسم اللہ......"

تمہارے پاس چلّو بھر پانی ہے؟

"عامل......"

"معمول......"

"جو پوچھے گا' بتلائے گا؟"

"یار ہر بار یہی بے ہودہ سوال پوچھتے ہو کہ جو پوچھے گا بتلائے گا...... کیا میں نے کبھی انکار کیا ہے؟ وقت ضائع مت کرو اور جو پوچھنا ہے' پوچھو......"

"آئی ایم سوری...... لیکن ہزاروں برسوں سے یہی روٹین چلی آ رہی ہے...... آئندہ احتیاط کروں گا۔"

"ہاں تو داغ دو سوال......"

"یہ بتاؤ کہ قلندر نے کون سی بات کی تھی جو پانی پانی کر گئی تھی؟"

"کون سے قلندر نے......؟"

"کسی بھی قلندر نے......"

"میں اتنا عالم فاضل ہوتا تو یہاں فٹ پاتھ پر چادر اوڑھے تمہارے اوٹ پٹانگ سوالوں کا جواب دے رہا ہوتا...... کوئی بہتر کام نہ کرتا...... کم از کم ناظم کے الیکشن کے لیے کھڑا ہو جاتا کہ وہاں بھی بچہ جموروں کی شدید مانگ ہے...... بہرحال تمہارا قلندری سے کیا واسطہ...... تمہیں اگر علم ہو جائے کہ قلندر نے کون سی بات کی تھی تو پھر تم کیا کرو گے؟"

"بھئی میں پھر وہی بات ملک کے دانشوروں' حکمرانوں اور سیاستدانوں سے کروں گا اور پھر وہ سب پانی پانی ہو جائیں گے اور یوں ملک میں جو پانی کی کمی واقع ہو رہی ہے' وہ دور ہو جائے گی۔"

"ہائے ہائے کیا پتے کی بات کی ہے' مجھ پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا......"

"کل کتنے گھڑے پانی پڑا..... تعداد بتاؤ؟"

"یار میں گن تو نہیں رہا تھا۔"

"آئندہ احتیاط کرنا..... ملک میں پانی کی شدید کمی ہے' ہم محض خفت مٹانے کے لیے گھڑوں پانی ضائع کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے..... تمہیں پتہ ہے کہ راوی تقریباً سوکھ چکا ہے..... وہاں اس کے کناروں پر صدیوں سے آباد ملاح سارا دن اپنی خالی کشتیوں میں بیٹھے رہتے ہیں' ایک عورت نے منت مانی تھی کہ اگر میرے دل کی مراد پوری ہو جائے تو میں گڑ کے چاول' دیسی گھی میں پکا کر راوی کی مچھلیوں کو کھلاؤں گی..... وہ میٹھے چاولوں کا دیگچہ سر پر اٹھائے وہاں گئی تو معلوم ہوا کہ مچھلیاں تو تب ہوتی ہیں جب پانی ہوتا ہے..... چنانچہ وہ مایوس لوٹ آئی....."

"میٹھے چاول واپس لے آئی؟"

"نہیں وہ اس نے بھوکے ملاحوں کو کھلا دیئے..... ادھر شیر دریا سندھ بھی سوکھ رہا ہے..... اندھی ڈولفن پریشان ہے کہ اب کہاں جائے..... تو اب تم بتاؤ کہ پانی کی کمی کا کیا حل ہو سکتا ہے....."

"یار! پانی اتنا بھی کم نہیں ہوا ہوگا..... چلو بھر تو ہوگا؟"

"اس میں ڈوبنے کے لیے شرم کی ضرورت ہے..... وہ کہاں سے لاؤ گے..... تم اپنے آس پاس نظر کرو' بڑے شہروں کی جدید بستیوں میں اب بھی روزانہ پجیرو' ہنڈا اور ٹویوٹاز کو نہلایا جاتا ہے..... دو تین روز کے لیے ان کا پانی بند کر دیا جائے تو شاید انہیں احساس ہو کہ فصلیں سوکھ رہی ہیں..... ڈیم اور نہریں خشک ہو چکی ہیں اور ایسا وقت بھی آ سکتا ہے جب پینے کے لیے بھی پانی نایاب ہو جائے گا۔"

"یہ تو کوئی مسئلہ نہیں مالک....."

"تمہارے پاس اس کا حل ہے؟"

"ہاں! ہم امریکی مشروبات پئیں گے..... سوڈا واٹر پئیں گے اور سوڈے میں کچھ اور ملا کر پئیں گے' کوئی پروا نہیں....."

"بھئی یہ سب کچھ تو متمول لوگوں اور حکمرانوں کو میسر ہوتا ہے..... غریب لوگ کیا پئیں گے؟"

"کون سے غریب لوگ.....؟"

"بھئی جو عام لوگ ہوتے ہیں..... محنت کرتے ہیں' مشقت کرتے ہیں' وہ غریب لوگ!"

"اچھا اچھا' مجھے تو خبر ہی نہیں تھی کہ پاکستان میں غریب لوگ بھی ہوتے ہیں..... بہر حال اگر ہوتے ہیں تو یہ خون جگر پئیں گے..... فیض صاحب نے بھی تو کہا تھا کہ

ع پیو کہ مفت لگا دی ہے خون دل کی کشید

تو بس یہی کشید غریب لوگ پئیں گے اور موج کریں گے۔"

"لیکن بچہ جمورا! پانی کم کیوں ہو رہا ہے؟"

"یونانیوں میں ایک کہاوت ہے کہ جب قدرت کسی قوم کو تباہ کرنا چاہتی ہے تو پہلے اسے پاگل کر دیتی ہے' لوگ ایک دوسرے کے گلے کاٹنے لگتے ہیں..... کسی اور عقیدے کو برداشت نہیں کرتے..... پتھروں پر حملہ آور ہو جاتے ہیں لیکن یہ تو یونانی کہاوت ہے..... ہمارے ہاں کسی کا بائیکاٹ کرنا ہو تو اس کا حقہ پانی بند کر دیا جاتا ہے..... بس یوں سمجھ لو کہ ہمارے اعمال ایسے ہیں کہ اللہ میاں ہمارا حقہ پانی بند کرنے کو ہے۔"

"تو اس کا علم تو حقہ پینے والوں اور ٹوپی پہننے والوں کو بھی ہوگا..... وہ اس سلسلے میں کیا کر رہے ہیں..... قوم کی کیا رہنمائی کر رہے ہیں؟"

"بھئی جلسے جلوس نکال رہے ہیں..... وی کے نشان بناتے گرفتاریاں پیش کر رہے ہیں اور کیا کریں....."

"لیکن لوگ تو ان کارروائیوں میں دلچسپی نہیں لے رہے..... گرفتاریوں کی تصویریں دیکھ کر ذرہ بھر رنج نہیں ہوتا..... بلکہ لبوں پر مسکراہٹ آ جاتی ہے کہ انہوں نے پھر سے یہ کھیل شروع کر دیا ہے..... ادھر ہر جانب فلاں وزیر اعظم..... فلاں وزیر اعظم کے فلک شگاف نعرے لگ رہے ہیں..... بھئی کیوں وزیر اعظم..... خواہ مخواہ وزیر اعظم....."

"اس لیے کہ ان دنوں خواہ مخواہ وزیر اعظم بہت پاپولر ہیں..... بہتات میں

ہیں...... میاں صاحب کہتے ہیں کہ میں اب بھی وزیراعظم ہوں اور اسمبلیاں بحال ہوتے ہی میں موٹروے کے راستے وزیراعظم ہاؤس میں پہنچ جاؤں گا...... اودھر بی بی سوائے سوئٹزرلینڈ کے یورپ کے ہر ملک میں بھنبیری کی طرح گھوم رہی ہیں...... انہوں نے بھی تو بیان دیا تھا کہ میرے بچوں کو تو وزیراعظم ہاؤس میں رہنے کی عادت ہوگئی ہے بڑی زیادتی کی جو مجھے وہاں سے نکال دیا...... میاں اظہر بھی قطار میں کھڑے ہوگئے ہیں اور اعجازالحق پدرم سلطان بود کا حق جتا رہے ہیں اور کروڑوں عوام سے کوئی کچھ نہیں پوچھتا کہ سناؤ تم کس حال میں ہو...... کس کو وزیراعظم بنانا پسند کرو گے۔''

''لو وزیراعظم بننے کے لیے عوام سے تھوڑا پوچھتے ہیں...... امریکہ سے پوچھتے ہیں...... فوج سے پوچھتے ہیں اور بیوروکریسی سے پوچھتے ہیں۔''

''لیکن بچہ جمورا! ہم نے تو پانی پانی ہوجانے کی بات کی تھی...... اس کے بارے میں کوئی بھی نہیں بولتا...... لیڈران کوئی بیان نہیں دیتے...... کچھ تو کرنا چاہیے۔''

''ہم بہت کچھ کر رہے ہیں۔''

''مثلاً......؟''

''مثلاً ہم گدھوں کا مقابلۂ حسن منعقد کر رہے ہیں۔''

''کون سے گدھوں کا......؟''

''ہاں ان کی بھی تو ہمارے ملک میں بہت ورائٹی ہے لیکن میں اوریجنل گدھوں کی بات کر رہا ہوں' یہ مقابلہ سوات کی حسین وادی میں منعقد کیا گیا...... دور دور سے گدھے اور گدھیاں لائے گئے...... انہیں میک اپ کیا گیا...... ان کی آرائش کی گئی اور پھر ایک حسین ترین گدھے کو اس مقابلۂ حسن میں مسٹر پاکستان یا مس پاکستان کا خطاب دیا گیا۔''

''ہاں میں نے بھی اس مقابلۂ حسن کی تصویر دیکھی تھی کہ گدھے سجے بنے کھڑے ہیں اور ان کے پُرفخر مالکان ان کے کان پکڑے تصویر اتروا رہے ہیں۔''

''لیکن اس مقابلۂ حسن کا پانی کی کمی سے کیا تعلق ہے؟''

''بہت تعلق ہے...... ہم پاکستان بھر میں گدھوں کے مقابلہ ہائے حسن منعقد کریں گے اور جو گدھے وہاں حسین ترین قرار پائیں گے' انہیں ایکسپورٹ کر کے قیمتی

زرمبادلہ کمائیں گے اور پھر اس زرمبادلہ سے ہم پانی امپورٹ کریں گے۔''

''میرا خیال ہے تم پانی کی کمی کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہو۔''

''اگر ہمارے لیڈران سنجیدہ نہیں ہیں تو میں کیسے ہو سکتا ہوں...... میں تو محض عوام ہوں...... ہاں میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ جتنی بھی قدیم تہذیبیں تھیں' وہ پانی کے کنارے آباد تھیں اور جونہی وہ دریا خشک ہوئے' ان سے منہ موڑ کر کسی اور جانب بسنے لگے تو بستیاں کھنڈر ہو گئیں۔''

''ہم تو جان گئے ہیں کہ ہمارے دریا اور ڈیم خشک ہو رہے ہیں تو کیا وہ بھی جان گئے تھے؟''

''ہاں ہر بستی میں کوئی ایک شخص ہوتا ہے جو جان جاتا ہے کہ دریا میں اب اتنا پانی نہیں جتنا کہ پچھلے برسوں میں ان موسموں میں ہوا کرتا تھا...... وہ بستی والوں کو بتاتا ہے کہ دریا سوکھ رہا ہے' ابھی وقت ہے کہ کچھ کر لو لیکن کوئی بھی اس کی بات کا یقین نہیں کرتا اور وہ جلسے جلوس نکالتے رہتے ہیں...... گرفتاریاں پیش کرتے رہتے ہیں اور جب آخری بوند خشک ہو جاتی ہے تو لیڈران کہتے ہیں کہ یہ سب تمہارے برے اعمال کی سزا ہے...... ہم کسی اور بستی کو جاتے ہیں' تم یہاں پیاس سے مر جاؤ کہ یہی تمہارے نصیب میں لکھا ہوا ہے۔''

''عامل......!''

''معمول......!''

''جو پوچھے گا بتلائے گا؟''

''یار تمہیں پہلے بھی منع کیا ہے کہ تمہید نہ باندھا کرو' جو پوچھنا ہے سیدھی طرح پوچھ لیا کرو۔''

''تمہارے پاس چلو بھر پانی ہے؟''

''ہاں ہے...... لیکن شرم نہیں ہے۔''

پرندہ کمپیئر اور نیوٹرل مسجد

آج صبح سیر کرتے ہوئے پارک میں آغا صاحب ملے تو کہنے لگے۔ ''یار! آپ سے ایک کام ہے؟''

آغا صاحب چونکہ خوش شکل اور گورے چٹے بزرگ ہیں اس لیے میں نے انہیں چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''آغا صاحب میں کبھی کبھار ٹیلی ویژن پر کام تو کرتا ہوں لیکن میرا وہاں اتنا رسوخ نہیں کہ میں آپ کو کسی ڈرامے میں نرما یا ماریہ واسطی کے بالمقابل ہیرو کا پارٹ دلوا سکوں......''

''لاحول ولا......'' وہ مسکرائے۔ ''بھئی یہ کام نہیں......''

''تو پھر کیا کام ہے؟''

''بھئی تم نے نرما اور ماریہ واسطی کا حوالہ دے کر وہ کام بھی بھلا دیا ہے...... بھلا ہمیں اس عمر میں ہیرو کون رکھے گا...... زیادہ سے زیادہ دادا جان کا رول مل جائے گا......''

آغا صاحب شرمیلے بھی ہیں تو تھوڑے شرما گئے......

''آغا صاحب آپ حکم کریں میں خود ایک سیریل تحریر کروں گا اور شرط رکھوں گا کہ اس میں آغا صاحب کو ہیرو لیا جائے...... بس یہ ہے کہ آپ سو پونڈ کے قریب وزن کم کر لیں اور ایک دلیپ کمار سٹائل کے بالوں کی وگ لگوا لیں......''

''توبہ توبہ......'' آغا صاحب نے باقاعدہ اپنی کانوں کی لویں چھوئیں۔ ''ویسے وہ کام یاد آ گیا ہے لیکن اب بتاتے ہوئے شرم آ رہی ہے کہ ہم کس قسم کی لغویات میں ملوث ہو گئے اور کام نہایت شرعی قسم کا ہے......''

''دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں......''

''تم اب بولے تاں تو میں...... چھانپڑ لگا دوں گا......'' آغا صاحب اس لیے بھی جلد اشتعال میں آ جاتے ہیں کہ بلڈ پریشر کے مریض ہیں۔ ''تم ٹیلی ویژن پر میزبانی کرتے ہو تو وہاں تمہیں ادھر ادھر کی ہانکنے کی عادت پڑ گئی ہے...... کسی مہمان کو کچھ کہنے نہیں دیتے اور ہمیشہ موضوع سے ہٹ کر اپنا فلسفہ بگھارنے لگتے ہو......''

''ویسے آغا صاحب قطع کلامی تو ہوتی ہے لیکن مجھے بھی ضعف یادداشت کا عارضہ لاحق ہے...... بات بھول جاؤں گا...... میں آپ کو عید کے دوران دکھائے جانے والے ایک پروگرام میں جو کچھ دو پرندہ کمپیئر خواتین نے کہا۔ وہ پہلے بتانا چاہتا ہوں۔''

''یہ پرندہ کمپیئر کیا ہوتی ہیں؟''

''آج کل جو ماڈرن کمپیئر خواتین ٹیلی ویژن پر جلوہ افروز ہوتی ہیں انہیں کہا جاتا ہے کیونکہ وہ مسلسل ہاتھ ہلاتی رہتی ہیں اور لگتا ہے کہ ابھی ابھی پرواز کر جائیں گی۔''

''اچھا اچھا وہ جو بار بار تمہاری طرف انگلی کر کے کہتی ہیں کہ ہائے گائز۔''

''بالکل وہی...... تو عید کے دوسرے یا تیسرے دن بھی پرندہ کمپیئر قسم کی خواتین ٹیلی ویژن دیکھنے والوں کو عید قربان کا فلسفہ سمجھا رہی تھیں...... ایک نے کہا شاہانہ یہ تو تمہیں پتہ ہے کہ ہم قربانی کیوں کرتے ہیں کیونکہ حضرت ابراہیمؑ نے ایسا کیا تھا اور تم جانتی ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے۔ دوسری نے کہا' ہاں ہاں کہانا میں جانتی ہوں اور ہمیں امید ہے کہ دیکھنے والے بھی جانتے ہوں گے۔ اور شاہانہ قربانی کرنے میں کتنا مزہ آتا ہے۔ کیسے کیسے سوئٹ سوئٹ بکرے ہوتے ہیں جنہیں ہم حلال کرتے ہیں لیکن تمہیں پتہ ہے کہ سب سے زیادہ مزہ تو سعودی عرب میں آتا ہوگا کیونکہ وہ قربانی کا ہوسٹ کنٹری ہے......''

''ہوسٹ کنٹری......'' آغا صاحب چونکے......

''ہاں...... ان کا مطلب یہ تھا کہ چونکہ پہلی وہاں قربانی دی گئی تھی اس لیے وہ قربانی کا میزبان ملک ہے۔''

''تارڑ جی...... مجھے بنا رہے ہو......'' آغا صاحب پھر اشتعال میں آ گئے۔

''وہ یہ کیسے کہہ سکتی ہیں؟''

''آغا صاحب وہ صرف یہ نہیں اور بہت کچھ بھی کہہ سکتی ہیں۔ ذرا آگے سنئے......

اس پر کبانہ نے ہاتھ نچا کر کہا...... لیکن شاہانہ سعودی عرب میں ان دنوں قربانی کرنے کا کتنا مزہ آیا ہوگا...... یعنی حج کے دوران...... کیونکہ پوری دنیا کے مسلمان وہاں آتے ہیں اور طرح طرح کے مختلف لباسوں میں آتے ہیں تو کتنے کیوٹ لگتے ہوں گے۔ اس پر کبانہ فوراً بولی...... ہاں شاہانہ یہ تو کلچر ہے ناں...... واقعی سب لوگوں کے لباس مختلف ہوں گے۔ تو ہائے یوں لگتا ہوگا جیسے ایک فینسی ڈریس شو ہو رہا ہے......"

"لاحول ولا......" آغا صاحب قطعی طور پر اشتعال میں نہیں آئے بلکہ گہرے دُکھ سے بولے۔ "ان پرندہ کمپیئر نے یہ کہا......"

"جی بالکل...... رپورٹنگ میں انیس بیس کی غلطی ہو سکتی ہے' لیکن میرے کانوں نے تقریباً یہی کچھ سنا......"

"یعنی وہ پرندہ کمپیئر یہ نہیں جانتی تھیں کہ حج کے دوران ہر مسلمان احرام میں ہوتا ہے اور اپنے اپنے ملک کا لباس نہیں پہنتا۔ اور کیا واقعی انہوں نے یہ کہا کہ یہ فینسی ڈریس شو لگتا ہوگا......"

"بس یہی کہا آغا صاحب...... اگر وہاں مسلمان احرام باندھ کر آتے ہیں اور اپنے اپنے ملک کے لباسوں میں نہیں آتے تو پھر فینسی ڈریس شو تو نہیں ہوتا' اس لیے وہ قصوروار نہیں ہیں...... ذرا پروگرام کو چلبلا اور ماڈرن بنانے کی کوشش کر رہی تھیں...... کہ آج کل یہی چلن ہے...... ہاں تو آپ کہہ رہے تھے کہ آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے؟"

آغا صاحب تھوڑی دیر رنجیدگی میں چپ رہے اور پھر کہنے لگے۔ "یار مجھے کوئی نیوٹرل سی مسجد کا پتہ بتلا دو...... عبادت کا لطف جاتا رہا ہے......"

"نیوٹرل مسجد...... مسجد تو مسجد ہوتی ہے آغا صاحب......"

"یہی تو پرابلم ہے جناب...... ہر فرقے نے اپنی اپنی مسجدوں کے نام الگ الگ رکھے ہوئے ہیں۔ جماعت کھڑی ہوتی ہے تو ان کے اپنے پرائیویٹ گارڈ کلاشنکوف بلند کر کے پہرہ دینے لگتے ہیں۔ جمعہ کا اجتماع ہو تو سرکاری انتظام ہوتا ہے...... پولیس گھیرا ڈالے کھڑی ہوتی ہے...... میں نے ایک تصویر دیکھی جس میں گارڈ زیادہ تھے اور نمازی کم...... رکوع میں جاتے ہیں تو دل دھڑکتا ہے کہ پتہ نہیں کیا ہو جائے......"

"یہ پرابلم تو ہے آغا صاحب...... بچے نماز کے لیے جاتے ہیں تو والدین دعائیں مانگتے ہیں کہ خیر خیریت سے واپس آ جائیں۔"

"اب زیادہ تر لوگ گھروں میں نماز ادا کر لیتے ہیں۔ حالانکہ مستحسن تو یہی ہے کہ انسان مسجد میں جا کر باجماعت نماز پڑھے...... اخوت اور بھائی چارے میں اضافہ ہو...... جب سے شیخوپورہ اور لاہور میں قتل عام ہوا ہے تب سے کسی مسجد کے قریب سے گزرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے...... اس کا ایک حل تو میں نے یہ تلاش کیا ہے کہ اوّل تو انسان گھر میں ہی نماز ادا کر لے ورنہ کسی تاریخی اور قدیم مسجد میں چلا جائے کہ وہ کسی ایک فرقے یا گروہ کی نہیں تمام مسلمانوں کی ہوتی ہے۔ ہر قتل و غارت گری کے بعد حکمرانوں کی جانب سے ہمیشہ یہ بیان آتا ہے کہ یہ کام کوئی مسلمان نہیں کر سکتا...... ہم کیوں نہیں مان لیتے کہ یہ کام ہم مسلمان ہی کرتے ہیں...... ہندوستان سے ہندو یا اسرائیل سے یہودی آ کر تو یہ کام نہیں کرتے۔ ہم خود ایک دوسرے کے گلے کاٹتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ کام کسی مسلمان کا نہیں ہو سکتا...... اس لیے میں آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی نیوٹرل مسجد ہو......"

"آغا صاحب اس کا پتہ تو ان سے پوچھئے جو اللہ کی عبادت بھول کر اپنے اپنے فرقوں کی پرستش کر رہے ہیں۔" میں نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ذرا آس پاس دیکھئے کہ بہار کے موسم میں...... پھولوں کے اتنے ڈھیر ہیں کہ طیور کے پاؤں الجھتے ہیں۔ چمن میں گویا رنگوں سے آگ لگی ہوئی ہے۔ اور بلبل پکارتی ہے کہ صاحب پرے پرے...... تو آیئے یہیں اس کی ثنا کرتے ہیں کہ یہ پوری دنیا اسی کی ہے وہ دلوں کا حال جاننے والا ہے...... وہ ہمارے دل کا حال بھی جانتا ہے اور ان کے دل کا بھی جو ہمیں مسجدوں سے دور کر رہے ہیں۔"

جادوگر بنئے اور زلزلہ لائیے

اُن دنوں ہمیں زلزلے بڑے پسند تھے۔

یہ اُن دنوں کا قصہ ہے جب ہم بچہ لوگ نے ابھی اپنی پہلی پتلون نہیں پہنی تھی۔ یہ نہیں کہ ہم ننگ دھڑنگ پھرتے تھے...... نہیں ہم نیکروں میں ہوتے تھے۔ والد صاحب کی انگلی پکڑ کر چلتے تھے تو ان دنوں ہمیں زلزلے بڑے پسند تھے۔

کیوں پسند تھے؟ اس لیے کہ ہم نے کبھی زلزلہ دیکھا نہ تھا۔ صرف سن رکھا تھا اور پڑھ رکھا تھا کہ جب زلزلہ آتا ہے تو ہر شے لرزتی ہے' زمین پھٹ جاتی ہے اور درختوں کے پتے تالیاں بجاتے ہیں اور کچھ لوگ مرجاتے ہیں جیسا کہ کوئٹہ میں ہوا تھا...... چونکہ ان دنوں زلزلے نہیں آتے تھے' اس لیے میری اور میرے ہم عمر دوستوں کی بڑی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح ایک زلزلہ آئے اور ہم دیکھیں تو سہی کہ یہ ہوتا کیا ہے...... تب ہمارا ایک دوست تاج جو بچوں کے ناول خریدنے کے لیے لوہاری دروازے کے باہر فٹ پاتھوں پر نمائش کردہ بک سٹالوں پر جایا کرتا تھا ہماری مدد کو آیا...... اس نے جہاں ''ایک آنکھ والا جن''۔ ''کوہ قاف کا بھوت'' اور ''پریوں کی ملکہ'' نامی بچوں کے ناول خریدنے تھے وہاں ایک نہایت کارآمد کتابچہ ''جادوگر بنئے...... آپ کی ہر خواہش پوری ہوگی'' بھی حاصل کرلیا تھا۔ یہ کتابچہ خفیہ طور پر خریدا گیا تھا اور بچہ لوگ اسے چھپ کر پڑھتے تھے۔ اس میں زیادہ تر ٹونے ٹوٹکے محبوب کو حاصل کرنے کے لیے درج کئے گئے تھے اور مجھے اب تک یاد ہے کہ ان میں سے بیشتر تیر بہدف نسخوں میں مینڈک کی چربی اور اُلو کے پَر شامل ہوتے تھے۔ ہم کہیں نہ کہیں سے یہ اشیاء بھی حاصل کرلیتے لیکن بدقسمتی سے یا شاید خوش قسمتی سے ہمیں ابھی کچھ پتہ نہ تھا کہ یہ محبوب کیا ہوتا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے اتنے پاپڑ کیوں بیلنے پڑتے

ہیں اور جب بہت بعد میں ہمیں ٹونوں اور ٹوٹکوں کی حاجت ہوئی یعنی محبوب کو حاصل کرنے کے لیے تو وہ کتابچہ گم ہو چکا تھا۔

بہرحال اس کتابچے میں ہمیں ہمارا گوہر مقصود مل گیا...... یعنی ''زلزلہ لائیے......''

اس میں ایک پرائیویٹ زلزلہ لانے کا نسخہ تھا۔ مجھے اچھی طرح تو یاد نہیں کہ اس کے لیے کن کن چیزوں کی ضرورت تھی لیکن یہ یاد ہے کہ اس میں بھی مینڈک کی چربی اور اُلو کے پر لازمی جز تھے۔ طے پا گیا کہ ہم سب اس نسخے پر عمل کریں اور ایک عدد پرائیویٹ زلزلے کا اہتمام کرکے محلے والوں کو حیران کردیں۔ چونکہ ہم سے مینڈک پکڑے نہیں جاتے تھے کہ وہ اچھلتے بہت تھے اس لیے ان کی جگہ بکرے کی چربی حاصل کی گئی اور اُلو تو ہم نے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا' اس لیے اس کے پروں کے بجائے مرغی کے پر استعمال میں لائے گئے۔ یہ نسخہ مکمل کرنے کے بعد ان اشیاء کو ایک کچے گھڑے میں ڈالا گیا۔ اس کا منہ ایک کالے کپڑے سے باندھا گیا اور پھر حسب ہدایت اسے محلے کے درمیان میں جو کچی جگہ تھی اور جہاں دن کے وقت کرکٹ کھیلی جاتی تھی وہاں دبا دیا گیا۔ کتابچے میں درج تھا کہ گھڑا دبانے کے پورے چھ گھنٹے بعد زلزلہ آجائے گا۔ بچہ لوگ اس رات بالکل نہیں سوئے۔ رضائیوں میں الارم کلاک سمگل کرکے ان کی عافیت کے اندر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وقت دیکھتے رہے کہ بس ابھی آیا زلزلہ...... صبح ہوگئی اور زلزلہ نہ آیا۔ ہم لوگوں کی مایوسی قابل دید تھی اور جادو ٹونوں پر ہمارا اعتقاد مکمل طور پر اٹھ گیا۔ اگرچہ تاج کا کہنا تھا کہ ہم نے اجزائے ترکیبی میں بے ایمانی کی ہے۔ اگر ان میں مینڈک کی چربی اور اُلو کا پر شامل ہوتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ زلزلہ نہ آتا۔

اس قصے کو تقریباً پچاس برس ہونے کو ہیں۔ اس دوران ملک میں بے شمار زلزلے آئے اور ہمیں زلزلے پسند نہ رہے۔ پتہ نہیں ہمارے لیڈران کرام نے کہاں سے ''جادوگر بنئے...... آپ کی ہر خواہش پوری ہوگی'' نامی کتابچہ حاصل کرلیا تھا اور ان میں سے بیشتر اس پر عمل کرتے ہوئے جادوگر بن گئے۔ اپنی ہر خواہش پوری کرنے لگے۔ وہ بااختیار تھے اور بڑی آسانی سے مینڈک کی چربی اور اُلو کے پر حاصل کرسکتے تھے۔ عوام ان کے لیے مینڈک ہی تھے جن کی چربی وہ ہمہ وقت حاصل کرتے رہے اور اپنے ساتھیوں کے پر حاصل کرنے میں بھلا انہیں کیا دشواری پیش آسکتی تھی' وہ نہایت شاندار اُلو تھے...... چنانچہ

جادوگری کا دور شروع ہوگیا۔ ان کی پٹاریوں سے ہر وہ شے برآمد ہوئی جو انہی کے فائدے کی تھی۔ نہیں برآمد ہوئے تو انصاف' قانون کی پاسبانی' مذہبی رواداری' عوام کے لیے باعزت روزگار اور روٹی پانی نہیں برآمد ہوئے۔ ان کے پاس کوئی ایسی گیدڑ سنگھی تھی کہ وہ عوام کے کندھوں پر ہمیشہ سوار رہتے تھے...... اترتے تھے تو فارن ٹرپ پر چلے جاتے تھے۔ واپس آتے تھے تو دوسرے لیڈر کو اتار کر خود سوار ہو جاتے تھے۔ وہ ایسے پیر تسمہ پا تھے جن سے نجات نہیں ملتی تھی۔ ان کی جادوگریاں ایسی تھیں کہ ملک کو دو ٹکڑے کر دیا۔ ان کی بھی غالب کی مانند ہزاروں خواہشیں تھیں اور ہر خواہش پہ عوام کا دم نکل جاتا تھا۔ ان کے ارماں بہت نکلے لیکن وہ کہتے ہیں کہ پھر بھی کم نکلے۔ ان بقیہ ارمانوں کو نکالنے کے لیے ہم واپس آئیں گے اور تحریکیں چلائیں گے۔ وہ ایسے جادوگر تھے کہ دنوں میں محلات کھڑے کر لیتے تھے یعنی اپنے اور اپنے خاندان کے لیے...... اور جب پاکستان میں جگہ کم پڑ جاتی تھی تو انگلستان میں کھڑے کر لیتے تھے۔ اسی ''جادوگر بنئے...... آپ کی ہر خواہش پوری ہوگی'' کتابچے کے ٹونوں ٹوٹکوں پر عمل کرتے ہوئے وہ بڑی آسانی سے ایک کروڑ روپے سے زائد قیمت کا ہیروں کا ہار حاصل کر لیتے ہیں تاکہ اسے زیب تن کر کے غریبوں کے غم میں گھلا جائے۔ انہوں نے ایسے جنات کو قبضے میں لے رکھا تھا جو ملک کے بینکوں کی کل دولت صرف انہی کے لیے اٹھا لاتے تھے اور ان کے لیے دنوں میں انڈسٹریل کمپلیکس تعمیر کر دیتے تھے...... یہ ایسے جادوگر بالما تھے۔

جادو ٹونے کا یہ دور ابھی ختم نہیں ہوا۔ ابھی پچھلے دنوں مجھے ایک صاحب نے نہایت پرتشویش لہجے میں فون کیا۔ ''کیا آپ جانتے ہیں کہ ملک میں آبی ذخائر ختم ہونے کو ہیں...... منگلا ڈیم خالی ہوگیا ہے۔ کچھ نہریں بند کر دی گئی ہیں۔ سندھ میں پانی کم ہوگیا ہے۔ راوی تقریباً سوکھ چکا ہے۔''

''ہاں میں جانتا ہوں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس بار گندم کم ہوگی۔ دوسری فصلیں بھی بارش کی کمی کے باعث متاثر ہوئی ہیں۔ کہتے ہیں کہ قحط پڑنے کا بھی خدشہ ہے۔''

''تو پھر آپ اس سلسلے میں کیا کر رہے ہیں؟''

''مجھے کیا کرنا ہے' جو کرنا ہے شیر نے کرنا ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ چولستان کے دریائے سرسوتی کی مانند ایک روز دریائے راوی اور سندھ کے سوکھ جانے کا بھی امکان ہو سکتا ہے۔ میں نے تو اپنے ناولوں میں ایک دیومالائی سا قصہ بیان کیا تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ سچ ثابت ہو سکتا ہے۔ تو اب مجھے کیا کرنا ہے۔''

''آپ اس سلسلے میں اپنا قومی فریضہ ادا نہیں کریں گے؟''

''قومی فریضہ ادا کرنے والے تو امریکہ یورپ اور سعودی عرب میں گھوم رہے ہیں...... پانی اگر کم ہو رہا ہے تو ان کی وجہ سے ہو رہا ہے یا ان کی برکت سے ہو رہا ہے جو اسلام آباد پر حملہ آور ہونے کے لیے نعرے لگا رہے ہیں یا دوسرے فرقوں کے افراد کو درجنوں کی تعداد میں قتل کر کے غازی بن رہے ہیں...... تو مجھے کیا کرنا ہے۔''

''ہم اب بھی کچھ کر سکتے ہیں۔'' وہ صاحب جو خاصے پڑھے لکھے اور بیدار مغز ہیں' کہنے لگے۔ ''میں اور میرے کچھ دوست اتوار کو ایک وفد کی صورت دریائے راوی پر جا رہے ہیں تاکہ اس میں پانی آ جائے اور ملک میں پانی کی کمی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔''

''میں سمجھا نہیں......'' میں نے حیران ہو کر کہا۔ ''آپ اور آپ کے چند دوست دریائے راوی پر جا کر اس سے درخواست کریں گے کہ اے دریا پھر سے رواں ہو جا تو اس میں پانی آ جائے گا۔''

''نہیں صاحب یہ اتنا آسان کام نہیں...... ہر شخص ایک ایک گھڑا پانی سے بھرا ہوا اپنے ساتھ لے کر جائے گا اور پھر ہم ایک کشتی پر سوار ہو کر دریا کے درمیان میں جا کر اس گھڑے کا پانی دریا میں انڈیل دیں گے۔''

''تو پھر پانی آ جائے گا؟''

''ہاں جی...... یہ ایک بہت پرانا ٹونا ہے...... ٹوٹکہ ہے...... قدیم زمانوں سے چلا آتا ہے۔''

''آپ بھی اس ملک کو ٹوٹکوں پہ چلانا چاہتے ہیں؟ کوئی منصوبہ بندی نہیں کرنا چاہتے؟''

"آپ بحث کیوں کرتے ہیں۔ سیدھی طرح کہئے کہ آپ اس ملک کی خوشحالی اور ترقی میں دلچسپی نہیں رکھتے اور اپنا قومی فریضہ ادا نہیں کرنا چاہتے۔"

کل کے اخباروں میں ایک تصویر ہے...... متعدد خواتین اور حضرات سوٹوں میں ملبوس ایک کشتی پر سوار نہایت سنجیدگی سے اپنے اپنے گھڑوں کا پانی راوی میں انڈیل رہے ہیں۔

شنید ہے کہ اب ایک پرانی رسم کے مطابق بچوں کو جمع کر کے کہا جائے گا کہ آپ راہ چلتے بزرگوں پر پانی پھینکیں اور جب وہ بزرگ آپ کو گالیاں دیں گے تو فوراً بارش شروع ہو جائے گی۔

"جادوگر بنئے...... آپ کی ہر خواہش پوری ہو جائے گی" کا دور اب بھی جاری ہے۔

آستینوں کے بُت اور بامیان کے بدھ

خلیفہ خلفشاری پھر آ گئے۔ ابھی پچھلے ہفتے آئے تھے اور اس ہفتے پھر آ گئے لیکن نہایت خوش مسکراتے کھلکھلاتے خوشگوار موڈ میں آئے اور آتے ہی کہنے لگے "مبارک ہو۔"

"خیر مبارک۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن بتا تو دو کہ کس چیز کی مبارک دے رہے ہو۔"

"کمال ہے تمہیں ابھی تک علم ہی نہیں ہوا۔ تمام دنیا خوشیاں منا رہی ہے اور تم پوچھتے ہو کہ کس شے کی مبارک۔ بھئی افغانستان کی حکومت نے پورے افغانستان میں جتنے بھی قدیم مجسمے ہیں انہیں پاش پاش کر دینے کا حکم دے دیا ہے اور ان میں مہاتما بدھ کے وہ طویل قامت مجسمے بھی شامل ہیں جو بامیان میں ایک پوری چٹان میں سے تراشے گئے ہیں اور کچھ ناہنجار لوگ انہیں شاہکار گردانتے ہیں۔"

"خلیفہ میں نے بھی یہ خبر پڑھی ہے لیکن مجھے تو یقین نہیں آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے بلکہ مجھ پر تو ایک خاص قسم کا ڈپریشن طاری ہے اور تم خوش ہو رہے ہو۔"

"تمہارا ایمان کمزور ہے ناں' میں اس لیے خوش ہو رہا ہوں کہ پچھلے ڈھائی ہزار برس سے یہ مجسمے افغانستان میں قائم ہیں اور آج تک کسی کو خیال ہی نہیں آیا کہ دراصل اس ملک کی ترقی میں یہ پتھر کے صنم حائل ہیں اگر انہیں تباہ کر دیا جائے تو افغانستان خوشحال ہو جائے گا اور اتنی ترقی کرے گا کہ یورپ اور امریکہ حیران رہ جائیں گے۔ چنانچہ اب انہیں خیال آ گیا ہے تو میں خوش ہوں' بلکہ میرا جی چاہتا ہے کہ ایک عدد ہتھوڑے سے مسلح ہو کر میں بھی اُن میں شامل ہو جاؤں اور طاغوت کی قوتوں کو پاش پاش کر دوں۔"

"خلیفہ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی' سلطان محمود غزنوی ظاہر ہے افغانستان

کا تھا اور اسے تاریخ میں بُت شکن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ طویل مسافتیں طے کرتا سومنات پہنچ گیا تھا تا کہ اس کے بُت کو پاش پاش کر دے تو کیا اس کو بامیان کے بدھ مجسمے نظر نہیں آئے تھے۔ اگر ایک بُت شکن نے ان مجسموں کو ہاتھ نہیں لگایا تھا تو اب کیا مسئلہ ہو گیا ہے۔''

''بھئی تم منطق کی مار نہ دو ان معاملوں میں منطق کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ سلطان محمود غزنوی کو یا تو اپنے ہی ملک کے ان مجسموں کے بارے میں علم نہ تھا یا پھر وہ تاریخ میں چونکہ علوم وفنون کی سرپرستی کرنے والا حکمران جانا جاتا تھا۔ البیرونی اور فردوسی جیسے شاعر اس کے دربار میں تھے۔ شاعری سے رغبت رکھتا تھا تو اس نے نااہلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان مجسموں کو ایک یادگار جانا اور خوبصورت جانا اور یہ بھی جانا کہ ان کی پرستش تو ہوتی نہیں' پجاریوں کے بغیر مجسمے محض پتھر ہوتے ہیں تو اس نے انہیں برباد کرنا مناسب نہ جانا۔''

''تو کیا اب وہاں ان کے پجاری پیدا ہو گئے ہیں جو انہیں تباہ کیا جا رہا ہے؟''

''پھر منطق کی بات کرتے ہو یوں سمجھ لو کہ جو کارنامہ محمود غزنوی بھی سرانجام نہ دے سکا وہ افغان حکومت سرانجام دے رہی ہے۔''

''مگر کیوں......؟''

''ٹھنڈے دل سے سوچو کہ اگر بامیان کے بدھ مجسموں کے علاوہ جلال آباد' غزنی' کابل اور ہرات وغیرہ کے عجائب گھروں میں جو مجسمے بیکار پڑے ہیں انہیں تباہ کر دیا جائے تو پورا ملک پاکیزہ ہو جائے گا بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ افغانستان کے فوراً بعد اس کارِ خیر کا آغاز پاکستان میں بھی ہونا چاہیے۔ ہمارے ہاں بھی لوگ موجود ہیں' اکثر اوقات ٹیلی ویژن وغیرہ توڑتے رہتے ہیں تو انہیں اس کام پر لگا دیا جائے۔''

''تم چاہتے کیا ہو خلیفہ؟''

''میں چاہتا ہوں کہ سب سے پہلے تو لاہور میوزیم میں رکھے فاسٹنگ بدھا کو نکال کر اسے مال روڈ کے چوک میں رکھ کر جلا دیا جائے۔''

''لیکن وہ تو پتھر کا ہے۔''

''بھئی اگر افغان حکومت ٹینکوں اور راکٹ لانچروں سے مہاتما بدھ کے پرخچے

اڑا رہی ہے تو ہم بھی جدید سائنس کی تحقیق سے فائدہ اٹھا کر کسی نہ کسی طرح اس مجسمے کو جلا کر راکھ کر دیں گے۔ منیر نیازی نے بھی تو کہا تھا کہ اس شہرِ سنگ دل کو جلا دینا چاہیے تو شہر صرف اس لیے سنگ دل ہے کہ لاہور کے دل میں یہ مجسمہ نمائش پر ہے چنانچہ فاسٹنگ بدھا کو برباد کرنے کے بعد لاہور' کراچی' پشاور' ٹیکسلا اور سیدو شریف کے عجائب گھروں میں جتنے بھی بدھ کے مجسمے ہیں انہیں توڑیں گے۔ اس کے بعد موہنجوداڑو' ہڑپہ اور تخت بائی کے کھنڈروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔''

''پھر کیا ہو گا خلیفہ؟''

''پھر یہ کہ...... پھر پتا نہیں کیا ہو گا لیکن تم بحث کیوں کرتے ہو......''

''توبہ توبہ...... میری مجال ہے۔ لیکن خلیفہ' مصر کے ایک عالم دین نے بھی احتجاج کیا ہے...... ایران اسلامی ملک ہے تو وہاں سے بھی ناپسندیدگی کا اظہار ہو رہا ہے اور پاکستان نے بھی دبے لفظوں میں مذمت کی ہے اگرچہ لگتا یوں ہے کہ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا......''

''واہ تم نے خوب یاد دلایا...... یہ مصری کیسے مسلمان ہیں کہ فرعونوں کی یادگاروں کو سینے سے لگائے پھرتے ہیں اور انہیں لوگوں کو دکھا دکھا کر اربوں ڈالر کماتے ہیں تو پاکستان کے بعد مصر والوں میں اگر ذرہ برابر بھی حمیت ہے تو انہیں نہ صرف اپنے تمام عجائب گھر بلکہ ابوالہول اور اہرام وغیرہ بھی تباہ کر دینے چاہئیں۔''

''لیکن خلیفہ اہرام تو ہزاروں برسوں سے قائم ہیں انہیں کیسے ڈھایا جائے گا؟''

''بھئی جیسے ہم دنیا بھر سے ایکسپرٹ امپورٹ کرتے ہیں ویسے مصری بھائی طالبان کو بلا لیں گے اور وہ اپنے ٹینک اور راکٹ لانچر لیکر پہنچ جائیں گے۔''

''چلو یہ قصہ بھی پاک ہوا لیکن ایران والے کیوں شور مچا رہے ہیں؟''

''یہ سیاست ہے۔ وہ احمد شاہ مسعود کے حمایتی ہیں اس لیے۔ اس کے علاوہ ایران میں بھی تو قدیم تہذیبوں کے بیشمار کھنڈر اور بُت ہیں۔ پرسی پالس کو یاد ہے سکندر اعظم کی ایک رقاصہ نے جلا دیا تھا اور ایران والے اس کے کھنڈروں اور مجسموں کو سینت سینت کر رکھتے ہیں' چنانچہ وہ خوفزدہ ہیں کہ کہیں اپنے بدھ تباہ کرنے کے بعد

طالبان ادھر کا رُخ نہ کرلیں۔''

''خلیفہ ویسے تو میں تم سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں کہ اگر انہوں نے پچھلے بیس برسوں میں اپنا پورا ملک ڈھا دیا ہے تو چند مجسمے جو رہ گئے ہیں' انہیں ڈھا دینے سے کیا فرق پڑے گا' ان کا اپنا ملک ہے جو چاہیں کریں بھلا بقیہ دنیا ان کے اندرونی معاملات میں کیوں دخل دیتی ہے۔ لیکن خلیفہ دنیا میں بیشمار ملک بدھ کے پیروکار ہیں اور ان دوسرے ممالک میں ہماری سینکڑوں مساجد بھی ہیں تو اگر بدھ حضرات بھی طالبان ہو گئے تو پھر ہم کیا کریں گے؟''

خلیفہ ہنسنے لگا اور میری کمر پر ایک دھپ لگا کر بولا۔ ''ان کی تم فکر نہ کرو...... وہ امن پسند لوگ ہیں اس قسم کی حرکت نہیں کریں گے' دو چار احتجاجی جلوس نکالیں گے لیکن ہماری مساجد کو کچھ نہیں کہیں گے۔''

''لیکن خلیفہ ہندوؤں کا کیا ہوگا' وہ تو امن پسند نہیں ہیں۔''

''انہوں نے ہماری بابری مسجد ڈھا دی تھی ناں...... ہم نے حساب برابر کر دیا۔ ان کی جرأت ہے کہ تاج محل اور جامع مسجد کو ہاتھ لگائیں۔''

''یار ہسپانیہ میں مسجد قرطبہ ابھی تک قائم ہے۔ وہ کٹر کیتھولک ہیں کیا پتا وہ بھی طالبان ہو جائیں' مجھے ڈر آتا ہے۔''

''تم پھر بحث کرنے لگے۔ بھئی یہ توڑ پھوڑ کا حق صرف افغانوں کو حاصل ہے اور کسی کو نہیں' مجھے معلوم ہے تم کیوں ڈرتے ہو...... تم نے بھی گندھارا کے پرانے مجسمے جمع کر رکھے ہیں۔ میں لوگوں کو جھوٹ موٹ ہی بتا دوں کہ تم چوری چھپے ان کی پرستش کرتے ہو تو۔''

''خدا کے لیے ایسا نہ کرنا خلیفہ۔'' میں تھر تھر کانپنے لگا۔ ''کہیں لوگ واقعی یقین نہ کر لیں...... مذاق میں بھی ایسی بات نہ کرنا' وہ دو چار مجسمے تو پہلے سے ہی ٹوٹے ہوئے ہیں' میں ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا' بلکہ جو چونے کے بنے ہوئے مجسمے ہیں ان کو پیس کر پانی ملا کر گھر کی دیواروں کو قلعی کر دوں گا۔ لیکن لگے ہاتھوں مجھے ایک بات بتا دو۔''

''جو پوچھو گے بتلائیں گے۔'' خلیفہ نے سینہ پھلا کر کہا۔

''پورے افغانستان میں قحط پڑا ہوا ہے۔ لاکھوں لوگ سرحد عبور کر کے پاکستان کی سرزمین پر بے یار و مددگار بیٹھے ہیں۔ روزانہ درجنوں بچے سردی سے مر جاتے ہیں۔ غیر ملکی بلکہ کفار کی جانب سے جو امداد روانہ کی جاتی ہے اسے حاصل کرنے کے لیے بھوکے لوگ ایک دوسرے کی گردن مارنے کو آتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے معصوم افغان بچے اور بچیاں ایک ایک روٹی کے لیے ترستے ہیں۔ بھیک مانگتے ہیں' خواتین ایک وقت کی روٹی کے لیے اپنی عزت داؤ پر لگاتی ہیں تو کیا افغان حکومت پر ان کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اپنے عوام کو کم از کم دو روٹیاں تو دے نہیں سکتے' صرف پتھروں پر ٹینک چڑھا کر خوش ہو جاتے ہیں۔ یار خلیفہ میں نے روسی قبضے سے پیشتر جو افغانستان دیکھا تھا وہ دنیا کے خوبصورت ترین ملکوں میں سے تھا۔ پہلے اسے روسیوں نے برباد کیا پھر ہم نے اور افغانیوں نے مل کر اسے برباد کیا اور رہی سہی کسر نکال دی...... بامیان کے ان بدھ مجسموں کو توڑنے کی بجائے اگر فروخت کر دیا جاتا تو افغانستان مالا مال ہو جاتا۔''

''میاں ہم بت شکن ہیں بت فروش نہیں۔''

''چلو خلیفہ مان لیا کہ تمام بتوں کو برباد کر دیا جائے گا لیکن ایک آخری بات بتا دو...... جو بت ہماری آستینوں میں ہیں انہیں کون توڑے گا؟''

■■■■■■■■■■

مجھے ایک کوّا چاہیے

''یار تمہارے پاس ایک کوا ہے؟'' خلیفہ خلفشاری نے آتے ہی سوال کر دیا۔
''خلیفہ میرے پاس ایک کوا نہیں ہے اور دو کوّے بھی نہیں ہیں...... لیکن یار نہ سلام نہ دُعا آتے ہی کائیں کائیں کرنے لگے ہو۔ تمہیں ایک کوّے کا کیا کرنا ہے...... کوا کڑاہی بنانی ہے؟''
''یار کوا تو حرام ہوتا ہے۔''
''لوگوں کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ ہر شے کھا جاتے ہیں...... باقی رہی حرام کی بات تو بسنت پر اتنا کھایا نہیں گیا جتنا پیا گیا ہے۔''
''نہیں میں کوا کڑاہی نہیں بنانا چاہتا بلکہ صرف ایک کوا دیکھنے کی حسرت ہے...... دکھا دو تو میں بے حد شکر گزار ہوں۔''
میں نے کمرے سے باہر آ کر اپنے مختصر باغیچے پر ایک نظر ڈالی۔ ہمسائیوں کے درخت کو غور سے دیکھا جہاں عام حالات میں دیگر پرندوں کے علاوہ درجنوں کوّے کائیں کائیں کر رہے ہوتے تھے لیکن حیرت انگیز طور پر آج وہاں ایک کوا بھی موجود نہ تھا۔
''خلیفہ میرے پاس تو کوئی کوا نہیں ہے۔''
''میرے پاس بھی نہیں ہے۔''
''تم نے اپنے گھر کی منڈیر کو غور سے دیکھا ہے وہاں کوئی نہ کوئی کوا تو بیٹھا ہوگا۔''
''منڈیر بھی خالی پڑی ہے...... صبح سے بیٹھا کسی کوّے کا انتظار کر رہا تھا لیکن پتہ نہیں کوّے کہاں چلے گئے ہیں...... ایک بھی نظر نہیں آیا۔''
''لیکن یک دم تم کوّوں کے عاشق کہاں سے ہو گئے۔ کائیں کائیں کرنے والا

کالا سیاہ پرندہ اور کریہہ المنظر...... کیا کرو گے دیکھ کر......''
''یار ہمارے دیگر پرندے بلبلیں...... ہدہد...... چڑیاں...... نیل کنٹھ سب کے سب بدصورت ہو گئے ہیں۔ میں انہیں پھر سے خوبصورت دیکھنا چاہتا ہوں اس لیے ایک کوا دیکھنا چاہتا ہوں۔''
''یہ کیا اوٹ پٹانگ ہانک رہے ہو خلیفہ...... کوا تو خوبصورت نہیں ہوتا۔''
''دیکھو تارڑ میاں...... دُنیا کی ہر شے موازنے میں خوبصورت دکھائی دیتی ہے...... حسن بھی بدصورتی کا مرہون منت ہے...... جب تک تقابل نہ ہوگا تب تک حسن کی بھی تعریف نہ ہوگی۔ اگر سبھی لوگ خوبصورت ہوں تو ان کی کوئی قدر نہ ہوگی کہ سبھی لوگ ایک جیسے ہوں گے...... جیسے بلندی بھی پستی کی مرہون منت ہے۔''
''یہ کیا فلسفہ بگھارنے لگے ہو خلیفہ...... بات ایک کوّے کی ہو رہی تھی۔''
''میں بھی ایک کوّے کی بات کر رہا ہوں...... پچھلے کئی روز سے مجھے کوئی کوا دکھائی نہیں دیا چنانچہ دیگر پرندوں کی خوبصورتی کم ہوتی جاتی ہے کہ موازنہ غائب ہے...... پرندوں کے جھنڈ میں دو چار کوّے پھدک رہے ہوں تو بقیہ پرندے زیادہ خوبصورت لگتے ہیں۔''
''شاباش خلیفہ...... کیا پتے کی بات کی ہے۔ ہاں یار یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو کہ پچھلے چند روز سے مجھے بھی کوّے دکھائی نہیں دیئے۔ میں نے غور ہی نہیں کیا تھا...... کہاں چلے گئے؟''
''میں نے پورے لاہور میں چیک کیا ہے کہیں ایک کوا بھی نہیں ہے...... میرا خیال ہے کوّے یہ شہر چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے ہیں۔''
''کیوں چلے گئے ہیں؟''
''اپنی جان بچانے کے لیے......''
''میں نے کہا تھا ناں کہ لوگ ہر شے کھا جاتے ہیں...... یقیناً کوّوں کو یہی خدشہ ہوگا کہ یہ لوگ اب ورائٹی کی خاطر ہمیں بھی ہڑپ کرنے کو ہیں اس لیے وہ یہاں سے رخصت ہو گئے ہیں۔''
''نہیں یار...... اگر ایسا ہوتا تو ہر طرف کوا فارم کھل جاتے ان کی افزائش نسل کا خیال رکھا جاتا اور ان کی دیکھ بھال کی جاتی جس طرح ہم بکروں اور مرغیوں وغیرہ کی کرتے ہیں......

لیکن ایسا نہیں ہوا...... کراچی میں جنگلی حیات کے کسی ایکسپرٹ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کوے بقیہ پرندوں کی افزائش میں خلل ڈال رہے ہیں اس لیے انہیں نیست و نابود کر دیا جائے۔ شنید ہے کہ وہاں ہزاروں کوے پکڑ کر انہیں ہلاک کر دیا گیا۔ اگرچہ یہ کہا گیا کہ انہیں ہلاک کرتے ہوئے یہ خاص خیال رکھا گیا تھا کہ انہیں تکلیف نہ ہو...... تو بھائی لاہوری کوؤں کو جب یہ اطلاع پہنچی ہوگی کہ کراچی میں کوے ہلاک کیے جا رہے ہیں اور ان کی نسل کو ملیامیٹ کیا جا رہا ہے تو وہ خوفزدہ ہو گئے ہوں گے کہ کراچی کے بعد یہ قتل و غارت لاہور میں شروع ہو جائے گا۔ چنانچہ کوے سب کے سب فرار ہو گئے ہیں اپنی جان بچانے کی خاطر......"

"لیکن خلیفہ یہ تو بہت بڑا جرم ہے...... جنگلی حیات کے یہ کون اور کیسے ایکسپرٹ ہیں جو اپنے ہاتھوں سے جنگلی حیات کو فنا کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس نظام میں کوئی ایک جانور کوئی ایک کیڑا مکوڑا یا پرندہ بے جواز نہیں۔ وہ اپنی جگہ اس نظام کی سلامتی کے لیے بے حد اہم ہے۔ ماؤ کے زمانے میں زراعت کے ماہرین نے رپورٹ دی کہ ہر برس اتنے لاکھ ٹن گندم تو چڑیاں چگ جاتی ہیں۔ اگر انہیں ختم کر دیا جائے تو چین میں خوراک کی قلت پر قابو پایا جا سکتا ہے چنانچہ ماؤ کے کہنے پر پورا چین چڑیاں مارنے لگا اور ان کا صفایا کر دیا گیا۔ اگلے برس گندم پہلے سے بھی کم مقدار میں پیدا ہوئی۔ معلوم ہوا کہ جہاں چڑیاں دانے چگتی تھیں وہاں ایسے بیشمار کیڑے مکوڑے بھی کھا جاتی تھیں جو فصل کے دشمن ہوتے تھے۔ اس برس کیڑے مکوڑے پہلے سے کئی گنا بڑھ گئے اور انہوں نے چڑیوں سے بھی زیادہ گندم تباہ کر دی تو اسی طور کوے بھی ہمارے نظام حیات کے لیے اہم ہیں۔ نہ ہوتے تو انہیں کبھی پیدا نہ کیا جاتا۔"

"درست کہتے ہو۔ ہابیل اور قابیل والا قصہ ہی تمہارے سامنے ہے۔ یہ کوے ہی تھے جنہوں نے ایک کوے کو ہلاک کیا اور پھر اسے زمین میں دفن کر کے انسان کو یہ سکھایا کہ اپنے مردوں کو کیسے پیوند خاک کرتے ہیں۔ کوے کی اہمیت کی اس سے بڑی مثال کیا ہوگی۔"

"اور خلیفہ تم یہ بھی تو دیکھو کہ ہماری داستانیں اور لوک گیت اور محاورے کیا ہوں گے۔ میرے منڈیرے نہ بول جا کاگا...... کیسے گایا جائے گا۔ میں تمہیں آج سے کئی ہزار برس پہلے لکھی گئی ایک نظم سناتا ہوں جو دراوڑی زمانے سے متعلق ہے۔ ایک لڑکی کہتی ہے کہ اے کوے اگر تو خبر دے رہا ہے کہ آج کوئی مہمان آئے گا...... تو اگر وہ آئے جس کا میں

انتظار کر رہی ہوں تو میں تمہیں سفید چاولوں میں گھی اور شکر ڈال کر کھلاؤں گی اور تمہارے پاؤں میں چاندی کی جھانجریں ڈالوں گی۔"

"اسی لیے تو میں رنجیدہ ہوں کہ یہ کون سے ایکسپرٹ ہیں جو قدرت کے نظام کو بدلنا چاہتے ہیں۔ یقین مانو میں نے ابھی صرف ایک ہفتے سے کوئی کوا نہیں دیکھا اور میں ان کے لیے اداس ہوں۔ ہم کم از کم ان سے اتحاد اور یکجہتی کا سبق تو لے سکتے ہیں۔"

"اور خلیفہ...... تم یہ تو جانتے ہو گے کہ ہندوستان میں گدھ کم ہو گئے تھے تو وہاں ہر طرف گندگی اور عفونت سر اٹھانے لگی تھی۔ گدھ کو قدرت کا جمعدار کہا جاتا ہے کہ ہر شے کی صفائی کرتا جاتا ہے۔ کوے بھی تو یہی کام سرانجام دیتے ہیں۔ یوں بھی ہم کوؤں کے ساتھ زیادتی کرتے آئے ہیں۔ صرف اس لیے کہ ہمیں ان کی آواز اچھی نہیں لگتی تھی انہیں مطعون کرتے آئے ہیں۔ کبھی بھینس کی آواز سنی ہے...... ایک مرتبہ تو دل دہل جاتا ہے کہ یہ کیا بولا ہے تو کیا ہم صرف آواز کی خاطر پورے ملک کی بھینسیں ہلاک کر دیں۔ یقین کرو ایک بار میں نے دریائے سندھ میں سفر کرتے ہوئے ایک شام ہزاروں ہنسوں کو ایک ٹاپو پر اترتے دیکھا تھا اور ان کی آوازیں کوؤں سے بھی بھدی تھیں۔ مور کی آواز تو کانوں میں چھید ڈال دیتی ہے...... اور اگر تم کوے کو کبھی غور سے دیکھو تو کم پرندے اتنے سمارٹ اور چست ہوتے ہیں۔ اس کا سیاہ سرمئی رنگ بھی پرکشش ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ سترہ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک برف پوش درے پر خیمہ لگائے بیٹھا تھا اور سینکڑوں کوس تک کوئی ذی روح نہ تھا...... وہاں چار پانچ پہاڑی کوے کہیں سے آئے اور ہر طرف رونق ہو گئی۔ وہ مجھے اتنے پیارے لگے کہ میرے پاس اگر چوری ہوتی تو ان کو کھلاتا اور ان کے پاؤں میں چاندی کی جھانجریں باندھتا کہ انہوں نے میری تنہائی ختم کر دی تھی۔ بہرحال خلیفہ اب تم بتاؤ کہ کیا کریں؟"

"ہمیں کیا کرنا ہے۔ جو کرنا ہے ایکسپرٹ حضرات کو کرنا ہے...... لیکن ہم تو نور جہاں کا وہی گیت گاتے رہیں گے جو انہوں نے ایک کوے کی تعریف میں گایا تھا۔"

"کون سا گیت؟"

"وہی...... کالا شاہ کالا...... ساڈھا کالا ہے دلدار تے گوریاں نوں پراں کرو......"

طوطا جو دراصل طوطا نہیں تھا

ایک طویل عرصے سے میں نے اپنے نہایت مرغوب موضوع یعنی جانوروں اور پرندوں کے بارے میں کچھ نہیں لکھا...... کسی کالم میں کسی بھی شتر مرغ، مگر مچھ، ریچھ، گلہری یا کسی مرغابی کا ذکر نہیں کیا، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ معاشرے میں بیشتر انسان اپنی عادتوں اور خصلتوں میں ان جانوروں کے قریب ہوگئے ہیں یعنی کچھ شتر مرغ ہوگئے ہیں کہ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ سے منہ چھپانا چاہتے ہیں، کچھ مگر مچھ ہو چکے ہیں جو ہر شے ہڑپ کر جانے کے بعد اب مزے سے اپنے اپنے گوشۂ عافیت میں پڑے ہڑپ شدہ اشیاء کو ہضم کر رہے ہیں اور جبڑے کھولے ان دنوں کے انتظار میں ہیں جب وہ ایک مرتبہ پھر عوام کی بہبود کے لیے میدان میں آجائیں گے، کچھ ریچھ ہوگئے ہیں جنہوں نے عوام کو ایسے جپھا مارا ہوا ہے کہ انہیں سانس بھی لینے نہیں دیتے...... اور بہت سارے طوطے ہوگئے ہیں...... چنانچہ سچ مچ کے جانور اور پرندے پس منظر میں چلے گئے، یوں بھی ایک عرصے سے کسی جانور یا پرندے نے کوئی ایسا کارنامہ سرانجام نہیں دیا تھا کہ اس کے بارے میں کوئی کالم لکھا جا سکے لیکن خدا بھلا کرے ایک گرے افریقن طوطے کا جس نے اپنی خوبصورتی اور ذہانت سے مجھے اپنا گرویدہ کر لیا اور مجھے مجبور کر دیا کہ میں ایک مرتبہ پھر اپنے مرغوب موضوع کے بارے میں کچھ لکھ سکوں۔

یہ طوطا کہانی کچھ یوں ہے کہ میرے ایک دیرینہ دوست ہیں حکیم احمد علی شاہ...... ملنساری اور انکساری ایسی کہ راستے میں مل جائیں تو جاپانیوں کی طرح گردن نیچی کیے، آنکھیں جھکائے تا دیر کھڑے رہیں گے اور شرمندہ سے کھڑے رہیں گے...... موسیقی، تصوف، پرندے اور پودے ان کا عشق ہیں...... پچھلے دنوں ایک عرصے کے بعد لاہور میں

ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا، گھر کیا تھا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا...... ایک جانب بھینسیں بندھی ہوئی ہیں...... دوسری جانب مریضوں اور مریدوں کے لیے لنگر کھلا ہوا ہے...... برآمدوں میں بلیاں گھومتی ہیں...... کبوتروں کے لیے نہایت عمدہ کبوتر گھر ہیں اور پھر ہر جانب نایاب پودے اور شجر ہیں...... انگلستان گئے تو وہاں سے کچھ نہیں لائے سوائے کیکٹس یعنی تھوہر کی سینکڑوں نایاب اقسام کے...... تصوف میں ڈوبتے ہیں تو ڈوبے ہی رہتے ہیں اور برسوں بعد نظر آتے ہیں...... کلاسیکی موسیقی میں ایسا کن رس رکھتے ہیں کہ گوّیے سند لینے آتے ہیں اور ان میں رجب علی اور پرویز مہدی بھی شامل ہیں...... حکمت میں ایسے یکتا ہیں کہ ہمہ وقت امریکہ اور یورپ سے مریضوں کے فون آتے رہتے ہیں...... غرض کہ نہایت ہی دلچسپ چیز ہیں...... کھانے کے بعد کہنے لگے۔ ''تارڑ صاحب! طوطا دیکھیں گے؟''

''کیوں نہیں دیکھیں گے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''کوئی خاص طوطا ہے...... یعنی لمبی دُم والا رنگین آسٹریلین طوطا......''

''نہیں......'' ۔ ان کا سر جھکا رہا۔ ''سرمئی رنگ کا افریقی طوطا ہے...... آسٹریلین طوطے محض خوبصورت ہوتے ہیں لیکن بیوقوف ہوتے ہیں، یہ افریقن گرے نہایت عقلمند ہوتا ہے...... لاؤ بھئی طوطا......'' انہوں نے اسی طور نظریں جھکائے آہستہ سے کہا...... ایک ملازم فوراً طوطا لے کر حاضر ہو گیا...... پورے کا پورا سرمئی رنگ کا تھا صرف دُم کا ایک پر شوخ سرخ رنگ کا تھا...... طوطے کو اس کی خصوصی نشست پر بٹھا دیا گیا جہاں بیٹھتے ہی وہ سیب کھانے میں مشغول ہو گیا۔

''یہ ابھی بچہ ہے جب بڑا ہو جائے گا تو اس کی آنکھیں بالکل سفید ہو جائیں گی...... میرے پاس اس کا پورا شجرۂ نسب موجود ہے...... میرے ایک دوست انگلستان سے اس کے لیے خاص خوراک روانہ کر دیتے ہیں لیکن میں نے اسے آہستہ آہستہ پاکستانی خوراک کی عادت ڈال دی ہے...... حلوہ نہایت شوق سے کھاتا ہے اور مرچوں کے بغیر کوئی سالن نہیں کھاتا۔''

''تو یہ ایک عقلمند طوطا ہے؟'' میں نے شاہ صاحب سے دریافت کیا۔

''جی ہاں...... یہ دوسرے طوطوں سے بالکل مختلف ہے...... عام طوطے صرف

وہی فقرے دُہراتے ہیں جو انہوں نے رٹ رکھے ہوتے ہیں لیکن یہ اپنے فقرے بھی بنا لیتا ہے اور صرف وہی کچھ کہتا ہے جو سمجھتا بھی ہے ورنہ چپ رہتا ہے۔"

"شاہ جی پھر یہ طوطا تو نہ ہوا کچھ اور ہوا...... کیونکہ طوطے کا کام ہی یہی ہے کہ جو اسے سکھایا جائے' وہی بولتا چلا جائے...... آپ اپنے آس پاس دیکھئے ہر پارٹی کے لیڈران کرام جو کہتے ہیں' ان کے جاں نثار بس طوطوں کی طرح وہی دُہراتے چلے جاتے ہیں تو یہ کس قسم کا طوطا ہے؟"

"بس حضور یہ اسی قسم کا طوطا ہے...... آپ اسے کہیں کہ میاں مٹھو چوری کھانی ہے...... اگر کھانی ہوگی تو کہے گا کہ ہاں کھانی ہے ورنہ کہہ دے گا کہ نہیں کھانی...... کیونکہ جو کہتا ہے' وہ سوچ سمجھ کر کہتا ہے اور پھر جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ عقل رکھتا ہے...... آپ اس کے سامنے پنجرے کا دروازہ بند کریں تو آپ کو غور سے دیکھتا رہے گا اور پھر آپ کے جانے کے بعد آرام سے اسے کھول لے گا...... اس کے پاؤں میں زنجیر ڈالیں تو اس کی گرہیں کھول کر آزاد ہو جائے گا...... یہاں تک کہ چونچ نیچی کر کے اپنی خوراک نہیں کھاتا بلکہ اسے انسانوں کی مانند ایک پنجے میں پکڑ کر منہ تک لے جاتا ہے۔"

اور واقعی میں نے مشاہدہ کیا کہ ایک تو یہ خواہ مخواہ ٹیں نہیں کر رہا تھا اور نہ ہی اپنی نشست پر پنجوں سے پہلو بدلتا رقص کرتا تھا' بلکہ کمرے میں موجود تمام حاضرین کو باری باری نہایت غور سے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔

مجھے اس طوطے سے ڈر آنے لگا۔

میں نے موضوع بدلنے کی خاطر دبئی میں مقیم ایک پاکستانی تاجر کی سیامی بلی کا قصہ سنایا جو مالک کے غسل خانے میں جانے پر باہر بیٹھی رہتی تھی اور جب ایک روز وہ مقررہ وقت پر باہر نہ آیا تو اس نے غسل خانے کا دروازہ دھکیل کر کھولا تو مالک فرش پر بے ہوش پڑا تھا...... بلی نے فوراً بیڈ روم میں جا کر اس کی بیوی کو خبردار کیا اور میاؤں میاؤں کرتی اسے غسل خانے تک لے آئی...... ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اگر ذرا سی بھی تاخیر ہو جاتی تو مالک کی موت واقع ہو جاتی...... شکر گزار مالک نے صحت مند ہونے کے بعد ایک بیان میں کہا کہ "اس کی بلی نہایت اچھے مزاج کی ہے اور ہر صبح وہ اس کا منہ چاٹ چاٹ کر اسے بیدار کرتی ہے۔"

یہ قصہ سن کر شاہ صاحب تقریباً حالت وجد میں چلے گئے' دیر کے بعد بولے۔

"یقیناً بلی کو بھی اس کا ثواب ملے گا...... جانوروں اور پرندوں میں بھی انسانوں کی مانند اچھے اور برے ہوتے ہیں۔"

اس دوران گرے افریقن طوطے نے ایک "ٹیں" سی کی جو شاہ صاحب فوراً سمجھ گئے اور ملازم سے کہنے لگے۔ "سیب مانگ رہا ہے...... لا کر دو۔"

طوطے نے فوراً ایک اور ٹیں کی اور شاہ صاحب نے ملازم کو روک دیا۔ "نہیں نہیں! سیب نہیں مانگ رہا: ٹیلی ویژن دیکھنا چاہتا ہے...... ٹیلی ویژن لگا دو۔"

ملازم نے ٹیلی ویژن آن کیا تو طوطا حیرت انگیز طور پر شانت ہو گیا اور نہایت دھیان سے سکرین کو دیکھنے لگا...... کوئی پاپ سانگ چل رہا تھا اور موسیقی دھما دھم قسم کی تھی اور ہر دھم پر طوطا نروس ہو کر پھڑ پھڑاتا۔

"ایک تو ان بچوں نے اپنے گانوں سے طوطوں کو بھی پریشان کر دیا ہے...... چینل بدل دو۔" چینل بدلے گئے تو کسی غیر ملکی سٹیشن پر ایک انتہائی خوبصورت خاتون پتہ نہیں کیا باتیں کر رہی تھی...... طوطے نے اس چینل کو پسند کیا اور نہایت غور سے خاتون کو دیکھنے لگا۔

"تارڑ صاحب آپ کو طوطا پسند ہے......؟" شاہ صاحب نے اسی نیم مراقبے کی حالت میں استفسار کیا۔

"جی ہاں...... اس کا سرمئی رنگ تو کمال کا ہے اور سرخ دم...... واہ۔"

"تو لے جائیے۔" شاہ صاحب نے ہاتھ سے ادھر اشارہ کیا۔

"نہیں...... نہیں شکریہ شاہ صاحب......!"

"لے جائیے...... میرے پاس ایک چھوٹا بچہ بھی ہے...... اسی نسل کا۔"

"نہیں شاہ صاحب...... اس قسم کا عقلمند طوطا میرے گھر میں نہیں چل سکتا...... پتہ نہیں مجھ سے کیا کیا راز اگلوا لے اور بیگم کو بتا دے لیکن میری خواہش ہے کہ آپ اس طوطے کو قوم کے لیے وقف کر دیں۔"

"وہ کیسے......؟" شاہ صاحب متعجب ہوئے۔

"دیکھیں ایک تو اس میں یہ خوبی ہے کہ صرف وہی کچھ کہتا ہے: جو سمجھتا ہے ورنہ چپ رہتا ہے...... شکل اور سیرت بھی اچھی ہے...... عقلمند بھی ہے...... پنجرے کا دروازہ بھی کھول لیتا ہے اور وہ زنجیر جس کے ساتھ اسے باندھا جاتا ہے: اس پر غور کر کے اس کی گرہیں کھول کر آزاد بھی ہو جاتا ہے...... یہی خوبیاں ہمیں درکار ہیں اور آس پاس کسی لیڈر میں دکھائی نہیں دیتیں...... اسے کہئے کہ ایک سیاسی جماعت کے قیام کا اعلان کر دے اور میں پہلا شخص ہوں گا جو اسے لیڈر مان لوں گا۔"

گرے افریقن طوطے نے ٹیں ٹیں کرتے آسمان سر پر اٹھالیا۔

"یہ کیا کہتا ہے شاہ جی......؟"

"یہ کہتا ہے میں اپنی عاقبت خراب نہیں کرنا چاہتا...... مجھے طوطا ہی رہنے دو......!"

طوطا مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

بادشاہ کا حساب کمزور ہوتا ہے

"مجھے لطیفوں کا بڑا شوق ہے۔"

آج تک لطیفوں کے بارے میں جتنی بھی کتابیں چھپی ہیں میں نے سب پڑھی ہیں۔ اخباروں میں جو کارٹون چھپتے ہیں انہیں بھی نہایت اشتیاق سے دیکھتا ہوں کہ شاید ان میں کوئی کام کا لطیفہ نکل آئے۔ لطیفوں کے ہمراہ کبھی سیاست اور سیاستدانوں اور حکمرانوں کے بارے میں بھی کتابیں خرید لاتا ہوں اور انہیں بھی بڑے شوق سے پڑھتا ہوں اور وہ لطیفوں سے کم نہیں ہوتیں۔

انگریزی کا مزاحیہ پرچہ "پنچ" میرا پسندیدہ تھا۔ پھر وہ بند ہو گیا لیکن فوراً ہی ادبی اخبار شائع ہونے لگے جنہوں نے اس کی کمی پوری کر دی۔

میرے پاس اس وقت ڈاکٹروں، نرسوں، ادیبوں، سائنسدانوں، اداکاروں، فوجیوں اور شاعروں کے لطیفوں پر مبنی درجنوں کتابیں ہیں اور میں بڑے ذوق وشوق سے ان کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔

کمپیوٹر کے آنے سے میری موج ہو گئی ہے کیونکہ اس پر لطیفوں کا ایک خاص سیکشن ہے۔ میں نے اپنے بچوں اور رشتہ داروں کے بچوں کو بھی کہہ رکھا ہے کہ جب کبھی وہ کسی بچوں کے رسالے میں کوئی اچھا لطیفہ پڑھیں تو مجھے ضرور اور فوراً سنائیں چنانچہ سارا دن میرے فون کی گھنٹی بجتی رہتی ہے اور بچے مجھے لطیفے سناتے رہتے ہیں۔ مجھے کچھ کچھ شک ہے کہ اکثر بچے اور ان میں میرے تینوں بچے شامل ہیں مجھے مخبوط الحواس سمجھتے ہیں اور بعض اوقات عجیب اوٹ پٹانگ سے لطیفے گھڑ کر مجھے سنا دیتے ہیں جو مجھے سمجھ نہیں آتے لیکن میں ان پر ہنستا ہوں کہ کہیں وہ مجھے لطیفے سنانے نہ چھوڑ دیں۔

یہ نہیں کہ مجھے بچپن سے ہی لطیفوں کا شوق تھا...... ان دنوں تو میں بچوں کے رسائل میں شائع ہونے والے لطیفے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا...... یہ شوق اس عمر میں جا کر ہوا ہے اور ایسا ہوا ہے کہ پاگل پن کی حدوں کو چھونے لگا ہے۔ اس کا آغاز اخباروں کی سرخیوں سے ہوا۔ جی ہاں' یہ جو لیڈران کے بیان وغیرہ چھپتے رہتے ہیں ان سے ہوا کیونکہ مجھے ان پر ہنسی آنے لگی۔ پھر ٹیلی ویژن پر خبرنامہ دیکھتے ہوئے قہقہے لگانے لگا۔ یقین کیجئے اکثر خبریں مجھے ہنسنے پر مجبور کر دیتی تھیں۔ قومی رہنماؤں کے سنجیدہ اور غیر سنجیدہ چہرے دیکھ کر مجھ پر ہنسی کا دورہ پڑ جاتا اور گھر والے ٹیلی ویژن بند کر دیتے کہ کہیں میں ہنستے ہنستے انتقال نہ کر جاؤں۔ آہستہ آہستہ صورت حال کچھ یوں ہو گئی کہ میں اخبار صرف اس صورت میں پڑھتا تھا جب مجھے ہنسنے کی حاجت ہوتی تھی۔ ٹیلی ویژن پر خبرنامے کی ہیڈ لائنز میرے لیے قہقہے لگانے کا آسان ذریعہ تھیں۔

ہاں ایک اور بات کا میں اقرار کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے غور کیا کہ ہمارے مشاعرے میں معاف کیجئے گا معاشرے میں جو لوگ ہمہ وقت لطیفے سناتے رہتے ہیں اور کوئی کام نہیں کرتے' وہ بے حد کامیاب ہوتے ہیں۔ خاص طور پر ادب میں کامیابی کا ذریعہ ہی لطیفے تھے۔ کئی ادیب اور شاعر صرف لطیفے سنا سنا کر بلند درجات پر پہنچے اور اعلیٰ ملازمتوں پر فائز ہوئے۔ یہ ادیب کسی بھی محفل میں یا میٹنگ میں سب سے پہلے ایک لطیفہ سنا کر خود پہروں ہنستے رہتے اور سرخرو رہتے۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ اتنا لکھا پڑھا تب تک کسی کام نہیں آئے گا جب تک میں لطیفہ بازی میں ایکسپرٹ نہیں ہوں گا۔ چنانچہ میں خاص طور پر تازہ ترین لطیفے یاد کرتا۔ آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر سنانے کی مشق کرتا لیکن جونہی کسی محفل میں جا کر یہی لطیفے سناتا تو کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ بھول جاتا۔ یا تو لطیفے کا آغاز یاد نہ رہتا اور یا انجام دماغ سے نکل جاتا چنانچہ سخت سبکی ہوتی بلکہ ایک ادیب کے طور پر بھی میرا گراف نیچے آنے لگا۔ چونکہ میں ایک نہایت عقلمند شخص ہوں اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس کام کے لیے ہرگز موزوں نہیں ہوں اور اسے ترک کر دیا۔ لطیفہ گو شاعروں اور ادیبوں نے چونکہ شروع سے ہی اس پیشے کو اپنا لیا تھا اس لیے وہ اس میں ماہر ہو چکے تھے اور میں ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ لیکن مسئلہ یہ ہوا کہ اب مجھے لطیفے سننے اور پڑھنے کی لت

پڑ چکی تھی اور میں لطیفوں کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

میں نے شروع میں عرض کیا تھا ناں کہ میں نے بچہ لوگ کی ڈیوٹی لگا رکھی ہے کہ وہ جہاں کہیں کوئی عمدہ لطیفہ پڑھیں تو فوراً مجھ تک پہنچائیں۔ اگر لطیفہ اچھا ہوا تو میں انہیں انعام کے طور پر ایک ٹافی کھلاؤں گا۔ تو آج سویرے سویرے ایک بچہ آ گیا اور کہنے لگا کہ انکل میرے پاس ایک لطیفہ ہے۔

"زندہ باد"۔ میں نے خوش ہو کر اسے ایک تھپکی سے نوازا۔ "سناؤ...... ٹافی ملے گی۔"

"انکل میں یہ لطیفہ اس لیے آپ کو سنانا چاہتا ہوں کہ یہ لطیفہ نہیں ہے۔"

"کیا مطلب بچے۔ لطیفہ یا لطیفہ ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔"

"دراصل میں نے اسے بچوں کے ایک رسالے میں "ہنسی گھر" کے عنوان تلے پڑھا ہے۔ تو ہونا تو یہ لطیفہ چاہیے لیکن ہے نہیں۔"

"تم دانشوری جھاڑنے کی کوشش مت کرو بچے اور فوری طور پر لطیفہ سنا دو۔ پھر میں فیصلہ کروں گا کہ وہ لطیفہ ہوتا ہے یا نہیں...... سناؤ۔"

"انکل...... یہ لطیفہ کچھ یوں ہے کہ ایک بادشاہ شکار کھیل رہا تھا اور شکار کھیلتے کھیلتے وہ ایک گاؤں میں جا نکلا...... وہاں اس نے دیکھا کہ ایک بچہ منہ میں پنسل ڈالے اپنی کاپی پر سکول کا کام کر رہا ہے لیکن بے حد پریشان ہے۔ بادشاہ کو چونکہ بچے پسند تھے اس لیے وہ ٹھہر گیا اور اس سے پوچھا کہ اے بچے تم کیا کر رہے ہو...... بچے نے جواب دیا بادشاہ سلامت میں حساب کے سوال کر رہا ہوں...... بادشاہ نے پھر پوچھا کہ یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں لیکن تم اس قدر پریشان کیوں ہو...... بچہ کہنے لگا اس لیے کہ مجھ سے یہ سوال حل نہیں ہو رہا اور کل سکول میں ماسٹر صاحب میری پٹائی کریں گے۔ اس پر بادشاہ سلامت ہنسنے لگے اور کہنے لگے یہ تو کوئی پرابلم نہیں لاؤ میں حل کر دیتا ہوں۔ چنانچہ بادشاہ سلامت نے حساب کا سوال حل کر کے بچے کو دے دیا اور چلے گئے۔ کچھ دن بعد بادشاہ سلامت پھر وہاں سے گزرے تو وہ بچہ پھر پریشان بیٹھا تھا کہ آج بھی مجھ سے سوال حل نہیں ہو رہا۔ اس پر بادشاہ سلامت پھر ہنسے اور کہنے لگے یہ تو کوئی پرابلم نہیں لاؤ میں حل کر دیتا ہوں...... بچے نے فوراً کہا نہ جی نہ پچھلی بار آپ نے جو سوال حل کر کے دیا تھا وہ بالکل غلط تھا اور مجھے ماسٹر صاحب نے بہت

مارا..... اب کبھی آپ سے سوال حل نہیں کراؤں گا.....'' بچہ یہاں آ کر چپ ہو گیا.....

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''بس یہی لطیفہ ہے۔''

''یہ تو کوئی لطیفہ نہیں۔''

''میں بھی تو یہی کہتا ہوں کہ یہ لطیفہ نہیں۔''

''تم کس بنیاد پر کہتے ہو کہ یہ لطیفہ نہیں؟''

''انکل جس لطیفے میں حقائق ہوں وہ لطیفہ نہیں ہوتا..... بادشاہوں کا حساب ہمیشہ کمزور ہوتا ہے..... یہ حقیقت ہے..... بیوقوفی تو بچے کی ہے جس نے یہ سمجھا کہ بادشاہ اس کا سوال حل کر دے گا.....''

''بھئی اگر ایک بادشاہ کہے کہ میں تمہارے سوال حل کر دوں گا..... تمہیں ایشین ٹائیگر بنا دوں گا تو آپ انکار تو نہیں کر سکتے۔''

''نہیں..... لیکن وہ بچہ اتنا بیوقوف بھی نہیں تھا کیونکہ اس نے دوسری بار بادشاہ کی پیشکش قبول نہیں کی کیونکہ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ بادشاہ کا حساب کمزور ہے۔''

''کیا ہر بادشاہ کا حساب کمزور ہوتا ہے؟''

''بچے یہ پرانے زمانے کی باتیں ہیں جب بادشاہ کا حساب کمزور ہوا کرتا تھا..... تم دیکھو کہ ہمارے بادشاہوں کا حساب کمزور نہیں تھا..... ایوب خان نے کتنے اچھے سوال حل کیے اگرچہ جمہوریت کا اور مشرقی پاکستان کا سوال غلط کر دیا..... ضیاء الحق نے کیسے کمال دکھائے اور ایسا حساب کیا کہ دس برس تک اسلام کا نفاذ ہوتا رہا..... بینظیر اور نواز شریف تو حساب کتاب میں مصروف رہے اگرچہ یہ ان کا ذاتی حساب کتاب تھا جس کا کوئی حساب نہ تھا..... اب جنرل صاحب نے میاں صاحب کے پورے خاندان کو بخش دیا ہے تو کیا ان کا حساب کمزور ہے.....''

''انکل یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں لیکن آپ یہ بتائیں کہ جب آپ جان چکے ہیں کہ بادشاہوں کو وہ حساب نہیں آتا جس کی مدد سے وہ آپ کے سوال حل کریں تو اس کے باوجود آپ کیوں ہر بار انہی سے اپنے سوال حل کروانے کی امید رکھتے ہیں۔''

عبداللہ حسین اور دوسری شادی

موسم سرما کی پہلی بارش کے فوراً بعد ناول نگار عبداللہ حسین نے مجھ سے پوچھا۔

''یار تم نے کبھی دوسری شادی کے بارے میں سوچا ہے؟''

''خدا کے لیے خان صاحب آہستہ بولیے میری بیگم نے سن لیا تو قیامت کھڑی کر دے گی..... وہ تو مجھے دوسری آئس کریم نہیں کھانے دیتی' دوسری شادی کرنے کی اجازت کہاں دے گی..... وہ کہتی ہے یہ دونوں چیزیں تمہاری صحت کے لیے انتہائی مضر ہیں..... تم ٹھنڈے گرم ہو جاؤ گے۔''

''بھئی میں نے صرف یہ پوچھا ہے کہ تم نے کبھی دوسری شادی کے بارے میں سوچا ہے یہ تو نہیں پوچھا کہ تمہاری بیگم اس کی اجازت دے گی یا نہیں.....''

''ویسے آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''اس لیے کہ میرے آس پاس بہت سے لوگ جو میری عمر کے ہیں' دوسری شادی کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔''

''میں تو آپ کی عمر کا نہیں ہوں۔''

''بھئی نو دس برس کا فرق دوستوں کے درمیان کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔''

''آپ نے ساری زندگی ایک ہی شادی پر اکتفا کیا ہے یعنی جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے تو اب آپ دوسری شادی کے بارے میں کیوں سوچ رہے ہیں؟''

عبداللہ حسین نے اپنے بجھے ہوئے پائپ کے تمباکو کو ایک چمٹی سے کچوکے دے کر سلگنے پر مجبور کر دیا اور ایک لمبا کش لگا کر بولے۔ ''پاکستانی ادیبوں کی یہی تو مصیبت ہے کہ وہ غور نہیں کرتے..... ٹھنڈے دل سے صورت حال کا تجزیہ نہیں کرتے اسی لیے یہاں

ناول کم لکھے جاتے ہیں۔"

"خان جی واقعی آپ سترے بہترے ہونے کو ہیں بھلا دوسری شادی کا پاکستان میں ناول نہ لکھے جانے سے کیا تعلق ہے؟"

"جناب عالی......"۔ انہوں نے اپنا پسندیدہ تکیہ کلام پہلی بار استعمال کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ اب وہ بحث کرنے کے موڈ میں ہیں۔ "میں نے یہ بھی نہیں کہا کہ میں دوسری شادی کے بارے میں سوچ رہا ہوں اور نہ ہی یہ پوچھا ہے کہ تمہاری بیگم تمہیں اجازت دے گی یا نہیں...... میں نے صرف اور صرف یہ پوچھا ہے کہ اس بارے میں تمہارا کیا خیال ہے...... کیا میں اپنا بیان اور سوال دُہرا دوں؟"

"نہیں نہیں میں سمجھ گیا لیکن پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ کے آس پاس جو لوگ ہیں اور آپ کی عمر کے ہیں، وہ کیوں دوسری شادی کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں؟"

"اس لیے کہ وہ ریٹائر ہو چکے ہیں...... میرے سکول فیلوز کا ایک گروپ ہے اور ہم لوگ ہر ہفتے اکٹھے ہو کر گپیں مارتے ہیں اور وہاں کہیں نہ کہیں سے دوسری شادی کا مسئلہ سامنے آ جاتا ہے...... چونکہ یہ سکول فیلوز اب زندگی سے بالکل فارغ ہیں...... کچھ بیویوں سے بھی فارغ ہیں...... اولاد کو پڑھا لکھا کے بیاہ چکے ہیں اور اب پوتے پوتیاں کھلاتے ہیں اور انہیں شدید احساس ہے کہ وہ ناکارہ ہو چکے ہیں اس لیے دوسری شادی کے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔"

"لیکن خان صاحب...... اگر وہ ہر جانب سے ناکارہ ہو چکے ہیں تو دوسری شادی کرنے پر کارآمد کس طرح ہو جائیں گے...... یوں بھی نئی بیگم کارآمد ہوگی اور وہ بالکل ناکارہ تو شرمندگی نہیں ہوگی؟"

"تم مسئلے کا نفسیاتی پہلو نہیں سمجھ رہے...... ایک امریکی فلم آئی تھی "ڈیڈ مین واکنگ" یعنی مردہ شخص چل رہا ہے...... اس میں دکھایا گیا تھا کہ جب ایک شخص کو سزائے موت دینے کے لیے اسے بجلی کی کرسی کی طرف لے جایا جا رہا ہوتا ہے تو جیل کے عملے کا ایک شخص بلند آواز میں اعلان کرتا جاتا ہے کہ ڈیڈ مین واکنگ...... ڈیڈ مین واکنگ...... یعنی وہ شخص اگرچہ ابھی زندہ ہے لیکن چونکہ اس نے ہر صورت چند لمحوں بعد مردہ ہو جانا ہے اس لیے وہ

ایک مردہ شخص ہے جو چل رہا ہے۔"

"اتنی خوشگوار گفتگو چل رہی تھی، دوسری شادی کے بارے میں اس میں یہ ہولناک مردہ شخص کہاں سے چلتا آ گیا؟"

"یہ اس طرح آ گیا کہ میں اپنے سکول فیلوز سے جب بھی ملتا ہوں تو ان کی ناکارہ اور ریٹائرڈ شدہ زندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے کہتا ہوں اور قہقہہ لگا کر کہتا ہوں...... دیکھو ڈیڈ مین واکنگ......"

"آپ بھی تو انہی کی عمر کے ہیں تو ان بیچاروں نے کیا قصور کیا ہے کہ وہ ڈیڈ مین واکنگ ہو گئے ہیں؟"

"اب تم معاملے کی گہرائی تک پہنچے ہو۔" عبداللہ حسین نے اپنا خصوصی رُکتا ہوا قہقہہ لگا کر خوشی کا اظہار کیا۔ "بھئی یہ تمام لوگ یعنی ہمارے دوست اور کلاس فیلوز جب اونچے اونچے انتظامی اور سیاسی عہدوں پر براجمان تھے تو ہم لکھنے والوں کو چشم حقارت سے دیکھتے تھے کہ یہ لکھنے پڑھنے میں زندگی ضائع کر رہے ہیں...... اب یہ ریٹائر ہو کر موت کے منتظر ہیں لیکن ہم یعنی ادیب لوگ بدستور تخلیقی کاموں میں مشغول ہیں اور ریٹائر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...... کیا یہ خوبصورت بات نہیں کہ معاشرے کا تقریباً ہر فرد ساٹھ برس کے بعد ناکارہ قرار دے دیا جاتا ہے اور ہم پہلے سے بھی زیادہ کارآمد ہو جاتے ہیں اور کبھی ریٹائرڈ نہیں ہوتے...... اسی لیے ہم اب انہیں چشم حقارت سے دیکھتے ہیں اور میں انہیں چھیڑنے کی خاطر ڈیڈ مین واکنگ کہتا ہوں۔"

"بات تو دوسری شادی سے شروع ہوئی تھی۔"

"ہاں......" خان صاحب نے اپنی بھوری فرنچ کٹ داڑھی کو سنوارا۔ "چونکہ ان لوگوں کی زندگی میں اب کوئی مقصد نہیں رہا، اس لیے ان کا پسندیدہ ترین موضوع دوسری شادی ہے اور اس کے جواز میں وہ بڑے فخر سے سینہ بمشکل پُھلا کر کہتے ہیں کہ مرد اور گھوڑا کبھی بوڑھے نہیں ہوتے... کیسا احمقانہ جواز ہے...... انہوں نے شاید کبھی بوڑھا گھوڑا نہیں دیکھا اس لیے کہ گھوڑا بوڑھا ہونے لگتا ہے تو اسے گولی مار دی جاتی ہے...... مرد بھی اُسی صورت میں بوڑھا نہیں ہوگا، اگر اسے بھی گولی مار دی جائے۔"

''خان صاحب! آخرانسان اور گھوڑے میں کچھ فرق ہونا چاہیے۔''

''یہی تو فرق ہے کہ گھوڑا اگر بوڑھا ہو جائے تو بھی دوسری گھوڑی کے بارے میں نہیں سوچتا اور دیگر گھوڑا جات کو یہ نہیں کہتا کہ گھوڑا اور مرد کبھی بوڑھے نہیں ہوتے جبکہ مرد اس احمقانہ جواز کو ڈھال بنا کر صرف اس لیے دوسری شادی کے چکر میں رہتے ہیں تا کہ یہ ثابت کر سکیں کہ ابھی تو میں جوان ہوں...... پہلے تو میرے بوڑھے کلاس فیلوز بہت زیادہ سنجیدہ نہیں تھے لیکن پنوعاقل یا اسی قسم کے ایک قصبے سے ملنے والی ایک اخباری خبر نے انہیں پھر سے چلبلا اور نٹ کھٹ کر دیا ہے۔ وہاں یعنی پنوعاقل قسم کے کسی قصبے میں ایک چھیاسی برس کے بابا جی نے ایک نوجوان خاتون سے شادی رچالی ہے...... بابا جی کے ظاہر ہے پوتے پوتیاں بھی جوان ہیں انہوں نے شادی کے فوراً بعد پابندی لگا دی کہ ان میں کوئی بھی انہیں دادا جی نہ پکارے بلکہ صرف ابا جی کہے اور نئی نویلی دلہن کو ہرگز دادی جان نہیں کہنا بلکہ باجی جی کہنا ہے...... شادی کے دوسرے دن دلہن نے اپنے دولہا سے یعنی بابا جی سے فرمائش کی کہ وہ اسے سائیکل پر بٹھا کر سیر کرائیں چنانچہ بابا جی نے سپورٹس مین سپرٹ کا مظاہرہ کیا اور اپنی دلہن کو سائیکل پر بٹھا کر پورے قصبے کا چکر لگایا...... دلہن کی اس فرمائش میں شاید بابا جی کی جسمانی صحت کا امتحان لینا مقصود تھا کیونکہ نوجوان شخص بھی ایک اور بندے کو سائیکل پر بٹھا کر سیر کروائے تو اس کا سانس پھول جاتا ہے لیکن بابا جی اس امتحان میں سرخرو ہوئے البتہ گھر واپس آئے تو ایک بدتمیز پوتے نے تالیاں بجاتے ہوئے کہا آ ہا جی دادا بھی آ گئے...... اس پر بابا جی نے اس معصوم بچے کو خوب پھینٹی لگائی...... یہ خبر پڑھ کر میرے پینسٹھ اور ستر سالہ کلاس فیلوز میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے کہ بابا جی کی نسبت ابھی تو وہ جوان ہیں اور دوسری شادی کر سکتے ہیں...... اسی لیے میں نے تم سے دریافت کیا تھا کہ کیا تم نے کبھی دوسری شادی کے بارے میں سوچا ہے؟''

''پہلے تو نہیں سوچا تھا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''لیکن یہ خبر سن کر مجھ میں بھی امنگیں جوان ہونے لگی ہیں کہ میں تو ان بابا جی سے درجنوں برس چھوٹا ہوں لیکن میں بھی اگر زندہ رہا تو چھیاسی برس کی عمر میں بہرصورت دوسری شادی کرلوں گا اور شادی کے بعد دلہن کو نہیں کہوں گا کہ بہ جا سیکل تے کہ میں تو اس عمر میں دوسرے بندے کو بٹھا کر سائیکل نہیں چلا سکتا تو اس عمر میں پوتے پوتیاں ہی مجھے اٹھا کر اس پر بٹھائیں گے اور میں اپنی نئی نویلی دلہن سے کہوں گا کہ بیٹی میرا مطلب ہے بیوی! اب تم مجھے سیر کرواؤ اور کسی قبرستان کے اردگرد ہی سائیکل چلانا تا کہ شادیٔ مرگ کی صورت میں آسانی رہے۔

■■■■■■■■

ہائے میں تیرا بندر ہوتا

یہ نہیں کہ میں شاعری کے خلاف ہوں...... یا شاعروں کو ناپسند کرتا ہوں......
میں تو نظم کا عاشق ہوں' غزل کا گرویدہ ہوں...... شہر آشوب پر جان دیتا ہوں...... مسدس' مثنوی' قصیدہ' مرثیہ کا معترف ہوں......

لیکن اس حسد کا کیا کروں جو میرے دل میں شاعروں کے لیے پکتا ہے...... اس کینے کا کیا کروں جو مجھے چین نہیں لینے دیتا...... شاعروں سے اور مشاعروں سے بغض رکھتا ہوں صرف اس لیے کہ میں نثر نگار ہوں اور مجھے کوئی پوچھتا نہیں...... یقین کیجئے میں نے شاعر بننے اور شعر کہنے کی بے حد کوشش کی ہے لیکن میرے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ دراصل یہ احساس محرومی ہے جو مجھے ایک پل چین نہیں لینے دیتا...... اس جلتی پر تیل ایک میرے قریبی عزیز نے چھڑکا یعنی مجھے ایک صبح جب میں نے ابھی ہاتھ منہ بھی نہیں دھویا تھا' اطلاع ملی کہ برخوردار اس ملک کے مشہور شاعر ہو چکے ہیں اور پچھلے چھ سات ماہ میں ان کے بیس کے قریب شاعری کے مجموعے چھپ چکے ہیں نہ صرف چھپ چکے ہیں بلکہ ان کے متعدد ایڈیشن فروخت ہو چکے ہیں...... میں نے سوچا میں اگرچہ اس برخوردار کا بزرگ ہوں لیکن دانش بچوں سے بھی تو حاصل کی جا سکتی ہے' ہو سکتا ہے' میں اس برخوردار کی رہنمائی میں شاعر بن سکوں اور شہرت دوام حاصل کر لوں چنانچہ میں اس برخوردار کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا مدعا بیان کیا...... برخوردار اس وقت اپنی کلیات کے پروف دیکھ رہا تھا' اس نے میرا مدعا سن کر بڑے اہتمام سے تبسم کیا اور کہنے لگا۔ ''چاچا جی! اب آپ شاعری نہیں کر سکتے...... شاعری کے لیے نوجوان ہونا ضروری ہے...... خواب دیکھنا ضروری ہے' خواب سمجھتے ہیں ناں آپ! آپ کو تو اس عمر میں نیند ہی نہیں آتی ہوگی' خواب کہاں سے دیکھیں گے۔''

''برخوردار میں خواب آور گولیاں کھا لوں گا تب تو خواب آ جائیں گے ناں...... خوابوں کا بندوبست ہو جائے گا' تم بقیہ رہنمائی کا فریضہ سرانجام دو...... سب سے پہلے مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

برخوردار اٹھ کر گھر کے اندر گیا اور ایک بچوں کی پرام میں اپنے مجموعے لادے اسے دھکیلتا واپس آ گیا...... ان میں سے ایک مجموعے کو میرے سامنے رکھا اور کہنے لگا۔

''چاچا جی! پہلے آپ اس قسم کی ایک تصویر اتروائیں۔''

مجموعے کے سرورق پر برخوردار کی ایک رنگین تصویر تھی جس میں وہ نہایت اداس شکل بنائے' ایک آنکھ سے آنسو ٹپکاتا آسمان کی جانب دیکھ رہا تھا اور اس کے پورے چہرے میں کانٹے کھبے ہوئے تھے جن میں سے خون ٹپکتا تھا...... مجموعے کا عنوان تھا۔

''کاش میں تیرا کانٹا ہوتا''۔

''ٹھیک ہے' میں اس قسم کی تصویر اتروا لوں گا۔''

''ٹھیک ہے سر...... لیکن اپنے بال باقاعدہ رنگ لیجئے گا...... بہتر ہوگا کہ وگ پہن کر تصویر اتروائیں' سرورق کی یہ تصویر ہی آپ کی شاعری کی ضامن ہوگی...... اس میں اداس دکھائی دینا بے حد اہم ہے...... اس کے بعد آپ اپنے مجموعے کا نام رکھ لیں۔''

''برخوردار شاعری تو ابھی کی نہیں تو نام کیسے رکھ لوں؟''

''یہی تو گر ہے چاچا جی......! مجموعے کا نام پہلے رکھا جاتا ہے اور پھر اسے ذہن میں رکھ کر شاعری کی جاتی ہے۔''

''چلو میں اپنی شاعری کے مجموعے کا نام ''عشق رواں'' یا ''آبلہ پا'' رکھ لوں گا۔''

''نہیں بزرگو! اس قسم کے ناموں والی شاعری نہیں چلتی...... نام اداس کر دینے والا ہونا چاہیے مثلاً ''اداسی تو دفع کیوں نہیں ہوتی''۔ ''آ جدائی گلے لگ جا''۔ ''نہ تم آئے نہ شام آئی''۔ ''تم سے ملنے کے بعد''۔ ''کب ملو گی؟''۔ ''کیوں ملو گی؟''۔ ''پیاسے پنچھی کی پکار''۔ ''تم کہاں ہو کہاں ہو؟'' وغیرہ وغیرہ۔''

''ٹھیک ہے میں شاعر بننے کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار ہوں لیکن کیا کروں بے حد کند ذہن واقع ہوا ہوں' اس قسم کے نام سوجھتے نہیں' تم کچھ مدد کرو۔''

''دیکھیں سر! نام اپنے اپنے...... اس سلسلے میں، میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا......نام تو دل سے نکلنا چاہیے جہاں سے بعد میں آپ نے شاعری نکالنی ہے......نہ نکلے تب بھی نکالنی ہے...... ویسے آپ میرے سینئر ہیں اس لیے تھوڑا سا اشارہ دیتا ہوں جو آپ کے عقلمند ہونے کی صورت میں کافی ہوگا...... اشارہ یہ ہے کہ میں نے اپنا ٹریڈ مارک ''کاش'' رکھا ہوا ہے چنانچہ میرے تمام شعری مجموعوں کے ناموں کا آغاز ''کاش'' سے ہوتا ہے...... مثلاً ''کاش تم سے پیار ہو جائے''۔ ''کاش میں تیرے جوڑے کا پھول ہوتا''۔ ''کاش موسم سہانا ہو جائے''۔ ''کاش میں تیری جھانجر ہوتا'' وغیرہ وغیرہ۔''

''بہت خوب......''میں بے حد متاثر ہوا۔ ''نام رکھا اور پھر نام کو سامنے رکھا اور شاعری شروع کر دی۔''

''درست......''اس نے متانت سے سر ہلایا۔ ''مثلاً میرے مجموعے ''کاش میں تیری جھانجر ہوتا'' کی پہلی نظم بھی اسی عنوان کی ہے...... آپ کو سناتا ہوں...... سناؤں؟''

''ارشاد......''

عرض کرتا ہوں کہ......

کاش میں تیری جھانجر ہوتا
جھن جھنا جھن جھانجر ہوتا
تیرے پاؤں چھوتا دھو دھو کر پیتا
تیرے ٹخنوں سے لپٹ کر روتا
پھر جو ہوتا سو ہوتا تجھے نہ کھوتا
تیرے ٹخنے پہ موچ آ جاتی تو......
اس پرلب رکھتا تجھے آرام آ جاتا
کاش میں تیری جھانجر ہوتا

''سبحان اللہ! برخوردار...... نہایت انوکھی اور ٹخنہ گداز شاعری ہے لیکن مجھے خیال آتا ہے کہ مجید امجد کی ایک نظم ''بندہ'' کا آغاز بھی اسی طرح ہوتا ہے کہ ''کاش میں تیرے بن گوش میں بندہ ہوتا۔''

''یہ مجید امجد کون ہے......؟''

''سوری برخوردار...... پتہ نہیں کون ہے تم اپنا ہدایت نامہ شاعری جاری رکھو۔''

''ہاں مجھے اب یاد آیا ایک سٹوڈنٹ آیا تھا ٹوبہ ٹیک سنگھ سے میرے پاس...... مجھ سے بے حد متاثر تھا...... شاید اسی نام کا تھا...... یہ نظم اسی نے میری پیروی میں لکھی ہوگی...... میں اسے آج ہی قانونی نوٹس بھجواتا ہوں۔'' برخوردار غصے میں تھا۔

''چلو چھوڑو ان چھوٹے موٹے شاعروں کو......''میں نے معذرت طلب لہجے میں کہا۔ ''صرف نام رکھنے میں میری مدد کرو...... ''کاش'' تو تم الاٹ کروا چکے، باقی کیا رہ گیا ہے۔''

''باقی ''ہائے'' رہ گیا ہے...... اگر ''کاش'' میرا ٹریڈ مارک نہ ہوتا تو میں یقیناً اپنے مجموعوں کے ناموں کا آغاز ''ہائے'' سے کرتا...... چلیے آپ بھی کیا یاد کریں گے...... یہ ''ہائے'' آپ لے لیجیے۔''

''بہت بہت شکریہ!''میں برخوردار کی دریا دلی سے بے حد متاثر ہوا بلکہ باقاعدہ آنکھوں میں نمی آ گئی......''میں تمہارا احسان مند ہوں کہ تم نے مجھے اپنا ''ہائے'' دے دیا...... بلکہ فوری طور پر ایک نام بھی ذہن میں آ گیا ہے...... تم پسند کرو گے تو اپنے پہلے مجموعے کا یہی نام رکھوں گا...... اگر تم پسند کرو گے تو......''

''بتائیں...... میں دیکھتا ہوں کہ کیسا نام ہے جس کا آغاز ''ہائے'' سے ہوگا۔''

''نام ہے ''ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا'' کیسا ہے؟''

''یہ کیسا نام ہے بزرگو!'' برخوردار گرمی کھا گیا۔ ''یہ زود کیا ہوتا ہے اور پریشاں کیا ہوتا ہے...... یوں بھی ایک ہی مصرعے میں دو مرتبہ پریشان آیا ہے۔''

''پریشان تو نہیں پشیمان آیا ہے''۔ میں نے انتہائی شرمندگی سے سر کھجایا۔ ''ویسے غالب نے کہا تھا۔''

''یہ غالب کون ہے...... میں نے یہ نام ویسے پہلے بھی سن رکھا ہے...... ہاں ہاں وہی غالب ہے یاد آ گیا جو بندر روڈ پر رہتا تھا اور کہتا تھا کہ عشق کی کیا بات ہے غالب...... یہ وہ بات ہے کہ بجھائے نہ بنے۔''

"بالکل درست...... آپ کے وسیع مطالعے کی داد دیتا ہوں برخوردار...... تو یہ نام مناسب نہیں۔"

"ہرگز نہیں...... آپ ایسا کریں کہ دو چار دن اس "ہائے" کے مشورے پر غور کریں' عنوان سوچیں پھر میرے پاس مشورے کے لیے آجائیں...... میں ذرا اپنی کلیات کے پروف دیکھ رہا ہوں اور مصروف ہوں...... خدا حافظ...... اور ہاں آپ میرے مشورے پر عمل کریں گے تو دنوں میں مشہور ہو جائیں گے اور آپ کی شاعری اتنی فروخت ہوگی کہ اس کی رائلٹی سے آپ ایک اور شادی بھی کر لیں گے۔"

چنانچہ یہ قیمتی "ہائے" وصول کر کے میں خیر سے گھر کو لوٹا...... دو چار دن غور کیا اور پھر اس نتیجے پر پہنچا کہ میرے پہلے مجموعے کا عنوان "ہائے میں تیرا بندر ہوتا" ہوگا اور میں اس عنوان کی ایک نظم بھی لکھ چکا ہوں جو ایوانِ شاعری میں تہلکہ مچا دے گی...... ملاحظہ کیجئے۔

ہائے میں تیرا بندر ہوتا
مچھندر نہ ہوتا صرف تیرا بندر ہوتا
تیرا بندر نہ ہو سکتا تو تیرا قلندر ہوتا
لیکن میں کیوں نہ تیرا بندر ہوتا
میں نہ ہوتا تو اور کون اتنا احمق ہے کہ
تیرا بندر ہوتا......
تو دھوپ میں بیٹھی میری شاعری پڑھتی
اور میں...... تیرے بالوں سے جوئیں نکالتا
ہتھیلی بڑھاتی تو میں اس پر......
اپنا دل رکھ دیتا اور اک جوں رکھ دیتا
ہائے میں تیرا بندر ہوتا

فُوڈ سٹریٹ اور میوزک سٹریٹ

خلیفہ خلفشاری سدا کے قنوطی اور بیزار اب کی بار آئے تو نہایت کھلے ہوئے اور مسکراتے ہوئے آئے...... آئے اور ہاتھ آگے کر دیا۔ "مبارک ہو۔"

"خیر مبارک......" میں ذرا حیران ہوا کہ گزشتہ عید کو تو عرصہ ہو گیا ہے اور آئندہ عید ابھی بہت دُور ہے تو مبارک کس چیز کی دے رہے ہیں۔

"مٹھائی کھلاؤ۔" انہوں نے آرڈر دیا......

"کیوں...... میرے گھر لڑکا ہوا ہے کیا؟" میں نے لاہوریوں کا خاص جواب دیا......

وہ بدستور مسکراتے رہے۔ "یار مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے کہ تم نے زندگی میں پہلی بار دانش مندی کا مظاہرہ کیا ہے......"

چونکہ میں نے تو دانشمندی کا کوئی بھی مظاہرہ نہیں کیا تھا' اس لیے میں نے خلیفہ کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "خلیفہ یہ تمہاری پرانی عادت ہے کہ وقت ضائع کئے بغیر کوئی بھی بات نہیں کرتے...... چکر دیتے رہتے ہو اور پھر معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کوئی طنز کا تیر چھپا رکھا ہے جسے چلانے کی خاطر اتنی لمبی تمہید باندھی گئی ہے...... تو خلیفہ تیر پہ تیر چلاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے...... سیدھی طرح بتا دو کہ مبارکباد کس سلسلے میں دے رہے ہو؟"

"تم نے ہمیشہ میری نیت پر شبہ کیا ہے...... میرے خلوص کو ریاکاری سمجھا ہے اور میری محبت کی قدر نہیں کی۔" خلیفہ باقاعدہ روہانسا ہو گیا۔ "میں تہہ دل سے تمہیں مبارکباد دینے آیا تھا اور تم مجھ پر شک کر رہے ہو...... لعنت ہے ایسی دوستی پر...... چلو چھوڑو کوئی اور بات کرتے ہیں۔"

''خلیفہ......'' میں غصے میں آ گیا۔ ''یہ بھی تمہارے تاخیری حربے ہیں...... اب میرے دل میں کُھد بُد ہو رہی ہے...... تم فوراً بتاؤ کہ کس بات کی مبارکباد......''

''بھئی مجھے اطلاع ملی ہے کہ بالآخر تم نے یہ لکھنے لکھانے کا بے مقصد شغل ترک کر دیا ہے اور اگلے ہفتے سے گوالمنڈی کی فوڈ سٹریٹ میں سری پائے اور گول گپّوں کی دکان کھول رہے ہو...... یہ بہت مناسب فیصلہ ہے اور میں دل سے خوش ہوں کہ اب تمہارے دن بھی پھر جائیں گے اور اس لیے مبارکباد دے رہا تھا......''

''تمہیں کس نے بتایا ہے؟''

''بھولے ریڑھی والے نے اور پچی پان فروش نے...... کیا غلط کہتے ہیں؟''

''ہاں...... نہیں...... بلکہ'' میں گڑبڑا گیا......

''تم بھی اب چکر مت دو سیدھی طرح بتاؤ کہ تم سری پائے اور گول گپّوں کی دکان کھول رہے ہو یا نہیں؟''

''وہ...... دراصل'' میں نے ذرا شرمندہ ہو کر کہا۔ ''وہ تو یونہی......''

''یونہی کیا...... میں کہتا ہوں بہت بجو گے سری پائے کے دیگچے میں ڈوئی چلاتے ہوئے...... فوراً بسم اللہ کرو۔''

''یار میں پورا قصہ بیان کرتا ہوں خلیفہ......''

اب اقبالِ جرم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

''دراصل چند روز بیشتر بھولا اور پچی میرے پاس آئے۔ کہنے لگے باؤ جی یہ جو نئی فوڈ سٹریٹ بنی ہے وہاں تو دولت برس رہی ہے...... دنیا ٹوٹ پڑتی ہے...... لیڈیاں آتی ہیں، گورے آتے ہیں اور جو الا بلا کھلا دو کھا کر ڈگنے پیسے دے کر چلے جاتے ہیں...... اب ہماری بدقسمتی کہ جہاں ہم کاروبار کرتے ہیں یہ فوڈ سٹریٹ وہاں سے چار پانچ گز پرے سے شروع ہوتی ہے...... ہمارے پاس کوئی آتا ہی نہیں...... فوڈ سٹریٹ میں ہمیں کوئی گھسنے نہیں دیتا۔ چھوٹے سے خوانچے کا روزانہ دو سو روپے بھتہ لیتے ہیں تو آپ کوئی سفارش کرو کہ ہم بھی فوڈ سٹریٹ میں داخل ہو جائیں...... بس اتنی سی بات تھی......''

''جو میں پوچھ رہا ہوں اس بات کا تو سارے فسانے میں ذکر نہیں...... تم سری پائے

کی دُکان کھول رہے ہو یا نہیں......''

''کھول رہا ہوں......'' میں نے بھڑک کر کہا۔ ''تم نے جو کرنا ہے کر لو......''

''یار تحمل سے بات کرو...... میں اس کاروباری پروجیکٹ میں تمہارا ساتھ دوں گا......''

''خلیفہ...... تم تو جانتے ہی ہو کہ میں ایک عرصہ گوالمنڈی کے علاقے میں کاروبار کرتا رہا ہوں اور وہاں ایک چھوٹی سی پراپرٹی بھی ہے اگرچہ وہ بھی فوڈ سٹریٹ سے چند گز اِدھر ہے تو میں سوچ رہا تھا کہ...... اسے ٹھکانے لگا کر فوڈ سٹریٹ میں کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کر لوں...... تم جانتے ہو کہ گوالمنڈی کہتے ہوئے ذرا شرم محسوس ہوتی ہے لیکن فوڈ سٹریٹ کہیں تو آپ فوراً جدید ترین اور معزز ہو جاتے ہیں...... تو تمہارا کیا خیال ہے؟''

''بالکل درست خیال ہے...... بلکہ تم جانتے ہو کہ فوڈ سٹریٹ کی کامیابی کے بعد لوہاری دروازے کے اندر اور ایبٹ روڈ پر بھی فوڈ سٹریٹس قائم کرنے کے منصوبے پر غور ہو رہا ہے...... ابھی بسنت میں کافی دن پڑے ہیں اور اس کے باوجود فوڈ سٹریٹ کے گھروں کی چھتوں کے لیے بین الاقوامی کاروباری اداروں نے بولیاں لگانی شروع کر دی ہیں۔ شنید ہے کہ صرف ایک روز کے لیے ایک چھوٹی سی چھت کے لیے لاکھوں روپے مانگے جا رہے ہیں...... ان کی تو لاٹری نکل آئی ہے......''

''یہ ادارے ان چھتوں پر کریں گے کیا؟''

''پتنگیں اڑائیں گے اپنے گاہکوں، دوستوں، سیاستدانوں اور افسروں کی دعوتیں کریں گے۔ لاہور کا بے مثال کلچر دکھائیں گے اور کیا کریں گے......''

''کچھ کھانا پینا نہیں ہوگا؟''

''دعوتوں میں کھانا پینا ہی تو ہوتا ہے میرے بیوقوف دوست...... اگرچہ ان میں سے بیشتر حضرات چونکہ کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے عام طور پر کھاتے کم ہیں اور پیتے زیادہ...... بلکہ تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں؟''

''فوراً بتاؤ مجھے راز و نیاز سے بے حد دلچسپی ہے......''

''شنید ہے کہ ہیرا منڈی میں بیٹھنے والی رقاصاؤں اور موسیقاروں نے حکومت

سے مطالبہ کیا ہے کہ ہمارے علاقے کو بھی رنگ روغن کیا جائے...... لائٹیں لگائی جائیں...... رات کو ٹریفک بند کر دی جائے اور کھلے عام رقص کرنے کی اور طبلے کھڑکانے کی اجازت دی جائے اور اسے ''میوزک سٹریٹ'' کا نام دے دیا جائے۔ پھر دیکھئے کہ ہم کیسے دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرتے ہیں بلکہ رات میں تو چوگنی سے بھی زیادہ ترقی کرتے ہیں......''

''خلیفہ ان کا مطالبہ کچھ ایسا بے جا بھی نہیں کہ کیونکہ ہیرامنڈی کے نام سے تو شرفاء بدکتے ہیں اگر اسے میوزک سٹریٹ قرار دے دیا جائے تو ہم جیسے بھی کلچر کا مطالعہ کرنے کے لیے ادھر پھیرا لگا لیا کریں......''

''اس میں صرف ایک قباحت ہے...... میوزک سٹریٹ ظاہر ہے فوڈ سٹریٹ سے کہیں بڑھ کر کامیاب ہوگی اور وہاں کے خاندانی لوگوں کے وارے نیارے ہو جائیں گے تو پھر کیا تم فوڈ سٹریٹ میں اپنی سری پائے کی دکان بڑھا کر وہاں کاروبار شروع کر دو گے؟''

''لاحول ولا...... خلیفہ تم مجھے ایسا سمجھتے ہو......''

''بھئی آرٹسٹ لوگ تو تم ہوناں تو پھر کیا قباحت ہے؟''

''خلیفہ...... میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔ جب میوزک سٹریٹ قائم ہوگی تب دیکھا جائے گا فی الحال تم فوڈ سٹریٹ میں میرے لیے کوئی دکان حاصل کرو...... سری پائے اور گول گپوں کا کاروبار تو شروع کریں۔''

''جونہی میں نے یہ خبر سنی تھی کہ تم لکھنا پڑھنا ترک کر کے اس منفعت بخش کاروبار کی طرف مائل ہو گئے ہو تو میں نے فوڈ سٹریٹ میں جا کر کچھ معلومات حاصل کر لی تھیں......''

''سبحان اللہ خلیفہ...... تو پھر میں...... بلکہ ہم...... کیونکہ تم میرے پارٹنر ہو گے...... کب سری پائے کی دکان کھولیں؟''

''تم نہیں کھول سکتے؟''

''کیوں؟''

''وہاں جائیداد کی قیمتیں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ اگر تم اپنی کار کو اور اپنے آپ کو بھی فروخت کر دو تو بھی دکان حاصل نہیں کر سکتے...... بھول جاؤ فوڈ سٹریٹ۔''

''خلیفہ مجھے معلوم تھا کہ تم بالآخر اپنی پٹاری سے کچھ نہ کچھ نکالو گے۔ میں تمہاری نیت پر اگر شک کرتا ہوں تو ٹھیک کرتا ہوں...... انتہائی کمینے شخص ہو بھئی...... لیکن میری پٹاری میں بھی کچھ ہے...... میں نے فوڈ سٹریٹ کا متبادل سوچ رکھا ہے۔''

''کیا؟''

''بک سٹریٹ...... ایک ایسی سٹریٹ جس میں صرف کتابوں کی دکانیں ہوں گی، لائبریریاں ہوں گی، فٹ پاتھوں پر سیکنڈ ہینڈ بکس بکتی ہوں گی۔ کسی بھی قوم کی توقیر اس کے علم سے ہوتی ہے، خوراک کے ڈھیروں اور ان کو منہ میں ٹھونسنے سے نہیں...... میں اس قوم کو وقار دوں گا...... بک سٹریٹ قائم کر کے رہوں گا۔''

''اس بک سٹریٹ کی چھتوں پر نہ پتنگیں اڑائی جا سکتی ہیں اور نہ بین الاقوامی کاروباری ادارے اس میں دلچسپی لیں گے...... اور وہاں کتنے لوگ آئیں گے؟ صرف میں اور تم اور چند مفلس لوگ جو کتابیں پڑھتے ہیں لیکن خرید نہیں سکتے...... بک سٹریٹ کو بھی بھول جاؤ...... قوم کو کتاب کی نہیں خوراک کی ضرورت ہے سوچ کی نہیں...... معدے کی خوراک۔''

سرطان زدہ مرتے ہوئے بچّوں کا کاروبار

کمال کلو کی رگِ کاروبار پھر پھڑکی ہے۔

یہ وہی کمال کلو ہے جس کے ذہن میں عجیب اور انوکھے کاروبار آتے ہیں جو کسی اور کے ذہن میں نہیں آتے اور اس کے باوجود کہیں نہ کہیں گھپلا ہو جاتا ہے اور وہ پھر پھانک ہو جاتا ہے۔ ایک بار اس نے چین کو چھوے برآمد کرنے شروع کئے تھے اور جب کاروبار عین عروج پر پہنچا تھا تو اس کا چھوؤں سے بھرا ایک ٹرک کسٹم حکام نے پکڑ لیا تھا...... گلہریوں کی ایکسپورٹ میں بھی اسی نوعیت کا ایک سانحہ ہو گیا تھا...... لیکن اب کی بار وہ پہلے سے کہیں زیادہ پُراعتماد دکھائی دے رہا تھا......

''کلو میاں اس مرتبہ کیا ایکسپورٹ کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

''نہیں''۔ اس نے سر ہلایا۔ ''میں نے ایکسپورٹ میں بے حد دُکھ سہے ہیں اور اب تائب ہو گیا ہوں...... میں نے سوچا ہے کہ اس مرتبہ پاکستانی عوام کو بیوقوف بنایا جائے۔ میرا مطلب ہے پاکستانی عوام کے لیے کوئی پروڈکٹ تیار کی جائے تاکہ ملکی ترقی میں میرا بھی حصہ ہو۔''

''تو پاکستانی عوام کے لیے تم کون سی پروڈکٹ مارکیٹ میں لانا چاہ رہے ہو......؟''

''ابھی میں نے پروڈکٹ کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا...... صرف کاروبار کرنے کا فیصلہ کیا ہے......''

''کلو کمال تم پہلے بھی متعدد بار ناکام ہو چکے ہو اور تمہیں ابھی تک عقل نہیں آئی کہ بھائی میرے پہلے تو آپ مارکیٹ کا جائزہ لیتے ہیں اور پھر جس شے کی ڈیمانڈ ہو وہ

تیار کرتے ہیں...... اور تم نے کاروبار کا فیصلہ کر لیا ہے اور پروڈکٹ کا کیا ہی نہیں......''

''مجھے عقل آ گئی ہے تو میں نے کاروبار شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے...... کیونکہ اس سے بیشتر میں ناسمجھ تھا اور پروڈکٹ کو اہم سمجھتا تھا...... حالانکہ پروڈکٹ نہیں بکتی بلکہ اس کی اشتہاری مہم بکتی ہے...... پہلے میں اشتہار بازی کے کمالات سے آگاہ نہیں تھا اور اب میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے جسے بروئے کار لا کر میں کوئی بھی پروڈکٹ فروخت کر سکتا ہوں......''

''اور وہ کون سی ترکیب ہے؟''

''پہلے آپ بتائیں کہ آپ کا تعلق میڈیا سے بھی ہے تو کامیاب اشتہاری مہم چلانے کے کون سے گُر ہیں؟''

''بھئی میں اس بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا البتہ ایک زمانے میں ان دوستوں کے لیے جو اشتہاری ادارے چلاتے تھے کبھی کبھار کاپی رائٹنگ کر دیا کرتا تھا...... یعنی پروڈکٹ کی بے جا تعریفیں اور گاہکوں کو پھانسنے کے لیے کوئی پُرکشش نعرہ...... مثلاً اگر زہر ہی پینا ہے تو ہمارا سگریٹ پیا کریں...... ہمارا صابن گناہ کے دھبے بھی دھو دیتا ہے...... جوتے کھائیے تو ہمارے جوتے کھائیے وغیرہ...... تو تم پروڈکٹ کے بارے میں کچھ بتاؤ تو اس کے مطابق میں تمہیں سلوگن بنا دوں گا......''

''نہیں جی نہیں۔'' کلو کمال نے پھر سر ہلایا...... ''پروڈکٹ کا تو ابھی فیصلہ کرنا ہے...... اس سے فرق نہیں پڑتا...... میں نے تو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اشتہاری مہم کی جو ترکیب میرے ذہن میں ہے آپ اس سلسلے میں میری کیا رہنمائی کر سکتے ہیں......''

''تم پتہ نہیں کلو سے کمال کیسے ہو گئے ہو......'' میں نے بھنا کر کہا۔ ''ویسے ایک انٹرویو میں اصالیہ کے ادیب البرتو موراویا نے سرمایہ دارانہ نظام میں کوئی بھی کاروبار کامیابی سے کرنے کے بارے میں ایک فارمولا بیان کیا تھا......''

''اس نے یہ فارمولا استعمال کیا تھا؟''

''نہیں......''

''اور کیوں نہیں؟''

''ادیب صرف فارمولے بنا سکتے ہیں بیان کر سکتے ہیں لیکن ان پر عمل نہیں کر سکتے...... اگر عمل کر سکتے تو ادب میں کیوں جھک مارتے...... کروڑ پتی نہ بن جاتے۔''

''تو پھر آپ مجھے وہ فارمولا فوری طور پر بتا دیں۔''

''اس نے کہا تھا کہ ہر سرمایہ دارانہ نظام میں گاہکوں کے استعمال کی ہر شے پہلے سے وافر موجود ہوتی ہے اور مزید پروڈکٹس کی قطعی گنجائش نہیں ہوتی جب تک کہ آپ گاہکوں کو اتنا بیوقوف نہ بنا دیں کہ وہ آپ کی پروڈکٹ خریدنے پر مجبور نہ ہو جائیں...... اگرچہ انہیں اس کی قطعی ضرورت نہیں ہوتی......''

''مجھے جلدی سے گاہکوں کو بیوقوف بنانے کی ترکیب بتا دیں...... کہیں یہ ترکیب کوئی اور نہ لے اُڑے......''

''البرتو کہتا ہے کہ آپ لیڈیز شوز کا کاروبار شروع کرتے ہیں اگرچہ آپ کے معاشرے میں ہر لیڈی کے وارڈ روب میں پہلے سے درجنوں جوتے موجود ہیں...... لیکن آپ کرتے یہ ہیں کہ اس شو میں دو چار آنے کی ایک گھنٹی لگا کر اسے ''بیل شوز'' کا نام دے دیتے ہیں...... اس کے بعد ایک اشتہاری مہم شروع کرتے ہیں اور ملک کے طول و عرض میں بیل شوز کے سائن بورڈ نظر آنے لگتے ہیں...... ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر غل مچ جاتا ہے...... اخباروں میں شور مچ جاتا ہے کہ بیل شوز بہترین شوز...... ٹیلی ویژن پر ایک لڑکی چلتی ہوئی جا رہی ہے لیکن کوئی اس کی جانب آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا کیونکہ وہ عام شوز میں ہے اور پھر ایک اور لڑکی گزرتی ہے جس کے شو میں سے گھنٹیوں کا مترنم نغمہ پھوٹ رہا ہے اور تمام نوجوان اس کو دیکھتے رہ جاتے ہیں...... چنانچہ اس اشتہاری مہم کے نتیجے میں ایک مطمئن لڑکی جس کے پاس درجنوں شوز ہیں احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہے کہ ہائے میری بھی کیا زندگی ہے' میرے وارڈ روب میں بیل شوز نہیں ہیں اور وہ مجبوراً یہ جوتے جو اس کے کسی کام کے نہیں محض اشتہار بازی کے جادو میں گرفتار ہو کر خرید لیتی ہے تو تم بھی بیل شوز کا کارخانہ لگا لو۔''

''نہیں تارڑ صاحب...... یہ تو یورپ کی باتیں ہیں...... یہاں تو کئی لوگوں کے پاؤں میں جوتے ہوتے ہی نہیں وہ بیل شوز کہاں سے خریدیں گے......''

''تو پھر تم مجھے وہ نایاب اشتہاری ترکیب بتا دو جس کے زور سے تم جو چاہو گے وہ

فروخت کر لو گے۔'' میں نے تنگ آ کر کہا۔ ''مجھے تو اشتہاری دنیا کا جو کچھ علم تھا' وہ سب بیان کر دیا۔''

''تارڑ صاحب...... میں سرطان زدہ مرتے ہوئے بچے فروخت کروں گا......''

''تم ہوش میں تو ہو......''

''میں قریب المرگ مریضوں کے چہرے ٹیلی ویژن پر دکھاؤں گا......''

''یہ کیا واہی تباہی ہے......''

''میں موت کی آمد پر پہلے سے مرتے بچے سکرین پر دکھاؤں گا...... بیماروں کو علاج کی پیشکش کروں گا...... ایسے منظر دکھاؤں گا کہ لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں...... کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں سے خوراک تلاش کرتے بچوں کے سر پر ہاتھ رکھ کر انہیں تعلیم کی روشنی سے منور کر دوں گا...... میں مچھلی کی مانند تڑپتے بچوں کے کلوز اپ دکھا کر انسانی ضمیر کو کچوکے دوں گا......''

''تم یہ سب انسانی ہمدردی کے تحت کرو گے؟''

''ہاں میرے دل میں انسانی ہمدردی کا سمندر اُبل رہا ہے......''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کاروبار کا ارادہ ترک کر کے تمہارے پاس جو جمع پونجی ہے اسے بیماروں' ناداروں اور غریبوں کے لیے وقف کر دو گے...... کاروبار نہیں کرو گے؟''

''یہی تو کاروبار ہے......''

''کیا مطلب؟''

''یہی تو کیچ ہے میرے بادشاہ...... میں بیوقوف ہوں جو اپنی پونجی مرتے ہوئے بچوں اور سرطان زدہ مریضوں پر خرچ کروں...... یہی تو اشتہاری مہم کی منصوبہ بندی ہے......''

''لیکن کیسے؟''

''وہ ایسے کہ ان اشتہاروں میں مرتے ہوئے ڈھانچے دکھا کر میں اپیل کروں گا کہ آیئے انسانی ہمدردی کی لازوال شمع روشن کر کے ان مایوس لوگوں کی مدد کرنے میں ہمارا ساتھ دیں...... فوری طور پر نزدیکی سٹور سے ہماری فلاں پروڈکٹ خریدیئے اور اس کی رسید ہمیں بھجوا دیجئے...... اگر مشروب ہے تو اس کا ڈھکن ہمیں ارسال کر دیجئے...... خالی ڈبے جمع

کر کے ہمیں روانہ کر دیجیے...... ہم ان کے بدلے میں...... ہر ڈھکن پر خالی ڈبے کے بدلے میں پورے بیس روپے ان مریضوں اور قریب المرگ بچوں کے سرہانے رکھ دیں گے۔ ان کی مدد کر کے ثواب حاصل کریں گے......"

"لیکن کمال کلو...... ہمارے مذہب میں تو یہ ہے کہ کسی کی مدد کرتے ہوئے دائیں ہاتھ سے دیتے ہوئے بائیں کو خبر نہ ہو...... اور ہم ٹیلی ویژن پر یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وزیر صاحب زکوٰۃ کے چیک بوڑھی لاچار عورتوں میں بڑے تکبر سے بانٹ رہے ہیں اور کیمرے کی جانب دیکھتے جاتے ہیں۔ کروڑوں روپے اشتہاری مہم پر خرچ کر دیتے ہیں اور لاکھ دو لاکھ کسی ہسپتال میں دے آتے ہیں...... کیا ایک تڑپتی ہوئی بے آب مچھلی کو دکھا کر ایک مرتے ہوئے بچے کو صرف اس لیے دکھانا جائز ہے کہ آپ ہماری پروڈکٹ خریدیں...... یہ کیسی بے حسی ہے؟"

"یہ بے حسی نہیں جناب...... کاروبار ہے...... انسانی ہمدردی بھی تو فروخت کی جا سکتی ہے...... اور کُل دنیا ایسا کر رہی ہے تو میں کیوں نہ کروں...... مجھے اجازت دیجیے کیونکہ میں اپنے اشتہار کے لیے چند ایسے بچے ہسپتالوں میں تلاش کرنے جا رہا ہوں جو قریب المرگ ہوں، پیٹ پھولا ہوا ہو اور سانس رُک رُک کر آ رہا ہو...... کسی سرطان زدہ مریض کا ڈھانچہ تلاش کرنے جا رہا ہوں...... میں کروڑ پتی بننے والا ہوں...... آپ کو کیا اعتراض ہے؟"

کوٹھا عشق سے مشینی عشق تک

"یرقان بھائی......"

"ہاں فرقان بھائی......!"

"یرقان بھائی یہ عشق کیا ہوتا ہے......؟"

"یہ عشق عشق ہے عشق عشق......"

"میں نے تم سے قوالی کرنے کو تو نہیں کہا...... یہ پوچھا ہے کہ؟"

"کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا......"

"یرقان بھائی خدارا سنجیدہ ہو جاؤ اور مجھے بتاؤ کے تمہارے نزدیک عشق کے کیا معنی ہیں؟"

"لیکن تمہیں اس عمر میں عشق کے مطالب جاننے کی کیا افتاد آن پڑی......؟"

"عشق کے لیے عمر کی تو قید نہیں......"

"صورت شکل کی تو قید ہے ناں...... تم تو جوانی میں بھی گھسیارے لگتے تھے اور اب بڑے ہو کر بالکل ہی گھانس پھونس ہو گئے ہو...... واہ' تم نے گھسیارے کے ہمراہ گھاس پھونس کی کیا ترکیب ملاحظہ کی ہے...... کم از کم داد تو دو......"

"یرقان بھائی میں تمہاری زبان دانی کا تو ہمیشہ سے معترف ہوں۔ تم نے جب بھی زبان برتی دوستوں کی دل آزاری کے لیے ہی برتی اور کیا خوب برتی...... میں نے تم سے نہ تو اپنی شکل کے بارے میں پوچھا ہے اور نہ ہی یہ دریافت کیا ہے کہ کیا اس عمر میں عشق ہو سکتا ہے کہ نہیں میں نے تو محض عشق کی تعریف پوچھی ہے......"

"فرقان بھائی تم میرے اکلوتے دوست ہو اور میں ظاہر ہے تمہارا سب سے

بڑا ہمدرد ہوں...... تم نے آج تک کبھی بھی عشق و عاشقی کے مسائل میں دلچسپی ظاہر نہیں کی...... تو اب جو عشق عشق کرتے پھرتے ہو تو مجھے شبہ ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے...... کیا کالا ہے؟"

"جو بھی کالا ہے وہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں بتا دوں گا' چھپاؤں گا نہیں' آفٹر آل تم بھی تو میرے اکلوتے دوست ہو...... چلو یہ بتا دو کہ یہ عشق ہوتا کیسے ہے؟"

"دماغ کیسے خراب ہوتا ہے آج تک کوئی جان سکا ہے؟...... عشق میں ہو جاتا ہے...... لوگ ہمیشہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم نے کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوئیں...... بھائی ہم تو ہمیشہ کچی گولیاں ہی کھیلتے رہے...... عشق کے بارے میں میرا تجربہ کچھ زیادہ وسیع نہیں...... البتہ نوخیزی کے عالم میں ایک بار جھک مار بیٹھے تھے اور عشق کر بیٹھے تھے۔"

"بس' ایک بار اپنے کوٹھے پر پتنگ اڑا رہے تھے...... پتنگ ذرا کنّی کھاتی تھی...... کنّی کھانا سمجھتے ہو...... نہیں؟ ہوا میں سیدھی اٹھنے کی بجائے دائیں یا بائیں جھکتی چلی جاتی تھی......"

"تم نے ایسی پتنگ خریدی ہی کیوں جو کنّی کھاتی تھی؟"

"خریدی کس کمبخت نے تھی...... ہمارے کوٹھے کے عین اوپر کنّی کھاتی نیچے آئی تو ہم نے کانٹی ڈال کر اسے لُوٹ لیا...... جو پتنگ باز بجتا تھا وہ ظاہر ہے بے حد خفا ہوا...... مجھے چھینٹی لگانے کے لیے ہمارے گھر آ گیا اور بڑی مشکل سے جان بچی...... بہرحال میں نے اس پتنگ کو پورے دو ماہ ہوا نہ لگنے دی کہ کہیں اس کا مالک اسے پہچان کر پھر نہ آ جائے......"

"یرقان بھائی...... اگر تم اپنی پتنگ بازی کی داستان طوالت ترک کر کے مجھے فوری طور پر یہ نہیں بتاؤ گے کہ یہ عشق کیسے ہوتا ہے تو میں تمہیں چھینٹی لگا دوں گا......"

"بھئی ایک عظیم عشق کی داستان مختصر تو نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ہماری پتنگ جو کنّی کھاتی تھی ایک بار جو دائیں جانب جھکی تو جھکتی چلی گئی اور ایک کوٹھے پر جا گری...... اسی لمحے ایک نہایت دل فریب دوشیزہ جو چھت پر کپڑے سکھانے آئی تھی......"

"دوشیزہ کے کپڑے کیسے بھیگ گئے؟"

"بھئی وہ اپنے کپڑے نہیں سکھا رہی تھی بلکہ صحن میں اس کی والدہ جن کپڑوں کو کوٹ کوٹ کر دھو رہی تھیں انہیں دھوپ میں ڈالنے آئی تھی...... بہرحال اس دل فریب دوشیزہ نے مجھے دیکھا اور میں نے اسے دیکھا اور پیار ہو گیا......"

"اچھا؟ اتنی آسانی سے ہو گیا...... ویسے یہ پیار اور عشق ایک ہی چیز ہوتے ہیں ناں؟"

"ہاں یار...... سنو تو سہی...... پھر میں نے اس دل فریب دوشیزہ سے بلند آواز میں کہا...... بہن جی...... میری پتنگ آپ کے کوٹھے پر گر گئی ہے ذرا اسے تو عنایت کر دیں...... دوشیزہ نے مسکرا کر میری پتنگ کو دونوں کونوں سے تھام کر ہوا میں اچھال دیا اور میں نے اسے فوراً کھینچ لیا...... پھر جھک کر کہا...... شکریہ بہن جی......"

"اوئے یہ عشق ہے...... دوشیزہ...... کو بہن جی کہہ کر پکارتے تھے......"

"ان دنوں یہی رواج تھا...... بس پھر کیا تھا عشق شروع ہو گیا...... میں پتنگ کے ساتھ ایک رقعہ باندھ کر اس کے کوٹھے پر گراتا وہ فوراً اس رقعے کی پشت پر جواب لکھ کر پتنگ ہوا میں اڑا دیتی...... پتنگ بازی کے ساتھ پیام بازی ہونے لگی...... چند روز تک ہم دونوں پیار کے راہی عشق کے جھولے میں جھولتے رہے...... اس کے بعد ایک روز اس کے بھائی جان بھی کپڑے ڈالنے کے لیے چھت پر چلے آئے اور میری پتنگ میں بندھا رقعہ ان کے ہاتھ لگ گیا...... اور پھر چراغوں میں بھی اور آنکھوں میں بھی روشنی نہ رہی۔ انہوں نے گلی میں پکڑ کر مجھے خوب زد و کوب کیا...... بس میرا تو عشق کا یہی واحد تجربہ ہے......"

"یرقان بھائی تم نے مجھے بے حد مایوس کیا ہے...... بھئی تم تو نہایت آؤٹ ڈیٹڈ ہو عشق کے معاملے میں...... آج کل تو دنیا ایک گلوبل ولیج بن گئی ہے......"

"اگر بن گئی ہے تو اس کا عشق سے کیا تعلق ہے؟"

"اس لیے کہ عشق بھی گلوبل ہو گیا ہے۔ چھتوں' بس سٹاپوں اور پارکوں تک محدود نہیں رہا...... اب تو ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں...... عشق کے امتحان گلوبل ہو گئے ہیں......"

"وہ کیسے فرقان بھائی......؟"

''اس سلسلے میں دو واقعے تو میری نظر میں بھی ہیں۔ ہمارے محلّہ میں ایک چھوٹا سا مکان تھا جہاں ایک دیہاتی اور نیم پڑھا لکھا خاندان رہتا تھا۔ بلکہ خاندان تو کیا رہتا تھا ان کا ایک لڑکا رہتا تھا جو مقامی کالج میں زیرِ تعلیم تھا اور اس کے ماں باپ کبھی کبھار اسے ملنے بھی آتے تھے...... ایک روز کیا دیکھتے ہیں کہ ایک انگریز جوڑا اور ان کی ایک ٹین ایج لڑکی ان کے مکان کی چھت پر بیٹھے گنے چوس رہے ہیں...... معلوم ہوا کہ ان کے مہمان ہیں۔ پاکستان کی سیر کو آئے ہیں...... چند روز بعد لڑکے کے والد صاحب ہمارے ہاں تشریف لائے کہ جناب پرسوں برخوردار کی شادی ہے آپ ضرور تشریف لائیے گا...... ہم نے پوچھا بارات کہاں جائے گی؟ کہنے لگے، کہیں بھی نہیں، گھر میں ہی رہے گی...... آپ نے شاید ان انگریزوں کو دیکھا ہو تو ان کی لڑکی ہے...... میں نے پوچھا کہ آپ دیہات کے رہنے والے ہیں تو یہ سلسلہ کیسے ہو گیا۔ وہ ہنسنے لگے اور بولے...... فرقان صاحب دراصل یہ مشینی شادی ہے۔ لڑکا کمپیوٹر پر بیٹھا اس لڑکی کے ساتھ گٹ پٹ کرتا رہتا تھا...... دونوں کو عشق ہو گیا...... اس کے والدین بھی اس کے ساتھ پاکستان آ گئے کہ ہم پہلے لڑکے کو چیک کریں گے...... وہ چند ہفتے ہمارے ہاں رہے اور انہوں نے ہم لوگوں کو پسند کر لیا...... بس اس طرح یہ سلسلہ ہو گیا...... شادی کے بعد دونوں امریکہ چلے جائیں گے۔''

''فرقان بھائی کہیں گپ تو نہیں لگا رہے؟''

''فرقان بھائی اسی لیے تو کہتا ہوں کہ تمہارا نظریۂ عشق فرسودہ ہو چکا ہے...... ان دنوں تو اسی مشینی عشق کا رواج ہے...... لڑکے اور لڑکیاں کمپیوٹر کھول کر چیٹ کرتے رہتے ہیں۔ لڑکا افریقہ میں ہوتا ہے تو لڑکی آسٹریلیا میں...... اور پھر پیچ لڑ جاتا ہے اور معاملہ سنجیدہ ہو جاتا ہے...... آج کے اخبار میں اسلام آباد سے بھی اسی قسم کی شادی کی خبر آئی ہے لیکن معاملہ پولیس تک جا پہنچا ہے...... میٹرک کے طالب علم ایک صاحب زادے اپنے کمپیوٹر پر بیٹھے کینیڈا کی ایک خاتون کو ورغلانے میں کامیاب ہو گئے...... بعد میں پتہ چلا کہ دراصل خاتون نے انہیں ورغلا لیا ہے...... وہ پاکستان پہنچ گئی...... بچے کے ساتھ چوری چھپے شادی کر کے اسے کینیڈا اسمگل کرنے کی فکر میں تھی کہ والدین کو علم ہو گیا...... اب انہوں نے پولیس میں رپورٹ درج کروا دی ہے کہ کینیڈا کی ایک عورت نے ہمارے بچے کو اغوا کر لیا ہے، اسے کینیڈا جانے سے روکا جائے اور ہمیں واپس کیا جائے...... بچے کی ماں بہت پریشان ہے......''

''ہاں فرقان بھائی زمانہ واقعی قیامت کی چال چل گیا ہے اور ہمیں خبر ہی نہیں ہوئی لیکن تم کیوں پوچھ رہے تھے کہ یہ عشق کیا ہوتا ہے اور کیسے ہو جاتا ہے؟''

''اس لیے کہ میں بھی آج کل اپنے کمپیوٹر پر بیٹھا درجن بھر خواتین سے جو کہ دنیا کے کونے کونے میں پھیلی ہوئی ہیں...... عشق کر رہا ہوں...... جو کام اب تک نہیں کر سکا وہ کر رہا ہوں...... چلو مشینی ہی سہی...... ہے تو عشق...... اب تم دُعا کرو کہ ان درجن بھر خواتین میں سے کوئی پاکستان آ جائے...... تو یہ ہوگا عشق عشق...... لیکن تم کہاں جا رہے ہو؟''

''میرا بچہ بھی دن رات کمپیوٹر پر بیٹھا چیٹ کرتا رہتا ہے...... اب معلوم ہوا کہ کس کے ساتھ کرتا رہتا ہے...... اسے اس کی نشست سے اٹھا کر کہوں گا کہ برخوردار تم ذرا گلی میں جا کر گلی ڈنڈا کھیلو اور پھر اس کی جگہ کمپیوٹر پر بیٹھ کر چیٹ کروں گا...... کیا پتہ ہمیں بھی کوئی میم اغوا کر کے لے جائے۔''

مصری ممّی اور میرے بچّوں کی ممّی

''ممّی ممّی''۔ میری بیٹی اپنی ماں کو پکارتی پھرتی تھی۔ ''میرا کڑھائی والا کرتہ کہاں رکھ دیا ہے آپ نے۔ پتہ نہیں ممّی کہاں چلی گئی ہیں؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

میرے بچّوں کی عادت ہے کہ وہ ذرا پیار کرنے اور لاڈ کرنے کے موڈ میں ہوں تو اپنی ماں کو ''اماں اماں'' کہتے اس سے لپٹ جاتے ہیں۔ اگر پیسوں کی ضرورت ہو یا کوئی کام نکلوانا ہو تو پھر اسے ''والدہ صاحبہ'' کہا جاتا ہے اور جب ذرا ماڈرن ہو جائیں اور غصے میں ہوں تو وہ ''ممّی'' ہو جاتی ہے۔ اب چونکہ عینی کو اپنا پسندیدہ کرتہ نہیں مل رہا تھا اور وہ ایک امریکی ریسٹوران میں برگر کھانے جا رہی تھی اس لیے ''ممّی ممّی'' کی دُہائی دے رہی تھی۔

''میرا خیال ہے بیٹے کہ وہ باتھ روم میں ہیں۔'' میں نے اسے بتایا۔

چنانچہ اس نے باتھ روم کے دروازے کے ساتھ منہ لگا کر ''ممّی ممّی'' پکارنا شروع کر دیا۔ بالآخر جب باتھ روم کا دروازہ کھلا اور میری بیوی باہر آئی تو اس کا رنگ فق تھا اور اس کی آواز میں سرزنش تھی۔ ''خبردار جو اب مجھے اس منحوس لفظ سے پکارا تو..... امّی کہا کرو۔''

''کیوں ممّی۔'' عینی ذرا ڈر گئی۔

''پھر وہی ممّی۔''

''لیکن ممّی۔''

''عینی کی بچی۔'' میری بیگم باقاعدہ اشتعال میں آ گئیں۔

''اوہو کیا مصیبت آ گئی ہے۔'' میں نے صلح صفائی کروانے کی غرض سے کہا۔

''بھئی عینی نے اگر ممّی کہہ دیا تو کیا ظلم کر دیا۔ ہمیشہ کہتی ہے تم اس کی ممّی نہیں ہو؟''

''ہرگز نہیں ہوں۔'' وہ چمک کر بولی۔ ''غضب خدا کا جیتے جاگتے مجھے ممّی بنا

رہے ہو۔ حنوط شدہ لاش کہہ رہے ہو میرا تو دل دہل جاتا ہے یہ لفظ سن کر۔''

بیگم کا ممّی کہنے پر شدید ردِ عمل فوراً میری سمجھ میں آ گیا۔ پچھلے چند روز سے اخباروں اور خبروں میں مسلسل اس ایرانی شہزادی کی ممّی کا تذکرہ چل رہا تھا جو ایک طلائی تاج پہنے سینے پر سونے کی ایک پلیٹ آویزاں کیے ایک قدیم تابوت میں لیٹی تھی۔ چنانچہ بار بار اس کی تصویر دیکھنے اور 'ممّی' سننے کے بعد میری بیگم ممّی ہونے سے انکاری ہو گئی تھی۔ فاران کے کسی قدیم قبرستان سے کھودی گئی 26 سو برس پہلے کی مصری یا ایرانی شہزادی' جانے کیسے ہم تک پہنچ گئی تھی اور یہ حقیقت کتنی دلچسپ بھی اور ہولناک بھی تھی کہ ہم اس کا نام جانتے ہیں۔ ایرانی سلطنت کے عظیم شہنشاہ خروش الکبیر کی عزیزہ' خورال گیان یا تندل گیان..... شمالی علاقے کے قصبے چتن کی ایک پہاڑی سے ایک چرواہی کو سترہ کلو وزنی سونے کا ہار ملا تھا اور اب اس ہار کے بعد یہ پاکستانی تاریخ کی اہم ترین دریافت تھی۔ اسے چوری چھپے بیچنے کی مبینہ کوشش کی جا رہی تھی۔ دس کروڑ کی آفر موجود تھی' لیکن ایک ارب روپیہ قیمت مانگی جا رہی تھی' جو دراصل اس تاریخی دریافت کی اہمیت کے حوالے سے کچھ بھی نہیں۔ مجھے تو اس شخص پر حیرت ہے جس نے درجنوں برس سے اپنے گھر میں چھپائے رکھا۔ ایک ممّی کی موجودگی میں بیشک وہ ایک رائل پرنس آف ایران ہو۔ وہ رات کو کیسے سو جاتا ہوگا۔ پھر سوچا کہ میں بھی تو رات کو سو ہی جاتا ہوں اور میرے گھر میں بھی ایک ممّی ہوتی ہے' یعنی بچوں کی ممّی۔

چنانچہ اس وقوعے کے بعد بچوں نے اسے ممّی کہنا چھوڑ دیا ہے اور اماں اور والدہ صاحبہ پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

بیگم نے البتہ ایک عجیب سی تھیوری پیش کر دی۔ کہنے لگی ''ویسے تو پاکستان کی عام گھریلو خاتون ممّی ہی ہوتی ہیں حنوط شدہ اور حقوق کے بغیر' کبھی خاوند کی غلام' کبھی اولاد کے رحم و کرم پر' دن رات کی مشقت میں بندھی ہوئی۔ اپنی مرضی سے ہاتھ پاؤں نہیں ہلا سکتی تو اس میں اور ایک ممّی میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔''

میں نے بیگم کی اس عجیب تھیوری پر تادیر غور کیا تو اس میں سے ایک اور عجیب تھیوری نے جنم لیا۔ بیشک ہمارے ہاں مُردوں کو دفن کرتے ہیں ان کی ممّیاں نہیں بناتے'

لیکن اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ قدیم مصریوں کی مانند یہاں بھی یہ رواج ہو تو آج سے ڈھائی ہزار برس بعد یہ خطہ جس میں ہم رہائش پذیر ہیں کسی اور قوم' مذہب اور مختلف ثقافت رکھنے والوں کا ملک ہوسکتا ہے اور اس عہد میں اگر ہماری ممیاں برآمد ہونے لگیں تو وہ لوگ کس نتیجے پر پہنچیں گے کہ آج سے 4050ء سے ڈھائی ہزار پیشتر 2000ء میں اس خطے کے باسی کون تھے۔ کیسی بودوباش رکھتے تھے اور کیسے زندگی بسر کرتے تھے۔ آثار قدیمہ کے ماہر عام طور پر صرف ایک ممی پر غور کرنے کے بعد اس عہد کی تصویر بنا لیتے ہیں' چنانچہ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ آج سے ڈھائی ہزار برس بعد کسی صحرا میں سے جہاں شنید ہے کہ لاہور نامی ایک شہر آباد تھا' کچھ ممیاں برآمد ہوتی ہیں اور ان میں سے پہلی ممی ایک گھریلو خاتون کی ہے تو آثار قدیمہ کے ماہرین کس نتیجے پر پہنچیں گے۔

گھریلو خاتون کی ممی...... اس ممی پر تحقیق کرنے سے ظاہر ہوا ہے کہ یہ ڈبل ممی ہے۔ یعنی اپنی زندگی میں بھی ممی تھی اور مرنے کے بعد بھی اسے دوبارہ ممی بنایا گیا تھا۔ اس کے کھردرے ہاتھوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد کے لوگ ہمہ وقت برتن مانجھتے رہتے تھے اور کپڑے دھوتے رہتے تھے۔ اس کے جسم پر کوئی زیور نہیں ہے لیکن مزید تحقیق پر معلوم ہوا ہے کہ اس کے پاس جتنے گہنے تھے وہ اس کی ساس نے ہتھیا لیے اور جو باقی بچے انہیں بہوؤں نے چھین لیا۔ حیرت ہے کہ یہ ممی بالکل صحیح حالت میں ہم تک پہنچی ورنہ تاریخ بتاتی ہے کہ اس زمانے کی خواتین کھانا پکانے کے دوران اسٹوو کے اتفاقاً پھٹ جانے کے باعث جل کر مر جاتی تھیں یا ان کی بے حرمتی کر کے ان کے ٹکڑے کر دیئے جاتے تھے۔ ایک اور رسم کاروکاری بھی تھی' جس کے باعث لاش صحیح حالت میں نہیں رہتی تھی اور اس کی ممی نہیں بن سکتی تھی۔ اس ممی کا لباس نہایت عامیانہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دنوں کپڑے کی صنعت نے زیادہ ترقی نہیں کی تھی۔ اس کی موت دن رات مشقت کرنے کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئی۔ اغلباً یہ ایک زرخرید غلام تھی۔ یعنی 2000ء میں غلامی عروج پر تھی۔ لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ اس عہد کی تقریباً تمام ممیاں غلاموں کی ہیں لیکن ان کے تعمیر کردہ نہ تو کوئی اہرام دریافت ہوئے ہیں اور نہ کوئی عظیم دیوار......

سیاستدان کی ممی...... اس ممی کی کچھ سمجھ نہیں آسکی کہ یہ ہے کیا۔ عورت ہے یا مرد

ہے یا کوئی درمیانی چیز ہے۔ کبھی لگتا ہے کہ اس کا چہرہ مسکرا رہا ہے' کبھی شائبہ ہوتا ہے کہ بہت سنجیدہ ہے اور چہرے کا رنگ بھی بدلتا رہتا ہے' جیسے گرگٹ کا بدلتا ہے۔ ایک اور حیرت انگیز فرق ہے کہ دوسری ممیوں کی مانند اس کے ہاتھ سینے پر بندھے ہوئے نہیں بلکہ ایک ہاتھ بلند ہے جس کی دو انگلیاں ہوا میں معلق ہیں۔ شنید ہے کہ ان زمانوں میں یہ فتح کا نشان ہوتا تھا۔ دوسرا ہاتھ تابوت کے نیچے ہے اور اس ہاتھ کے نیچے ہیرے جواہرات اور سونے کی ڈلیاں ہیں جنہیں اس کی وصیت کے مطابق اس کے ساتھ دفن کیا گیا تھا۔ کچھ کاغذات بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بے پناہ جائیداد کا مالک تھا جو ویسے اس کی نہیں تھی۔ ممی کی جسمانی حالت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے ساری عمر کوئی کام نہیں کیا البتہ گلے کی رگیں پھولی ہوئی ہیں جس کا مطلب ہے کہ یہ ممی بولتی بہت تھی۔ شاید کوئی گلوکار تھا لیکن گلوکاروں کے تابوتوں میں اتنی دولت نہیں ہوسکتی۔ تو پھر کیا تھا' اس کے بارے میں تحقیق جاری ہے۔

جاگیردارنی کی ممی...... نہایت باریک بینی سے معائنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ کسی خاتون کی لاش ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ یہ جینز اور بلاؤز میں ملبوس ہے لیکن ان کے اوپر اس نے نہایت باپردہ چوغہ پہنا ہوا ہے اور ہاتھ میں تسبیح ہے۔ دوسرے ہاتھ کے نیچے ایک ہنٹر ہے جو غلاموں کو زدوکوب کرنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس کا تعلق شاہی خاندان سے لگتا ہے حالانکہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ 2000ء میں اس خطے میں شہنشاہیت نہیں تھی یقیناً کوئی شہزادی ہے اور اس کے چہرے پر جو رعونت ہے وہ بتاتی ہے کہ وسیع علاقے پر حکمرانی کرتی تھی۔ رعایا کا بے حد خیال رکھتی ہے۔ ایک مرتبہ آٹے کی قلت پر اس نے بیان دیا تھا کہ ابھی تک کسی غلام کے بھوک سے مر جانے کی اطلاع نہیں آئی اس لیے آٹے کی کمی ہرگز نہیں ہے۔ جب سو دو سو لوگ مریں گے تو پھر دیکھا جائے گا۔

ایک مزدور کی ممی...... یہ ممی صرف اُن پٹیوں میں ملبوس ہے جو اسے حنوط کرنے کے لیے استعمال کی گئیں ورنہ اس کے بدن پر کچھ نہ تھا بلکہ ماس بھی نہیں ہے صرف ہڈیاں ہیں۔ چہرہ بھی پچکا ہوا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ اس قسم کی جو سینکڑوں ممیاں دریافت ہوئی ہیں ان سب کے چہرے ایک جیسے تھے البتہ کچھ چہروں پر مسکراہٹ ہے کہ مرنے کے بعد ہی سہی ان کا بدن کپڑے سے ڈھانپا تو گیا۔ یقیناً یہ ممیاں غلاموں کی ہیں۔ تاریخ دان بتاتے

ہیں کہ اس تہذیب کی تباہی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ غلاموں کے تن پر کپڑا نہ تھا اور پیٹ میں روٹی نہ تھی اور مملکت کا سارا کام وہی کرتے تھے...... ان بندوں کے اوقات بہت تلخ تھے۔

خواتین و حضرات آج سے ڈھائی ہزار برس بعد ممیاں تو اور بہت سی بھی برآمد ہوں گی اور ہمارے خطے کی تہذیب و ثقافت کے بارے میں اندازے لگائے جائیں گے۔ میں نے صرف چند ممیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ جو ممیاں دریافت ہوں گی ان کی تفصیل بیان کرنے کا خطرہ میں مول نہیں لے سکتا۔ اگر ایسا کروں گا تو یہ حضرات میرے مرنے کا انتظار بھی نہیں کریں گے اور مجھے اس جرم کی پاداش میں ابھی ممی بنا کر دفن کر دیں گے۔

بابوں کا ناشتہ

باغ کے بابے آج بہت خوش تھے۔

بلکہ بابا بنچ پر براجمان بابے بہت خوش تھے۔

یہ بابا بنچ پارک کے آہنی گیٹ کے عین سامنے واقع ہے اور بابوں نے اس پر قبضہ جما رکھا ہے...... اگر کوئی اور سیر کرنے والا غلطی سے اس پر بیٹھ جائے تو دیگر بابے پہلے تو اس بری طرح گھورتے ہیں کہ وہ ہراساں ہو کر چلا جاتا ہے اور اگر ڈھیٹ ہو کر بیٹھا رہے تو پھر اسے کوئی ایک بابا اپنی چھڑی سے کچوکا دے کر کہتا ہے۔ ''برخوردار! باغ میں سیر کرنے آئے ہو یا یہاں بنچ پر بیٹھ کر لڑکیاں دیکھنے...... چلتے پھرتے نظر آؤ''۔ اور وہ برخوردار ان بابوں سے اپنی عزت بچانے کے لیے فوراً چلتا پھرتا نظر آنے لگتا ہے...... اس بنچ پر بیٹھنے والے بیشتر بابے سفید ریش ہیں اور سفید کپڑے پہنتے ہیں...... کچھ لاٹھیاں ٹیکتے آتے ہیں اور کچھ اپنی کمر پر ہاتھ رکھے ٹھمکے لگاتے ہیں' چنانچہ پارک میں داخل ہوتے ہیں تو دور سے یوں لگتا ہے جیسے پینگوئین چلے آ رہے ہوں...... اگرچہ میری عمر بھی ان سے بہت کم نہیں لیکن میں انہیں دیکھ کر جوان محسوس کرتا ہوں...... ویسے تو میں اپنے بال رنگنے چھوڑ دوں' اپنی سفید داڑھی کو بڑھنے دوں اور ٹریک سوٹ کے بجائے سفید شلوار قمیص پہن کر باغ میں آؤں تو مجھ میں اور ان بابوں میں چنداں فرق نہ ہوگا...... لیکن میں ذرا شوخ ٹی شرٹ پہنتا ہوں جو اپنے بیٹوں کی الماری سے چراتا ہوں اور وہ بعد میں دہائی دیتے ہیں کہ ابو آپ نے میری پیلی ٹی شرٹ کا ستیاناس کر دیا ہے' پہلے وہ میڈیم تھی اور اب آپ کے پہننے سے ایکسٹرا لارج ہو گئی ہے...... آپ کی توند نے اسے تھیلا بنا دیا ہے لیکن میں پھر بھی جوان رہنے کے چکر میں باز نہیں آتا...... ڈینم کی نیکریں بھی پہنتا ہوں کہ کیا پتہ کب مقامی طالبان ان پر بھی پابندی لگا

دیں اور ان کے علاوہ ہر لمحہ گنگناتا رہتا ہوں کہ...... ہوا بھی خوشگوار ہے...... ترنم ہزار ہے...... گلوں پہ بھی نکھار ہے...... اور جناب عالی ابھی تو میں جوان ہوں...... چونکہ میں بھی کچھ ہی عرصے بعد بابا ہونے کو ہوں اس لیے میری ان بابوں کے ساتھ گاڑھی چھنتی ہے بلکہ ایک باباجی تو ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہو چکے ہیں اور جونہی میں پارک میں داخل ہوتا ہوں تو وہ نعرہ لگاتے ہیں ''اوئے لفنگے آ گیا ہے'' میں ان کے قریب آتا ہوں تو کہتا ہوں کہ ہاں میں لفنگوں سے ملنے آ گیا ہوں...... اس پر تمام بابا لوگ بے حد خوش ہوتے ہیں...... تو آج باغ کے یہ بابے بہت خوش تھے۔

فرینک بابے نے حسب معمول وہی نعرہ لگا کر میرا استقبال کیا اور قریب آیا تو کہنے لگا۔ ''اوئے اب تو بابوں کی عیش ہو گئی ہے۔''

''یعنی آج پھر کسی نے سب کو ناشتے پر مدعو کر لیا ہے؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔

''توبہ توبہ...... '' سب بابوں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''ناشتے سے توبہ......''

اور یہ توبہ استغفار یوں ہو رہی تھی کہ پچھلے دنوں پارک کے سب سے عمر رسیدہ باباجی نے اپنے دوستوں سے کہا کہ وہ اگلے اتوار ان کو قصور میں اپنے عزیزوں کے ہاں لے جائیں گے اور ایسا شاندار قصوری ناشتہ کروائیں گے کہ وہ لاہوری ناشتے کو بھول جائیں گے...... عزیزوں کو اطلاع کر دی گئی ہے اور وہ ابھی سے ناشتے کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے ہیں...... چنانچہ اتوار کے روز پارک میں سیر کرنے کے بعد دس بارہ بابے اور نیم بابے جلوس کی صورت میں قصور روانہ ہو گئے' قصور پہنچ کر میزبان باباجی کے عزیزوں کے گھر جا کر دروازے پر دستک دی تو عزیز ابھی خوابیدہ تھے' آنکھیں ملتے ہوئے باہر آئے' اپنے عزیز باباجی کے ساتھ بابوں کا ایک جم غفیر دیکھا اور چکرا گئے...... میزبان باباجی نے اپنے دوستوں سے کہا۔ ''آ جاؤ آ جاؤ' اپنا ہی گھر ہے''۔ اور پھر اپنے عزیز سے کہا۔ ''ناشتہ تیار ہے تو لے آؤ''۔ قصوری عزیز کی سٹی گم ہو گئی لیکن اس نے قطعی طور پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ اسے اس دعوت کے بارے میں کچھ علم نہیں...... اب باباجی کے دوستوں کو بھی شک سا ہوا کہ شاید باباجی اپنے بھلکڑ پن کی وجہ سے اپنے عزیز کو اطلاع نہیں کر سکے...... بہر حال اس وقت اس پریشان حال عزیز نے بازار جا کر جو کچھ بھی دستیاب ہوا' حاصل کر کے بابوں کی اس فوج

کے سامنے رکھ دیا...... ان میں سے بیشتر اتنے شرمندہ تھے کہ انہوں نے بعد میں لاہور واپس آ کر ناشتہ کیا...... اب کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اصل قصہ کیا ہے کیونکہ میزبان باباجی نہایت معزز شخص تھے اور یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ انہوں نے یونہی کہہ دیا ہو کہ میں نے قصور میں اپنے عزیزوں کو کہہ دیا ہے کہ دس بارہ افراد کے ناشتے کا اعلیٰ بندوبست کر دیا جائے اور عقدہ کچھ روز بعد کھلا کہ دراصل باباجی نے اپنے عزیزوں کو ناشتے کی خبر تو کر دی تھی لیکن بھول گئے کہ کس عزیز کو خبر کی تھی اور بابوں کی فوج ظفر موج کو ایک اور عزیز کے گھر لے گئے' جو لاعلمی میں مارے گئے...... اس قصے کا پر لطف پہلو جو ابھی تک پوشیدہ ہے' یہ ہے کہ جس عزیز کو سچ مچ خبر کی گئی تھی' وہ غریب دس بارہ بندوں کے ناشتے کا بندوبست کر کے بیٹھا انتظار کرتا رہا ہو گا...... اب یہ صورت حال ہے کہ وہ باباجی اب تک یہ نہیں جانتے کہ وہ اپنے دوستوں کو غلط عزیز کے گھر لے گئے تھے اور اب پھر کہتے ہیں کہ میں کسی روز تمہیں پھر ناشتے کے لیے قصور لے کر جاؤں گا اور لوگ ان سے چھپتے پھرتے ہیں...... اسی قصے کے بعد بابے ناشتے کے نام پر کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے۔

''تو پھر بابوں کی عیش کس سلسلے میں ہو گئی ہے؟'' میں نے لفنگے بابے سے پوچھا۔

''یار! ابھی تک تفصیل نہیں ملی لیکن سنا ہے کہ کل رات خبر نامے میں بزرگوں اور بابوں کے لیے ایک پیکیج اناؤنس ہوا ہے...... تم نے خبریں سنی تھیں؟''

''نہیں...... مجھے خبر نامہ دیکھنے اور سننے سے بہتر کام ہوتے ہیں لیکن میں ابھی ابھی اخبار میں اس بابا پیکیج کی تفصیل پڑھ کر آیا ہوں۔'' تمام بابوں نے شور مچا دیا۔ ''بتاؤ بتاؤ...... حکومت نے ہمیں کیا کیا سہولتیں دی ہیں...... اس پیکیج میں؟''

''آپ کا کیا خیال ہے کہ اس پیکیج میں کیا کیا ہونا چاہیے؟''

اس پر ایک باباجی' جنہیں زمانے کی ہوا لگی ہوئی ہے' بولے...... اور یہ ہوا لگنے کا قصہ کچھ یوں ہے کہ صبح سویرے جب سیر کرتے ہوئے ہمارا آمنا سامنا ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ مجھ سے ایک شعر سنانے کی فرمائش کرتے ہیں...... میں شعر یاد رکھنے کے معاملے میں بالکل پھسڈی ہوں پھر بھی کوشش کر کے کوئی اوٹ پٹانگ شعر سنا دیتا ہوں' کچھ بھی یاد نہ آ رہا ہو تو کسی فلمی گانے کے بول سنا دیتا ہوں تو وہ خوش ہو جاتے ہیں اور دعائیں دیتے چلے جاتے

ہیں...... ایک روز بارش کی وجہ سے سردی بہت بڑھ گئی تھی اور ہوا میں ایک خنک کاٹ تھی اور میں نے دیکھا کہ یہ باباجی صرف ایک سوئٹر میں کوٹ اور مفلر کے بغیر بانکوں کی طرح چلے آرہے ہیں' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''جناب! احتیاط کیا کیجیے...... ہوا لگ جائے گی''۔ وہ ہنس کر بولے۔ ''ہوا تو مجھے انیس سو پینتیس میں لگ گئی تھی جب میں پہلی بار پیرس گیا تھا...... اب کیا لگے گی''۔ تو یہ باباجی بولے۔ ''بھئی اس بوڑھوں کے لیے پیکیج میں ہوائی جہاز اور ٹرین میں سفر کے لیے آسانیاں ہوں گی...... کرایہ نصف ہوگا...... مضبوط بوڑھوں کے لیے حکومتی ملازمتیں ہوں گی...... کچھ ماہانہ جیب خرچ کا بندوبست ہوگا...... تفریح کے لیے خصوصی کلب ہوں گے...... بسوں میں الگ نشستیں ہوں گی...... بابوں کے میلے ہوں گے...... آخر پہلی بار حکومت کو سینئر سٹیزن کا خیال آیا ہے تو کم از کم یہ سب کچھ تو ہوگا۔''

''شاید ان بابوں کے لیے جن کی بیگمات ان کو داغ مفارقت دے چکی ہیں' چند روزہ شادیوں کا بھی بندوبست ہوگا''۔ ایک شریر بابے نے کہا۔ دراصل یہ سب بابے اس چھریرے بدن کے باباجی سے حسد کرتے تھے جن کے بارے میں افواہ تھی کہ ان کی تین بیویاں ہیں اور ان میں سے ایک آدھ آگے پیچھے ہو جائے تو اسے فوراً ری پلیس کر لیتے ہیں......

''جناب! یہ سہولتیں جن کا آپ نے ذکر کیا ہے' کچھ بھی نہیں...... اس پیکیج میں ایک نہایت انقلابی قدم اٹھایا گیا ہے اسی لیے تو اسے ٹیلی ویژن اور اخباروں میں اتنا نمایاں کیا جا رہا ہے...... دُنیا بھر میں کہیں بھی بابوں کی فلاح و بہبود کے لیے وہ کچھ نہیں کیا گیا جو کچھ ہماری حکومت نے کیا ہے''۔

''جلدی بتاؤ...... فوراً بتاؤ''۔ بابوں نے پھر شور مچا دیا۔

''میں نے پوری خبر نہایت عرق ریزی سے پڑھی ہے...... اس میں کچھ سفارشات ہیں جن پر ابھی غور ہوگا اور ان میں سماجی بہبود کے اداروں' تنخواہ اور پنشن کمیٹیوں اور زکوٰۃ کونسل میں ان کی شمولیت...... ہسپتالوں میں مفت دوائیوں اور بوڑھوں کی بھلائی کرنے والی این جی اوز کے لیے آسان قسطوں پر زمین کا حصول وغیرہ شامل ہیں...... لیکن ان پر ابھی غور ہوگا''۔

''لیکن وہ انقلابی قدم کیا ہے' جس کا اعلان اس پیکیج میں کر دیا گیا ہے؟'' بوڑھے بے قرار ہو گئے۔

''وہ انقلابی قدم یہ ہے کہ بوڑھوں کے قومی شناختی کارڈ کا رنگ مختلف ہوگا۔''

''اس سے کیا ہوگا......؟''

''مجھے کیا پتہ کہ کیا ہوگا...... حکومت کا کہنا ہے کہ بوڑھے ہر وقت یہ کارڈ اپنے ہاتھ میں تھامے لوگوں کو دکھائے رہیں گے اور یوں سب لوگ جان جائیں گے کہ یہ بوڑھے ہیں''۔

مجھے میرے کرکٹ کمنٹیٹرز سے بچاؤ

ایک زمانے میں سجاد حیدر یلدرم نے فریاد کی تھی کہ ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ'' اگرچہ انہوں نے یہ آہ وزاری نہایت سنجیدگی سے کی تھی لیکن ادب کے نقادوں نے اسے طنز ومزاح سے بھرپور شاہکار قرار دے دیا۔ اس زمانے میں اسی قسم کے بے شمار مضمونوں کی گنجائش پیدا ہوگئی ہے' جن میں ''بچاؤ بچاؤ'' کی فریاد کی جاسکتی ہے لیکن ہم مروت میں مارے جانے والے لوگ ہیں اور وہ قتل بھی کرتے ہیں تو ہم چرچا نہیں کرتے۔ یوں بھی لوگ بہت نازک ہوتے ہیں اور ذرا سی تنقید سے چکنا چور ہوکر اپنی کرچیاں دوسروں کی آنکھوں میں اتار دیتے ہیں' چنانچہ عام طور پر اجتناب کیا جاتا ہے۔

مثلاً ایک نہایت شاندار مضمون ''مجھے میرے سیاست دانوں سے بچاؤ'' لکھا جاسکتا ہے جو یقیناً عوام الناس کے دل کی بھڑاس ہوگی لیکن ایسا مضمون لکھ کر میں تمام سیاسی پارٹیوں کو ناراض نہیں کرنا چاہتا کیونکہ محب الوطنی اور تمام کے تمام سوئس اکاؤنٹس ان کے ہاتھ میں ہیں...... یوں بھی یہ اپنے رزق پر خود قلم مارنے والی بات ہوگی کہ ٹیلی ویژن بہرطور ایک سرکاری ادارہ ہے' جس میں پچھلے دنوں وزیراعظم کا ''ٹاپ شاٹ'' دکھانے اور ایک نہایت بے ہوش خاتون کو پانی پلانے کا منظر نہ دکھانے کی پاداش میں دو پروڈیوسر حضرات کا تبادلہ کوئٹہ شہر کردیا گیا تھا جو کراچی اور لاہور میں پلے بڑھے پروڈیوسر حضرات کے لیے کالا پانی سے کم نہیں چنانچہ میں یہ رسک نہیں لے سکتا کہ ٹیلی ویژن پر ایک مرتبہ پھر میرا داخلہ ممنوع قرار دے دیا جائے۔

ایک اور مضمون ''مجھے تحریک پاکستان کے بزرگوں سے بچاؤ'' بھی تحریر کیا جاسکتا ہے.. یہ ایسے بزرگ ہیں جنہوں نے تحریک پاکستان کے دوران قائداعظمؒ کو کسی جلسے میں

اتنی دور سے دیکھا تھا کہ ان کو اگلے روز اخبار میں خبر ہوئی تھی کہ وہ جو صاحب مائیک پر کھڑے تھے' اپنے جناح جی تھے اور اس کے علاوہ انہوں نے ایک بار کسی جلوس میں پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا تھا اور اب یہی بزرگ اپنی قربانیوں کا تذکرہ کرتے نہیں تھکتے اور نئی نسل کو رگیدتے ہیں کہ آپ کو کچھ علم نہیں کہ ہم نے پاکستان کے حصول کے لیے کیا کیا قربانیاں دی تھیں اور پاکستان بنانے کا مقصد کیا تھا...... یہ نئی نسل جب اپنے آس پاس کے پاکستان کو دیکھتی ہے جسے بگاڑنے یا سنوارنے میں ایسے بزرگوں کا ہی ہاتھ ہے تو نہایت حیران ہوتی ہے کیونکہ یہ بزرگ یا کم از کم ان میں سے بیشتر بزرگ نہایت متمول ہیں اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں اور جس مقصد کے لیے انہوں نے پاکستان بنایا تھا وہ انتہائی خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہے ہیں یعنی گولڈ میڈل حاصل کر رہے ہیں اور پلاٹ حاصل کر رہے ہیں' پٹرول پمپ لگا رہے ہیں اور فارن کرنسی اکاؤنٹ کھول رہے ہیں۔ اس قسم کا مضمون لکھ کر میں ایک مرتبہ پھر غیر محب الوطن اور شرپسند عناصر کی فہرست میں شامل نہیں ہونا چاہتا۔ چنانچہ مضامین نو کا ایک انبار ہے لیکن میں ڈرپوک شخص ہوں اور سچ کہنے سے پرہیز کرتا ہوں اس لیے میں ان پر قلم نہیں اٹھا سکتا...... نہ ہی میں ''مجھے ٹیلی ویژن کے خبرنامے سے بچاؤ...... نیوز کاسٹرز کے بوسیدہ چہروں سے بچاؤ...... اخباروں کی سرخیوں سے بچاؤ...... پولیس اور رینجرز سے بچاؤ...... بیوروکریٹس سے بچاؤ...... ان پڑھ وزیروں سے بچاؤ اور ملک بچاؤ'' وغیرہ کے بارے میں کچھ تحریر کرسکتا ہوں کہ مجھے اپنی جان بہت پیاری ہے چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ مجھے ایک نہ ایک ''بچاؤ'' مضمون ضرور لکھنا ہے اس لیے ایسا موضوع چن رہا ہوں جس میں کوئی خدشہ جان کا یا مال کا نہیں ہے یعنی ''مجھے کرکٹ کمنٹیٹرز سے بچاؤ''۔

اب اس مضمون کے لکھنے سے کرکٹ پر کمنٹری کرنے والے حضرات میرا کیا بگاڑ لیں گے' زیادہ سے زیادہ مجھ پر پابندی لگا دیں گے کہ میں بقیہ عمر کرکٹ نہیں کھیل سکتا یا کرکٹ کا لفظ منہ سے نہیں نکال سکتا چاہے یہ کوڑا کرکٹ ہی کیوں نہ ہو...... آپ پوچھیں گے کہ بھلا تم ان غریب کمنٹری کرنے والوں کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو وہ تمہیں تو کچھ نہیں کہتے اگر کچھ بگاڑتے ہیں تو کرکٹ کا ہی بگاڑتے ہیں یا جس قسم کی انگریزی اور اردو بولتے

ہیں تو اپنا منہ بگاڑتے ہیں...تو ہمارے ہاں ذہن بگڑنے کی کون پروا کرتا ہے لیڈران کرام نے کبھی پروا کی ہے......تو جناب میں یہ مضمون اپنی ساس صاحبہ کی فرمائش پر تحریر کر رہا ہوں۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ میری ساس صاحبہ بہت خونخوار خاتون ہیں اور میں ان سے ڈرتا ہوں بلکہ وہ اتنی نرم خو اور پچاسی برس کی ہونے کے باوجود اتنی خوشگوار اور بے وجہ محبت کرنے والی خاتون ہیں کہ میں اکثر اپنی بیگم کو کہتا ہوں کہ تم ان پر کیوں نہیں گئیں۔ ساس صاحبہ اپنے برسوں کے باوجود جسمانی طور پر نہایت ناتواں ہونے کے باوجود زندگی میں بھرپور دلچسپی لیتی ہیں' ان کی آواز میں وہ کھنک اور شفافی ہے جو کسی جاپانی ہائی فائی سسٹم میں بھی کیا ہوگی۔ جسم ناتواں ہے مگر ذہن بالکل صحت مند اور چاک و چوبند ہے اور یہی ان کا مسئلہ ہے۔

بدن کے ساتھ ذہن بھی پژمردہ ہو جائے تو انسان ایک کونے میں بیٹھ کر عمر کی دراڑوں کو قبول کر لیتا ہے لیکن ذہن چوکنا اور نارمل ہو تو زندگی کا ساتھ نہیں چھوڑا جا سکتا...... چنانچہ ہماری ساس صاحبہ کو نہ صرف نواز شریف اور بینظیر بھٹو کے تمام تر وعدے یاد رہتے ہیں بلکہ انہیں آئی ایم ایف کی تازہ ترین شرائط کا بھی علم ہوتا ہے۔ سپورٹس میں بے حد دلچسپی لیتی ہیں اور کرکٹ کے عالمی ریکارڈز کے بارے میں وہ کم از کم سرفراز نواز سے زیادہ جانتی ہیں۔ تو ایک روز میں ان کے ہمراہ پاکستان انڈیا کا ایک روزہ میچ دیکھ رہا تھا...... ایک کمنٹری ٹیلی ویژن پر چل رہی تھی اور دوسری ساس صاحبہ کر رہی تھیں۔ میں ذرا فکر مند تھا کیونکہ انڈیا کافی سکور کر چکا تھا اور اس کا صرف ایک کھلاڑی آؤٹ تھا۔

''مشکل ہے کہ پاکستان میچ جیتے''۔ میں نے کہا......

''کیوں مشکل ہے؟'' وہ ناراض ہو گئیں۔ ''کرکٹ میں تو بیٹا کچھ پتہ نہیں ہوتا' ابھی ایک آؤٹ ہے تو ابھی پانچ آؤٹ ہیں''۔ اس تھیسس کو ثابت کرنے کے لیے انہوں نے متعدد میچوں کے حوالے دیئے۔ ''یوں بھی اللہ ہمارے ساتھ ہے ہندوؤں کے ساتھ نہیں''۔

''امی جی انڈیا کی ٹیم میں صرف ہندو ہی نہیں' سکھ اور مسلمان بھی ہیں۔''

''وہ سب کے سب ہندو ہیں......'' انہوں نے مجھے گھور کر دیکھا۔ ''اگر انڈیا

والے ہیں تو ہندو ہیں......''

اور تھوڑی دیر میں واقعی انڈیا کے پانچ کھلاڑی آؤٹ ہو چکے تھے۔ میری ساس صاحبہ مسلسل سعید انور اور وقار یونس کو مشورے دے رہی تھیں' یکدم کہنے لگیں۔ ''ہائے ہائے یہ میچ کے ساتھ شور کون مچا رہا ہے''۔

''یہ تو تماشائیوں کا شور ہے۔''

''نہیں نہیں یہ جو کمنٹری کر رہا ہے...... اسے کہو چپ کرے۔''

''امی جی اسے کمنٹری کرنے کے پیسے ملتے ہیں یہ چپ نہیں کر سکتا......''

''نہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اندھے ہیں۔ سکرین کے اوپر سکور آ رہا ہے۔ باؤلروں کی وکٹیں آ رہی ہیں' جتنی دوڑیں بیٹسمین بناتے ہیں لکھی آ رہی ہیں تو یہ بار بار ان کو کیوں پڑھتے چلے جاتے ہیں' ہم پڑھے لکھے نہیں؟ انہیں کہو یہ چپ کریں''۔

''امی جی یہ ایکسپرٹ ہیں۔ یہ چپ نہیں کر سکتے''۔

''چپ نہیں کر سکتے تو اپنے گلے کا آپریشن کرائیں...... اور یہ کون ہے جو ٹوں ٹوں کرتا ناک میں بولتا ہے نون غنے کی طرح......''

''یہ امی جی...... آپ بھی کمال کرتی ہیں' یہ ماضی کے باکمال آل راؤنڈر اور بیٹسمین انتخاب عالم' مشتاق محمد اور میاں داد ہیں......''

''ہا ہائے...... میاں داد جیسا پتر پیدا نہیں ہونا۔ پر اسے کہو بولا نہ کرے...... اور یہ آواز کس کی ہے...... ہاں ہاں کر کے بول رہا ہے......''

''یہ سرفراز نواز ہے امی جی' اور یہ بھی ایکسپرٹ ہے...... اور پلیز آپ میچ دیکھیں۔''

''میچ کیا خاک دیکھوں۔ یہ کمنٹری والے سمجھتے ہیں ہم اندھے ہیں۔ ذرا سنو تو سہی کیا کہہ رہے ہیں......''

اور میں نے سنا تو کمنٹری کچھ یوں ہو رہی تھی۔ ''نہایت شاندار...... شاندار سٹروک کھیلا...... پتہ نہیں کس نے کھیلا اور ایک شاندار چھکا...... نہیں چوکا...... نہیں دو رن...... نہیں ایک رن کیونکہ وہ تو بھاگے بھی نہیں۔ ذرا زور سے مارتے تو یقیناً چھکا ہوتا اور

اب وہ آؤٹ ہوکر جارہے ہیں اور اگلے بیٹسمین ہیں اعجاز احمد...... انہوں نے پی کیپ پہنی ہوئی ہے جاگرز پہنے ہوئے ہیں قمیص پہنی ہوئی ہے۔ ہاتھ میں ہیٹ ہے...... لیجئے انہوں نے چوکا مارا...... ذرا دیکھئے بال سکرین پر جارہا ہے۔ یہ بال سرخ رنگ کا ہے۔ گول گول ہے اردو میں بال کو گیند کہتے ہیں اور گیند کو انگریزی میں بال کہتے ہیں۔ پنجابی میں بال چھوٹے بچے کو کہتے ہیں...... تو یہ بال جارہا ہے...... لیکن فیلڈر نے اسے پکڑ لیا ہے...... بال واپس باؤلر کے پاس...... یہ انڈین باؤلر ہے۔ اس کی دوسرے ملکوں کے باؤلروں کی طرح دو ٹانگیں ہیں۔ دو ہاتھ ہیں۔ ایک ہاتھ میں بال ہے اور یہ اعجاز احمد کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ بھاگ رہے ہیں اور نہایت خطرناک بال... اعجاز آؤٹ بھی ہوسکتے تھے... اگر اعجاز اس گیند کو نہ کھیلتے تو یقیناً آؤٹ ہوسکتے تھے آؤٹ اس لیے نہیں ہوئے کہ انہوں نے نہایت مہارت سے گیند کو پرے دھکیل دیا... اعجاز کے عقب میں تین وکٹیں ہیں۔ وکٹوں کے پیچھے وکٹ کیپر ہے وکٹ کیپر کے پیچھے...... شاید ایک اور وکٹ کیپر ہے۔ کیوں چشتی مجاہد یہ ایک وکٹ کیپر کے پیچھے دوسرا وکٹ کیپر کیوں کھڑا ہے...... کیا کہا؟ آپ سے عینک بدل لوں کیونکہ مجھے ایک ایک کے دو دو نظر آتے ہیں...... کیا کریں چشتی مجاہد صاحب جب ریڈیو ایجاد ہوا تھا تو ہم کمنٹری کرنے لگے تھے تو اب نظر ذرا کمزور ہوگئی ہے...... چلیے ناظرین تو اندھے نہیں ہیں انہیں تو نظر آرہا ہے ناں۔"

اور یہ ایک حقیقت ہے کہ کرکٹ میچ انگلستان میں ہو یا آسٹریلیا میں...... اسے آپ نہایت اطمینان سے دیکھتے ہیں کمنٹری کرنے والا صرف اس وقت بولتا ہے جب کوئی خاص موقع ہو خاص معلومات ہو ورنہ وہ ناظرین کی بصارت پر اعتماد کرتا ہے۔ اس سکور بورڈ پر اعتماد کرتا ہے جو سکرین پر آتا ہے... ہمارے تمام کمنٹیٹر یہ سمجھتے ہیں کہ اگر مائیک ان کے سامنے ہے تو انہوں نے سانس لینے کے لیے بھی نہیں رکنا اور بولتے چلے جانا ہے...... ناظرین کو سکرین پر دکھائی جانے والی ہر شے ہر بال پر کھلاڑی کے بارے میں بتانا ہے کہ اے نابینا حضرات یہ ایک درخت ہے۔ یہ گیند ہے اور گول گول ہے اور یہ انضمام الحق ہے مبادا آپ اسے باکسر محمد علی سمجھیں...... کوئی پاکستانی بلے باز ایک سٹروک اچھا کھیلتا ہے تو اس کی توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگتے ہیں کہ اب تو یہ سنچری کرے گا اور

اسے اگلے بال پر آؤٹ کروا دیتے ہیں...... انہیں ابھی تک علم نہیں کہ ٹیلی ویژن ایجاد ہوچکا ہے وہ ابھی تک ریڈیو پر کمنٹری کررہے ہیں۔

"بیٹا......" میری ساس صاحبہ نے اکتا کر کہا۔ "ذرا ٹیلی ویژن کی آواز تو بند کردو... میں تھوڑا سا میچ دیکھ لوں۔"

میں نے ٹیلی ویژن کی ساؤنڈ بند کی تو ہر طرف سکون ہوگیا۔ اور کرکٹ میچ از حد پرلطف اور دلچسپ ہوگیا...... چنانچہ "مجھے میرے کرکٹ کمنٹیٹرز سے بچاؤ" لکھنے کی بجائے ٹیلی ویژن کی آواز بند کردینا زیادہ مناسب ہوگا۔

ازار بند لٹک رہا ہے...

خلیفہ خلفشاری نہ صرف پوری قوم سے اور قوم کے لیڈروں سے نالاں رہتے ہیں بلکہ مجھ سے بھی نالاں رہتے ہیں جب بھی ملتے ہیں مجھ میں ایسے ایسے کیڑے نکالتے ہیں کہ کیڑے بھی دنگ رہ جاتے ہیں کہ اچھا ہم یہاں قیام پذیر تھے۔ مجال ہے کبھی میری کسی بھی تحریر کی تعریف کی ہو۔ نہ صرف تحریر بلکہ میری شخصیت میں بھی کبھی انہیں توصیف کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ اگرچہ میں ان کی اس خصلت سے آگاہ ہوں لیکن ابھی تک عادت نہیں ہو سکی۔ کل میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔ گیٹ کی گھنٹی بجائی میں ان کے استقبال کو گیا تو چھوٹتے ہی کہنے لگے.. کچھ شرم کرو اگر میری جگہ کوئی خاتون ہوتی تو وہ تمہیں یوں دیکھ کر کیا کہتی۔

"خلیفہ اول تو اس عمر میں جبکہ ڈاک میں لَو لیٹرز کے بجائے صرف بجلی اور پانی کے بل آتے ہیں' کسی بھی خاتون کا مجھے ملنے کے لیے آنا محال ہے اور اگر آ جائے تو کیا' خرابی ہے مجھ میں' جو مجھے شرم آنی چاہیے۔"

"تمہارا ازار بند لٹک رہا ہے۔"

"سوری خلیفہ۔" میں نے شرمندہ ہو کر کہا اور اسے اُڑس لیا۔

خلیفہ کو اپنے کمرے میں لا کر بٹھایا تو بیٹھتے ہی بولے ویسے تمہارے لچھن ادیبوں والے نہیں ہیں۔ اپنا خیال رکھا کرو' ورنہ دنیائے ادب سے خارج ہو جاؤ گے۔

"چلو میں نے تمہارے کہنے پر ازار بند اُڑس لیا ہے۔ باقی وہ میرا کون سا لچھن ہے جو تمہیں پسند نہیں۔"

"بھئی یہ جو قمیض شلوار جناب نے زیب تن کر رکھی ہے یوں لگتا ہے کہ گھڑے

میں سے نکال کر پہنی ہو۔ کالر بھی بوسیدہ ہو کر پھٹنے کو ہے اور پاؤں میں ربڑ کی چپل ہے جو گھسیٹتے پھرتے ہو۔ ادیب ایسے ہوتے ہیں؟"

"تو اور کیسے ہوتے ہیں۔" میں نے بھنا کر کہا۔ "اچھا بھلا تو ہوں۔ رہنے کو اپنا گھر ہے۔ ذرا پرانی ہی سہی لیکن اپنی کار بھی ہے۔ پچھلے زمانے کے ادیبوں اور شاعروں کو دیکھو' بیچارے کیسی زندگیاں گزارتے تھے۔ اور میں اس زمانے کی بات نہیں کر رہا' جب قرض کی پیتے تھے مے بلکہ چند برس پہلے کا حوالہ دے رہا ہوں جب ادیبوں کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہوتی تھی۔ اسی لیے اکثر فقیر ہو جاتے تھے کہ جو بھی تیرے فقیر ہوتے ہیں وغیرہ۔ چائے کی پیالی کے لیے ترستے رہتے تھے اور لوگ اپنے بچوں کو دکھایا کرتے تھے کہ وہ دیکھو' پھٹے ہوئے کپڑوں میں جو شخص بیڑی منہ میں دبائے پچھلے دو گھنٹوں سے خلاؤں میں گھور رہا ہے وہ ادیب ہے اور خلیفہ اب تو صورت حال بہت بہتر ہو چکی ہے۔"

"ہو چکی ہے لیکن تمہاری صورت بہتر ہوئی ہے اور نہ حال۔ ذرا اپنے آس پاس نگاہ دوڑاؤ' باقی ادیب قیامت کی چال چل گئے ہیں۔ شاعروں کی تو لاٹری نکلی ہوئی ہے اور تو اور اب لوگ رشتہ تلاش کرتے ہوئے شرط پیش کرتے ہیں کہ یا تو لڑکا انکم ٹیکس یا کسٹم میں ہو اور یا پھر مزاحیہ شاعر ہو۔ اکثر ادیب اور شاعر گلبرگ اور ڈیفنس میں رہتے ہیں۔ بہترین سوٹ پہنتے ہیں۔ اگر تم ادب میں زندہ رہنا چاہتے ہو تو فوری طور پر اپنی زندگی کو نئے سرے سے ترتیب دو' ورنہ تمہاری داستان بھی نہ ہو گی داستانوں میں۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً یہ کہ تم فوری طور پر ایک لیڈی سیکرٹری کو ملازم رکھ لو۔"

"اور اس کی تنخواہ کون دے گا؟"

"تم دو گے اور کون دے گا۔ کیا تمہیں ایک لیڈی سیکرٹری کی ضرورت نہیں ہے؟"

"ہاں آں' ہے تو سہی' یعنی بہت سارے خطوط کے جواب نہیں دے پاتا۔ اتنا بھلکڑ ہو چکا ہوں کہ کسی فنکشن پر جاتا ہوں تو منتظمین وہاں موجود نہیں ہوتے کیونکہ فنکشن یا تو اگلے روز ہوتا ہے یا پچھلے روز ہو چکا ہوتا ہے' چنانچہ سیکرٹری ہو تو وہ کم از کم روزانہ مجھے تاریخ تو بتا دے۔"

"نہیں نہیں بیوقوف۔ لیڈی سیکرٹری ان میں سے کوئی کام بھی نہیں کرے گی۔"

"خلیفہ اس کے علاوہ کوئی اور کام کرے گی تو میری بیوی اعتراض کرے گی۔"

"اس عمر میں بھی کرتی ہے؟" خلیفہ کا موڈ قدرے بحال ہو گیا اور میرے کندھے پر تھپکی دے کر نہایت دردمندی سے کہنے لگا۔ "میں تمہارا خیر خواہ ہوں اس لیے لیڈی سیکرٹری رکھنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔ دیکھو تم دن رات لکھنے میں جتے رہتے ہو۔ درجنوں کتابیں ڈھیر کر چکے ہو۔ اب اور کیا کیا اور کب تک لکھو گے۔ لکھنے کا کوئی فائدہ نہیں جب تک اپنے لکھے ہوئے کو تم کیش نہ کرواؤ۔ اپنا ایک امیج نہ بناؤ۔"

"اور میں اپنا امیج کیسے بناؤں خلیفہ؟"

"ایک لیڈی سیکرٹری رکھ کر اور میں نہایت سنجیدگی سے یہ مشورہ دے رہا ہوں۔ تم ثنا سیالکوٹی کو تو جانتے ہو ناں۔ اگر جانتے ہو تو کبھی اسے ٹیلی فون کیا ہے۔ اگر کبھی فون کیا ہے تو جانتے ہو گے کہ دوسری جانب سے ایک نہایت مترنم آواز سنائی دیتی ہے کہ ثنا سیالکوٹی کی رہائش گاہ سے عرض کر رہی ہوں۔ فرمائیے۔ آپ فرماتے ہیں تو وہ کہتی ہے میں چیک کرتی ہوں کہ ثنا صاحب موجود ہیں یا نہیں۔ دراصل آج انہیں دو تقریبات کی صدارت کرنی ہے اور اپنی تازہ ترین کتاب تمام وزرا' مرکزی سیکرٹریوں' صوبائی گورنروں اور قومی اخباروں کے مدیروں کو روانہ کرنی ہے۔ انتظار کیجئے اور پھر فون پر موسیقی شروع ہو جاتی ہے' جو بجتی ہی چلی جاتی ہے۔"

خلیفہ بالکل درست کہہ رہا تھا۔ میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ ایک روز وہ ثنا سیالکوٹی کے پاس بیٹھے تھے کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ثنا نے قطعی طور پر فون نہیں اٹھایا۔ میں نے سبب پوچھا تو ثنا صاحب کہنے لگے۔ یار میں اب اپنا فون اٹینڈ نہیں کرتا۔ اس کام کے لیے میں نے ایک لیڈی سیکرٹری رکھی ہوئی ہے اور وہ ابھی ابھی باتھ روم میں گئی ہے۔ وہ آئے گی تو اٹھائے گی۔ کچھ دیر کے بعد لیڈی سیکرٹری صاحبہ کمرے میں تشریف لے آئیں۔ وہ سیکرٹری تو ہو سکتی تھیں لیکن اگر لیڈی تھیں تو بہت مخدوش سی۔ خاصی عمر رسیدہ اور نہایت واجبی سی تعلیم یافتہ۔ اس دوران پھر فون کی گھنٹی بجی تو انہوں نے فون اٹھا کر نہایت مترنم آواز میں کہا۔ ثنا سیالکوٹی کی رہائش گاہ سے عرض کر رہی ہوں۔ فرمائیے۔ جی نہیں ثنا صاحب تو گھر

پر موجود نہیں آپ پیغام لکھوا دیجئے۔ اور ثنا صاحب سامنے بیٹھے سگریٹ کے سُوٹے لگا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ لیڈی سیکرٹری کا صرف یہی کام تھا کہ وہ ٹیلیفون اٹینڈ کریں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ پورے شہر میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی کہ یار ثنا کو فون کریں تو اس کی لیڈی سیکرٹری جواب دیتی ہے۔۔ ثنا کی تحریروں نے کبھی اس کو اتنی عزت نہیں دی تھی جتنی ایک ادھیڑ عمر سیکرٹری رکھنے سے اسے حاصل ہو گئی تھی۔

"چلو یہ بھی مان لیا کہ مجھے ایک لیڈی سیکرٹری کی اشد ضرورت ہے ورنہ میرا ادبی مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ میرے گھر میں جو ایک اماں صفائی کرنے کے لیے آتی تھی اور اب بڑھاپے اور گھٹنوں کے درد کے ہاتھوں اپنے گھر میں پڑی رہتی ہے اسے اٹھا کر لے آؤں گا اور ایک صوفے پر بٹھا دوں گا کہ اماں یہ ٹیلی فون آئے تو تم نے اسے اٹھا کر صرف "ہیلو ہیلو" کر دینا ہے باقی میں سنبھال لوں گا۔ اچھا اس کے علاوہ مجھے اپنا امیج بنانے کے لیے اور کیا کرنا ہے؟"

"تمہیں ایک شوفر رکھنا ہوگا۔ کچھ عرصہ پہلے سکیورٹی گارڈز رکھنے کا رواج تھا لیکن اب تمام اہم ادیب خود گاڑی ڈرائیو نہیں کرتے انہوں نے شوفر رکھے ہوئے ہیں۔ تم بھی رکھ لو۔"

"اور اس شوفر کی تنخواہ کون دے گا؟"

"وہ بھی تم دو گے امیج بنانے کے لیے یہ چھوٹی چھوٹی قربانیاں دینی پڑتی ہیں مجھے معلوم ہے کہ لیڈی سیکرٹری اور شوفر رکھنے کے بعد تم کسی حد تک قلاش ہو جاؤ گے لیکن ادب میں تمہارا مقام بہت بلند ہو جائے گا۔"

"ویسے خلیفہ تم نے بڑے کام کے مشورے دیئے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں میں ایک تقریب سے باہر آیا تو قاہر ایمن آبادی اپنی پرانی کار جو اتنی مختصر ہے کہ وہ بمشکل اس میں سماتا ہے اس کے پاس تیز دھوپ میں کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا کہ برادر قاہر کیا کار کی چابی گم ہو گئی ہے یا سٹارٹ نہیں ہوتی جو یوں دھوپ میں کھڑے نچڑ رہے ہو۔ اس پر برادر قاہر نے میری نادانی پر تبسم کیا اور کہنے لگا۔ میں تو خود ڈرائیو نہیں کرتا۔ ڈرائیور رکھا ہوا ہے جو نیلا گنبد آلو چھولے کھانے چلا گیا ہے۔ اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ کار میں بیٹھ کر انتظار

کیوں نہیں کرتے تو اس نے میری مزید نادانی پر مزید تبسم کیا اور بولا۔ وہ آئے گا میرے لیے کار کا دروازہ کھولے گا تو پھر بیٹھوں گا ڈرائیور ہوتا کس لیے ہے۔''

''اللہ تمہارا بھلا کرے''۔ خلیفہ خوش ہو گیا۔ ''اب خدا لگتی کہو۔ جب تم ثنا سیالکوٹی کو فون کرتے ہو تو اس کی لیڈی سیکرٹری فون اٹھاتی ہے اور جب قاہر ایمن آبادی کا ڈرائیور اس کے لیے دروازہ کھولتا ہے تو تم اپنے آپ کو حقیر نہیں سمجھتے حسد کی آگ میں جل کر راکھ نہیں ہو جاتے؟''

''ہاں خلیفہ۔ واقعی میں اپنے آپ کو واقعی دو ٹکے کا سمجھنے لگتا ہوں اور میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ میں اپنے ادبی مرتبے کو بلند کرنے کے لیے بھوکا رہ لوں گا لیکن ایک لیڈی سیکرٹری اور ایک شوفر ہر صورت میں ملازم رکھوں گا۔ اس کے علاوہ اور کچھ؟''

''اس کے علاوہ یہ کہ اپنے ازار بند کا خیال رکھا کرو۔ پھر سے لٹک رہا ہے۔''

گائے شاعری کھا گئی

ملک بھر کے ادیب اور شاعر ابھی پاک ٹی ہاؤس لاہور کے مالک کی اس دھمکی سے کہ وہ یہ چائے خانہ بند کر کے اس کی جگہ ٹائروں کی دکان کھول رہے ہیں' سنبھل نہیں پائے تھے کہ ایک اور اندوہناک خبر کی بجلی ان پر گری اور وہ یہ کہ ملتان کے نواح میں ایک شاعر امریکہ یا انگلستان سے خاص طور پر اس لیے وطن آئے تھے کہ وہ یہاں اپنی بے مثال شاعری کا دیوان زیور طبع سے آراستہ کر سکیں' لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا...... ان کی شاعری کا مسودہ ایک گائے نے کھا لیا...... اس پر شاعر قابل فہم طور پر بے حد غضبناک ہوئے اور انہوں نے طیش میں آ کر اس گائے کو ذبح کر دیا...... یوں یہ گائے شاعری کے شہدا میں شامل ہو گئی...... ظاہر ہے اس المناک سانحہ کا مجھ پر بھی گہرا اثر ہوا اور میں نے اپنا غم بانٹنے کے لیے خلیفہ خلفشاری سے رابطہ کیا' خلیفہ بجائے اس کے کہ اردو شاعری کے اس عظیم نقصان پر رنجیدہ ہوتے' بے حد خوش ہوئے اور بغلیں بجانے لگے۔

''خلیفہ یہ تو میں جانتا ہوں کہ تم بنیادی طور پر شاعروں' ادیبوں' دانشوروں اور سیاستدانوں کو ناپسند کرتے ہو لیکن ذوق جمال بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے...... کیا پتہ وہ مسودہ چھپ جاتا تو ایک اور حافظ یا غالب ہمیں مل جاتا''۔

خلیفہ نے بغلیں بجانا موقوف کیا اور کہنے لگے۔ ''دراصل میں تو اس بات پر خوش ہو رہا ہوں کہ اس گائے کی مہربانی سے اس ملک کا کم از کم ایک لاکھ روپیہ بچ گیا ہے جو اس مجموعے کی اشاعت پر خرچ ہونا تھا اور درجنوں لوگ اس کوفت سے بچ گئے ہیں جو اس شاعری کو پڑھنے سے ہونی تھی...... باقی رہی حافظ و غالب کی بات...... تو ایک شاعر جو اتنا لاپروا ہے کہ اپنا دیوان گائے کے آگے ڈال دیتا ہے' وہ بڑا شاعر نہیں ہو سکتا...... شاعر حضرات تو اپنے

ایک ایک مصرعے کو سینت سینت کر رکھتے ہیں اور اسے اپنی معنوی اولاد قرار دیتے ہیں''۔

''بھئی شاعر نے اپنا مسودہ کوئی جان بوجھ کر گائے کے آگے اس کے چارے کی کُھرلی میں تو نہیں ڈالا ہوگا...... بس کوتاہی ہوگئی...... ہوسکتا ہے وہ گائے شاعری کی شوقین ہو اور اپنے شوقِ شعر کو جگالی سے بلند کر رہی ہو''۔

''گائے اتنی بیوقوف نہیں ہوتی بے شک وہ اللہ میاں کی گائے ہو کہ وہ جان بوجھ کر شاعری کھا جائے...... مجھے دُکھ تو اس بات سے ہوا ہے کہ موصوف نے طیش میں آ کر اسے ذبح کر ڈالا...... اگر وہ گائے زندہ رہتی تو میں اسے حاصل کر کے شہر شہر، قریہ قریہ گھومتا اور اسے زیرِ طبع شاعری کے مسّودے کھلاتا...... ویسے مجھے شک ہے کہ گائے اس شاعری کو گھاس سمجھ بیٹھی ہوگی اور کھانے کے بعد اسے بدہضمی ہوگئی ہوگی...... اس پر شاعر نے سوچا ہوگا کہ اگر یہ خبر باہر نکل گئی کہ میری شاعری کھانے سے ایک گائے کو بدہضمی ہوگئی ہے تو سخت بدنامی ہوگی، اس لیے موصوف نے گائے کے گلے پر چھری پھیر دی''۔

''یہ بھی تو ممکن ہے کہ ان کے کسی حاسد نے جان بوجھ کر ان کا مسّودہ گائے کے چارے میں شامل کر دیا ہو تا کہ ان کی عمر بھر کی محنت گوبر میں بدل جائے...... مجھے لاہور کے ایک شاعر کا قصہ یاد ہے، جن کی شاعری کا اوّلین مسودہ چوری ہوگیا تھا...... اس پر ان کے یار دوستوں نے جشن منایا تھا اور اس چور کا شکریہ ادا کیا تھا''

''ایک اور امکان بھی ہوسکتا ہے...... ان دنوں ممالکِ غیر میں آباد پاکستانی نژاد باشندے دھڑا دھڑ شاعر ہو رہے ہیں...... پاکستان سے باقاعدہ وفود وہاں جاتے ہیں اور انہیں پیکیج ڈیل آفر کرتے ہیں کہ شاعری ہم کر کے دیتے ہیں...... فلیپ ہم لکھوا کر دیتے ہیں اور شائع ہم کرتے ہیں...... افتتاحی تقریب میں مضامین پڑھوانے کی بھی ذمہ داری ہماری تو کُل پانچ ہزار ڈالر معاوضہ ہوگا...... البتہ افتتاحی تقریب میں سینڈوچز کے علاوہ اگر رس گلے اور گلاب جامن بھی درکار ہیں تو ان کے لیے ایک سو ڈالر الگ ہوں گے اور اس کاروبار میں بھی مقابلہ بہت سخت ہے...... چنانچہ یہ عین ممکن ہے کہ ان شاعر نے کسی ایک ایسے شاعر ناشر کو ٹھیکہ دے دیا ہو اور دوسری پارٹی نے تاؤ کھا کر ایک گائے کو اس کام پر آمادہ کیا ہو کہ وہ یہ مسّودہ نوش کر جائے تا کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے شاعری......''

''تم گھاس تو نہیں کھا گئے خلفشاری...... یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ناراض ناشر نے لاہور سے کوئی شعر فہم گائے حاصل کی ہو اور اسے ہانکتا ہوا ملتان تک لے گیا ہو اور پھر چوری چھپے شاعر کے گھر میں لے جا کر اسے مسودہ کھانے پر مائل کر لیا ہو...... چلو فرض کر لیتے ہیں کہ یہ وقوعہ اسی طور ظہور پذیر ہوا تو وہ گائے کو واپس کیوں نہ لے گیا...... وہیں کیوں چھوڑ گیا؟''

''اس لیے کہ گائے کو بدہضمی ہوگئی تھی، وہ اسے لاہور واپس لے جاتا تو مزید مسودے نہیں کھلا سکتا تھا...... ایک گائے آخر کتنی شاعری کھا سکتی ہے''۔

''ہاں آج کل تو ہر نوخیز شاعر کے دیوانوں کی تعداد میں چالیس سے کم نہیں ہوتی، انہیں کھانے کے لیے تو ایک پورا ریوڑ درکار ہے''۔

''ویسے مجھے یہ بھی یقین ہے کہ شاعر نے غلط گائے کو ذبح کر دیا ہے...... اصل گائے اس کے ہاتھ نہیں آ سکی...... کیونکہ یہ گائے کبھی ہاتھ نہیں آتی''۔

''یہ گائے......؟''

''ہاں...... یہ گائے ایک ہی ہے، اسے مسّودے اور رپورٹیں کھانے کی عادت ہے...... تمہیں پتہ ہے ناں کہ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ بھی ایک گائے ہی کھا گئی تھی''۔

''یہ تم کیا الٹی سیدھی ہانک رہے ہو خلیفہ...... ہم شاعری کے مسودے کے بارے میں کفِ افسوس مل رہے ہیں اور تم بیچ میں اس رپورٹ کو لے آئے ہو''۔

''یہی بات تو تمہاری ناقص عقل میں نہیں آ رہی...... جب سے پاکستان بنا ہے، اس کے ساتھ ہی یہ گائے بھی تخلیق ہوگئی تھی...... اس گائے کا ہاضمہ بڑا زبردست ہے...... اسے تم بیوروکریسی کی گائے بھی کہہ سکتے ہو، سیاسی گائے یا پھر مقدس گائے بھی کہہ سکتے ہو...... یہ ہر اُس مسّودے، رپورٹ، فیصلے کو کھا جاتی ہے جس کے شائع ہونے سے عوام الناس کو حقائق کا علم ہو جائے اور صاحبانِ اقتدار مشکوک ہو جائیں...... یہ کتنی شرم کی بات ہے کہ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ ہندوستان کو سپلائی کر دی گئی اور ہمیں خبر تک نہ ہوئی...... اگرچہ ہم سب ان حقائق کے بارے میں آگاہ تو تھے لیکن پھر بھی ہر کوئی سناٹے میں آ گیا''۔

''ہاں خلیفہ......''۔ مجھ پر بھی خلیفہ کا قنوطی موڈ اثر کرنے لگا۔ ''کسی نے سچ کہا تھا

کہ ہم ایک شتر مرغ کی طرح ہیں یعنی حقائق کا سامنا نہیں کرتے بلکہ ریت میں سر چھپا کر سمجھتے ہیں کہ سب اچھا ہے...... چین میں ٹرین چند منٹ لیٹ ہو جائے تو ٹرین کا پورا عملہ فوری طور پر سر جوڑ کر میٹنگ کرتا ہے کہ کس کی اور کہاں غلطی ہے جو ایسا ہوا اور پھر آگے چلتے ہیں...... ہم نے آدھا ملک گنوا دیا اور پھر بھی آگے چلتے رہے بلکہ خوش ہوئے کہ اب مغربی پاکستان زیادہ خوشحال ہوگا بلکہ یہی تو اصل پاکستان ہے...... میں پچھلے دنوں ڈیفنس ڈے کے ایک ٹیلیویژن شو کی میزبانی کے لیے کوئٹہ گیا تو وہاں جتنے بھی مسلح افواج کے سینئر افسر تھے' وہ اسی موضوع پر بات کر رہے تھے کہ جہاں جاتے ہیں یہی رپورٹ زیر بحث ہوتی ہے اور ان کا نقطہ نظر بالکل حقیقت پر مبنی تھی...... اس رپورٹ کا موجودہ مسلح افواج سے تو کوئی تعلق نہیں...... آج کا نوجوان افسر تو اس کے لیے جوابدہ نہیں ہے...... ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ جن کا قصور تھا' انہیں کٹہرے میں کھڑا کر کے سزائیں دی جاتیں تاکہ ان کے گناہوں کا خمیازہ سب کو تو نہ بھگتنا پڑتا''۔

''تم کہتے تو درست ہو لیکن ہم اس گائے کا کیا کریں جو تمام حقائق کھا جاتی ہے...... نگل جاتی ہے اور ڈکار تک نہیں لیتی...... اس رپورٹ کے آنے کے بعد ہر کوئی بیان بازی میں مصروف ہے' یہاں تک کہ جن کے بارے میں ہر کوئی جانتا ہے کہ وہ نرسوں کو زبردستی ہیلی کاپٹر سے اتار کر خود سوار ہوئے تھے اور اپنی کمان چھوڑ کر بھاگ آئے تھے' وہ بھی اپنی بے گناہی کی ڈفلیاں بجا رہے ہیں...... کچھ عرصہ پہلے میں نے اپنے ٹائیگر نیازی کا انٹرویو پڑھا تھا جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ وہ نپولین اور خالد بن ولید کے ہم پلہ جرنیل ہیں اور قوم نے ان کی قدر نہیں کی...... اب بھی اس رپورٹ کے حوالے سے انہوں نے بیان دیا ہے کہ وہ تو کلکتہ فتح کر سکتے تھے لیکن انہیں ایسا کرنے نہیں دیا گیا''۔

''لیکن خلیفہ اس رپورٹ کا ایک منفی پہلو بہرحال یہ ہے کہ صرف مشرقی پاکستان میں فوجی شکست کو زیر بحث لایا گیا ہے جبکہ اس کے سیاسی پہلو کو مکمل طور پر نظرانداز صرف اس لیے کر دیا گیا ہے کہ عدالت کی تفتیش کو محدود کر دیا گیا تھا...... اگر چھان بین ہونی ہے تو مکمل ہو...... صرف ایک فریق کی غلطیاں زیر بحث نہیں لائی جا سکتیں''۔

''تم دیکھ لینا اس بار بھی کچھ نہیں ہوگا کیونکہ یہ گائے بہت طاقتور ہے' بہت

بارسوخ ہے...... فنانس کمپنیوں اور کوآپریٹو کے بارے میں کیا ہوا ہے' انہیں بھی گائے کھا گئی ہے ناں...... اوجڑی کیمپ کدھر گیا...... ہمارا قومی وقار کدھر گیا''۔

''تو پھر ہم کیا کریں......؟''

''ہم حسب عادت اور حسب سابق ریت میں سر دبا کر یہ شعر پڑھتے رہیں۔

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی''

خان سلیم اور اندھوں کے وارڈ کی پیاری ڈاکٹر صاحبہ

ایک زمانے میں خلیفہ خلفشاری کہا کرتے تھے کہ میاں تم نے بیگم پر جتنا رُعب ڈالنا ہے انہی دنوں ڈال لو...... جو کچھ منوانا ہے' ابھی سے منوا لو ورنہ دیر ہو جائے گی۔ ان کی یہ منطق میری سمجھ میں نہ آتی اور میں پوچھتا خلیفہ بدقسمتی سے بیگم تو یہی رہے گی کیونکہ اس کی تبدیلی کا زیادہ امکان نہیں تو جیسی آج ہے' کل بھی ویسی ہی رہے گی...... رُعب ہم نے کیا ڈالنا ہے کہ ہم تو بھیگی بلی بنے بیٹھے رہتے ہیں اس کے سامنے...... اور منوانا کیا ہے' ہم تو خود ماننے والوں میں سے ہیں لیکن یہ بتاؤ کہ انہی دنوں یہ کام کر جانے کے مشورے کیوں دے رہے ہو اور دیر کیسے ہو جائے گی......

خلیفہ دانشور شخص ہے اس لیے خوب دانشمندی سے سر ہلا کر کہنے لگا۔ "جوں جوں عمر بڑھتی ہے' بیوی کی بنیاد مضبوط ہوتی جاتی ہے...... تمہیں اس کی موجودگی...... اس کے ہاتھوں کے بنائے ہوئے کھانوں اور دیگر آسائشوں کی عادت ہوتی جاتی ہے...... یہاں تک کہ بڑھاپے میں وہ باقاعدہ پیاری لگنے لگتی ہے...... اس لیے بھی کہ آپ کو کوئی اور تو پوچھتا نہیں...... لیکن بیوی کے مضبوط ہو جانے کی سب سے بڑی وجہ اولاد کا جوان ہو جانا ہوتا ہے...... ماں کیسی بھی ہو' بچے ہمیشہ اس کا ساتھ دیتے ہیں اور یہی وہ ٹرمپ کے پتے ہوتے ہیں جو وہ تمہارے خلاف استعمال کرتی ہے...... پھر وہ تمہیں بالکل لفٹ نہیں کرواتی اور جوانی میں تم نے جو بے اعتنائی برتی ہوتی ہے' اس کے خوب خوب بدلے لیتی ہے...... اس لیے اگر رُعب ڈالنا ہے تو ابھی سے ڈال لو...... وگرنہ دیر ہو جائے گی۔"

خلیفہ واقعی مستقبل کو بھانپ لینے والا شخص ہے' اس کی بات سو فیصد درست ثابت ہوئی ہے...... مثلاً ایک زمانہ تھا کہ اگر کھانے کی میز پر من پسند ڈش نہیں ہوتی تھی تو ناک

بھوں چڑھا کر اُٹھ جاتے تھے اور کسی ریستوران میں جا براجمان ہوتے تھے اور اب تو یہ حالت ہے کہ اروی اور بینگن کا بھرتہ کھانے سے انکاری ہو جائیں تو بیگم فوراً بچہ لوگ سے شکایت کر دیتی ہے کہ دیکھو میں نے کتنی محنت سے اروی' بینگن پکائے ہیں اور تمہارے ابو انہیں ہاتھ نہیں لگا رہے۔ اس پر بچہ لوگ پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ ابو یہ تو زیادتی ہے' آپ اروی' بینگن کیوں نہیں کھاتے' ان میں طرح طرح کے وٹامن ہوتے ہیں' کون سے ہوتے ہیں' یہ تو پتہ نہیں' لیکن ہوتے ضرور ہیں ورنہ اتنی صدیوں سے لوگ اروی' بینگن کیوں کھا رہے ہوتے' فوراً کھائیے ورنہ ہم ناراض ہو جائیں گے...... اسی طور اگر بیگم کسی لوٹ سیل میں سے میرے لیے کوئی گلابی ٹی شرٹ لے آئے تو وہ بھی پہننی پڑتی ہے...... اپنی کسی بوڑھی فرینڈ سے تعارف کروائے تو اس کے ساتھ خوشگوار گفتگو دل پر جبر کر کے کرنی پڑتی ہے...... خلیفہ نے درست کہا تھا کہ اس عمر میں بیوی کی بنیاد مضبوط ہو جاتی ہے اور یہ اس کی مہربانی ہوتی ہے کہ وہ آپ کا بستر بیڈ روم سے اٹھا کر برآمدے میں نہیں ڈال دیتی۔

مجھے دراصل حیرت اس بات پر ہوئی کہ لاہور سے ایک ہزار کلو میٹر دور گلگت سے آگے وادیٔ نلتر سے تین روز کی پیدل اور جان لیوا مسافت کے بعد جب میں اپنے کوہ نورد ساتھیوں کے ہمراہ درۂ نلتر کی تقریباً سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر ٹھٹھرتا تھا اور ہم لوگ گلیشیر کو عبور کرنے کے لیے برف باری کے تھمنے کا انتظار کر رہے تھے' تو ایک بزرگ پورٹر شیر باز نے بھی' خلیفہ خلفشاری نے جو کچھ کہا تھا' اسی انداز میں ہو بہو وہی بات کی اور کہنے لگے۔ "صاحب! آپ سب لوگ اپنی بیویوں سے ڈرتا ہے ناں......؟" ہم سب نے اپنی جیکٹوں پر جمع شدہ برف کو جھاڑا اور حیرت سے شیر باز کی جانب دیکھا۔ "شیر باز! یہ آپ کیسے کہتا ہے؟"

"یہ ہمارا تجربہ ہے صاحب......" وہ اپنے پھٹے ہوئے کمبل میں ٹھٹھرتا ہوا بولا۔ جبکہ اس کی سفید داڑھی برف کی وجہ سے مزید سفید ہو رہی تھی۔ "دیکھونا آپ لوگ ادھر پنجاب میں صاحب لوگ ہو' کھاتے پیتے لوگ ہو تو ادھر پہاڑوں میں کیا کرنے آتے ہو...... پرسوں نلتر جھیل سے پہلے جو برفانی نالہ تھا' اسے کراس کرتے ہوئے تم ڈوبنے لگے

تھے...... کل یہ حسن صاحب گر گیا اور اسے چوٹ آئی...... یہ میاں صاحب ایک یاگ کو قریب سے دیکھ رہے تھے تو اس نے ٹکر مارنے کی کوشش کی...... عامر صاحب ایک ایسی پگڈنڈی پر چل رہے تھے جو پاکھورا نالہ سے ایک کلومیٹر اوپر آسمان میں تھی اور جب ان کا پانی کا بوتل کندھے سے کھسک کر نیچے گیا تو نظر نہیں آیا...... اگر یہ گرتا تو یہ بھی نظر نہ آتا تو اتنی مصیبتوں سے ادھر سفر کرتا ہے...... رات کو ٹینٹ میں لیٹ کر ہائے ہائے کرتا ہے تو کیوں کرتا ہے...... اس کا ایک ہی وجہ ہے کہ آپ لوگ اپنی بیویوں سے ڈر کر ادھر آجاتا ہے کہ یہ مصیبت بیوی کی مصیبت سے کم ہوتا ہے۔''

''شیر باز! تم کیوں ادھر آتا ہے؟'' کسی نے بھنا کر پوچھا۔

''ہم تو روزی روزگار کی مجبوری سے آتا ہے...... بوجھ اٹھاتا ہے تو پیسہ ملتا ہے...... تمہیں کیا ملتا ہے؟''

''ہمیں...... ؟'' سب نے اپنے سر کھجائے کہ کیا جواب دیا جائے۔

''شیر باز! ہم یہاں خدا کی قدرت دیکھنے آتا ہے''۔

''خدا کی قدرت تو ہر جگہ ہوتی ہے صاحب...... نیچے گلگت اور ہنزہ میں بھی ہوتی ہے تو ادھر آکر جان کو کیوں خطرے میں ڈالتا ہے؟''

''شیر باز! ہم بہادر لوگ ہیں...... پہاڑوں پر چڑھتا ہے۔''

''چھوڑو صاحب...... ذرا خطرہ ہوتا ہے تو ہم سے لپٹ جاتا ہے کہ شیر باز ہمیں بچالو...... چھوٹا سا نالہ آتا ہے تو آپ کا رنگ اڑ جاتا ہے...... پتھر کا راستہ آتا ہے تو آپ کا ٹانگ کانپتا ہے...... گلیشیر آجائے تو ہمارا ہاتھ پکڑ کر چلتا ہے...... آپ کیسا بہادر لوگ ہے۔''

سب نہایت شرمندہ ہوئے کہ شیر باز بالکل درست کہتا تھا۔ تو کیا واقعی ہم لوگ بیویوں سے فرار ہو کر ان پہاڑوں میں دھکے کھا رہے تھے؟ ہم سب نے حسن کی جانب دیکھا جس کی بیگم اس کا اتنا خیال رکھتی تھی کہ ہم سب اس سے حسد کرتے تھے اور وہ بھی ہر بات پر اپنی بیوی کی یاد میں آہیں بھرتا تھا...... جہاں جاتا تھا' اس کی نظر کسی پی سی او کی تلاش میں بھٹکتی رہتی تھی' یہاں تک کہ دیوسائی کے وسیع اور بلند ویرانوں میں بھی اسے آس رہتی تھی کہ شاید یہاں ریچھوں کے لیے کوئی پی سی او قائم ہو جس کے ذریعے بیگم سے بات

ہو جائے...... اکثر صبح فون کر کے دوپہر تک بے قرار ہو جاتا تھا کہ چار گھنٹے ہو گئے ہیں' بیگم سے بات نہیں ہوئی تو کم از کم حسن تو بیوی سے فرار ہو کر پہاڑوں میں نہیں آیا تھا۔

''کیوں حسن...... ؟'' میں نے پوچھا۔

حسن ذرا شرما گیا۔ ''ایسی تو کوئی بات نہیں تارڑ صاحب...... لیکن......''

''لیکن کیا...... ؟'' سب نے بہ آواز بلند کہا۔

''لیکن کبھی کبھی انسان محبت کی زیادتی سے بھی تو فرار حاصل کرتا ہے...... کچھ سانس تنہائی میں لینا چاہتا ہے۔''

یہ ہم سب کے لیے ایک حیران کن خبر تھی کہ شیر باز کا تجزیہ حسن کے بارے میں بھی کسی حد تک درست تھا...... لیکن اس نازک مقام پر خان سلیم سامنے آیا اور سینہ ٹھونک کر کہنے لگا۔ ''شیر باز بالکل درست کہتا ہے' ہم لوگ اپنی بیویوں سے فرار ہو کر یہاں آئے ہیں۔''

''خان سلیم ذرا باقی دوستوں کو وہ فقرے سناؤ جو تم نے اپنی نئی نویلی بیوی پر کسے تھے اور جن کے نتیجے میں تمہاری ازدواجی زندگی شروع سے ہی خطرے میں پڑ گئی تھی''۔ میں نے مسکراتے ہوئے درخواست کی۔

''آپ جانتے ہیں میں پکا لاہوریا ہوں...... فقرہ زبان پر آجائے تو روک نہیں سکتا' شادی ہوئی اور بیگم ڈاکٹر بھی تھیں اور خوش شکل بھی...... ان دنوں میرے پاس ایک پرانی کار تھی جو ظاہر ہے ایئر کنڈیشنڈ نہیں تھی...... ہم دونوں نوبیاہتا میاں بیوی شام کو کھانے کے لیے نکلے اور ایک چوک میں رُکے تو برابر میں ایک نئی ایئر کنڈیشنڈ گاڑی آن رُکی اور اس میں بھی ایک نوبیاہتا جوڑا تھا' میری بیوی کہنے لگی۔ ''دیکھیں ان کی کار بھی نئی ہے اور ایئر کنڈیشنڈ بھی ہے''۔ تو میں نے کہا۔ ''اس کی بیوی بھی تو دیکھو...... وہ بھی تو خوبصورت ہے''۔ اس پر میری بیوی مکمل طور پر روٹھ گئی' بڑی مشکل سے منایا لیکن انہی دنوں ایک روز وارڈ ڈیوٹی کے بعد گھر لوٹی تو کہنے لگی۔ ''آپ تو یونہی باتیں کرتے رہتے ہیں' آج میرے وارڈ کے مریضوں نے میری بڑی تعریف کی کہ ڈاکٹر صاحب آپ تو بڑی پیاری لگ رہی ہیں......'' اس پر میں نے کہا۔ ''کیوں آج تمہاری ڈیوٹی اندھوں کے وارڈ میں تھی''۔ ظاہر

ہے اگلے دو ہفتے وہ مجھ سے نہیں بولی' لیکن اب اسے احساس ہو رہا ہے کہ میں ہوں ہی ایسا...... لیکن اب وہ پروا نہیں کرتی کہ ماشاء اللہ دو بچے ہیں اور وہ دونوں مجھ پر فقرے کستے ہیں...... بس میں بھی بیوی سے فرار ہو کر پہاڑوں میں آیا ہوں"۔

درہ خلتر پر برف باری میں کمی آ گئی اور ہم اسے عبور کرنے کے لیے سامان اٹھانے لگے۔ ویسے ہم نے تو بیویوں کے بارے میں کبھی نہیں سوچا کہ وہ ہم سے تنگ آ کر کہاں جاتی ہیں...... زیادہ سے زیادہ کچن میں...... یا پھر میکے چلی جاتی ہیں۔

ممانی جو چھپکلی کو "لزرڈ" کہتی ہیں...!

خیر سے ان دنوں انگریزی بولنے کا بڑا رواج ہے اور ایسی انگریزی بولنے کا جو جتنی گرامر کی حدود سے باہر ہوگی' اتنی ہی اعلیٰ پائے کی سمجھی جاتی ہے۔ مجھے اس رواج سے بڑی تشویش ہے کیونکہ میری انگریزی شروع ہی سے قدرے ناتواں رہی ہے' اسے بہتیرے انگریزی ناول اور اخبار پلائے لیکن یہ صحت مند نہ ہو سکی' یہاں تک کہ یورپ میں طویل قیام کے باوجود کوئی افاقہ نہ ہوا۔ ابھی پچھلے دنوں ایک غیر ملکی ادیب کو بتانا یہ چاہتا تھا کہ ہمارے ملک میں تیتر' بٹیر' مرغابیاں اور بگلے بہت ہوتے ہیں لیکن حرام ہے کہ ان میں سے کسی ایک کی بھی انگریزی دماغ میں آئی ہو چنانچہ صرف "ووئی ہیو مینی برڈز" پر ہی اکتفا کیا۔ سکول کے زمانے میں جب انگریزی کے ماسٹر صاحب نے محاورے سکھائے تو میں نے ذرا ہونہار شاگرد بننے کے لیے ان سے پوچھا کہ ماسٹر جی! ایک کریلا دوسرا نیم چڑھا کی انگریزی کیا ہوتی ہے......؟ ماسٹر صاحب نے تھوڑی دیر سر کھجا کر کہا کہ انگریزی میں کریلے نہیں ہوتے اور چونکہ مجھے کریلے بے حد پسند ہیں' اس لیے ایک ایسی زبان سے میرا نباہ نہ ہو سکا' جس میں کریلے ہی نہیں ہوتے۔

ٹیلیویژن بھی جب سے پی ٹی وی ورلڈ ہوا ہے' سوائے انگریزی کے اور کچھ نہیں بولتا اور بولتا بھی "کبوتر انگلش" ہے جسے شاید "پجن انگلش" بھی کہتے ہیں...... ایک زمانے میں ہر میزبان' خبریں پڑھنے والے یا اناؤنسر کے شین' قاف میں مسلسل کیڑے نکالے جاتے تھے لیکن اب چونکہ سب انگریزی بولتے ہیں' اس لیے کوئی بھی کچھ بھی نہیں نکالتا...... یہاں تک کہ ان میں سے تو مطلب بھی نہیں نکلتا...... اگر اس انگریزی کو انگریز حضرات کو سنایا جائے تو ایسے غش میں جائیں کہ متعدد کھلخے سونگھانے کے باوجود مجال ہے جو ہوش میں

آ جائیں۔ پہلے نشریات کا آغاز ہوتا تھا تو ایک شرمیلی سی خاتون السلام وعلیکم ناظرین سے آغاز کرتی تھی‘ اب یہ ہوتا ہے کہ کوئی پٹاخہ سی چیز ”ہائے یو گائز“ کہہ کر بات شروع کرتی ہے اور اگر آپ احتیاط نہ کریں تو وہ سکرین سے نکل کر آپ کی گود میں آ بیٹھے گی اور گدگدیاں کرنے لگے گی...... ریڈیو کی ایف ایم نشریات میں بھی یہی حال ہے...... اتنی تیزی سے انگریزی بولتے ہیں کہ اکثر اوقات انگریزی پیچھے رہ جاتی ہے اور وہ آگے نکل جاتے ہیں۔

اُن صاحب کی بہت یاد آتی ہے جنہیں انگریزی ذرا مناسب ہی آتی تھی‘ انگلستان میں ایک ریستوران میں گئے اور مینو پر یونہی انگلی چلا کر آرڈر دے دیا۔ خوراک آئی تو بہت مزیدار تھی اس لیے کہنے لگے۔ ”اینڈ برنگ“ یعنی ”اور لاؤ“ پھر کھانے سے فارغ ہو کر بولے۔ ”برنگ میتھے بینگ“ یعنی ”حساب لے آؤ“۔ اس زمانے میں اسے لطیفہ سمجھا جاتا تھا جو اَب حقیقت بن چکا ہے کیونکہ ٹیلیویژن اور ریڈیو پر اسی نوعیت کی انگریزی کا چلن ہے...... یہاں تک کہ اور یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ فقیر کو خیرات دیں تو وہ بھی ”تھینک یو سر“ کہتا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلیویژن تک تو خیریت رہی لیکن اب ایک نئی قسم کی انگریزی خوانچہ فروشی چل نکلی ہے...... آپ ٹریفک کی روشنی سرخ ہونے پر چوک میں کھڑے ہیں تو قمیض‘ پتلون اور ٹائی میں ملبوس ایک صاحب آ کر کہیں گے ”سر کٹلری سیٹ...... بیسٹ ان دے مارکیٹ...... اونلی ٹو ہنڈرڈ“ اور پھر انگریزی میں اپنی تقریر جاری رکھیں گے...... اب مناسب نہیں لگتا کہ ایک ٹائی زدہ انگریزی بولتے نوجوان کو مایوس کیا جائے یوں بھی ”نہیں چاہیے بھئی“ کی انگریزی فوراً نہیں سوجھتی اور آپ وہ کٹلری سیٹ خرید لیتے ہیں...... گھر پہنچ کر پلاسٹک کا کور کھولتے ہیں تو دو چھوٹی سی چھریاں برآمد ہوتی ہیں...... اسی طور پچھلے ہفتے گھنٹی بجنے پر میں گھر سے نکلا تو دو نوجوان یوں بن ٹھن کر کھڑے تھے جیسے ملکہ الزبتھ کے ڈنر پر جا رہے ہیں اور یاد رہے کہ لاہور کی گرم دوپہر میں...... میں نے مسکرا کر ”فرمائیے“ کہا تو انہوں نے دو پیکٹ آگے کر کے انگریزی میں دریا بہا دیئے...... کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیا کہہ رہے ہیں‘ اس لیے میں نے درخواست کی کہ بھئی آسان زبان میں بتاؤ کہ کیا بیچ رہے ہو...... کہنے لگے ”کوکیز سر!“ میں نے ڈبوں کو غور سے دیکھ کر کہا ”لیکن ان میں تو بسکٹ ہیں“۔ کہنے لگے ”نہیں سر! یہ بسکٹ نہیں کوکیز ہیں۔“

میں اپنی جہالت پر سخت شرمندہ ہوا اور سو روپے کے دو ڈبے کوکیز کے خرید لیے...... کمرے میں آ کر انہیں کھولا تو نہایت واہیات سے بسکٹ تھے...... ہمارے زمانے کے بسکٹ اب کوکیز ہو گئے ہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں...... جیسے نائی ہیئر ڈریسر ہو گئے اور موچی کوبلر ہو گئے ہیں۔

آج صبح پارک میں سیر کرتے ہوئے ایک پروفیسر دوست سے اسی موضوع پر کچھ تبادلۂ خیال ہوا تو کہنے لگے۔ ہاں یہ حقیقت ہے کہ ان دنوں ہر کوئی انگریزی بولتا ہے اور بے دریغ بولتا ہے لیکن اس سلسلے میں یعنی انگریزی بولنے میں میرے ایک سٹوڈنٹ نے ایک عجیب ریکارڈ قائم کیا ہے...... میں پچھلے برس اپنے طالب علموں کا ایک گروپ لے کر گلگت جا رہا تھا کہ راستے میں کھانے کے لیے بشام میں رُکے‘ نام جتنا خوبصورت ہے‘ اسی مناسبت سے بشام کے بازار کے ہوٹل گندے ہیں...... وہاں کھانا جو کھایا‘ اسے پورا گروپ بعد میں لوٹوں کے ساتھ بھگتتا رہا‘ بہرحال یہ داستان اور ہے تو جناب بشام کے ہوٹل میں ایک انگریز جوڑا نہایت مشکل سے چائے کے ساتھ چپاتیاں نگل رہا تھا...... آپ جانتے ہیں کہ نوجوانوں کو غیر ملکیوں سے گپ شپ لگانے کا شوق ہوتا ہے چنانچہ میرا ایک طالب علم اٹھ کر ان کے پاس چلا گیا اور ان سے گفتگو کرنے لگا...... ہمیں تشویش تب ہوئی جب وہ بہت دیر تک ان سے گفتگو کرتا رہا کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ نوجوان انگریزی زبان میں بالکل پیدل ہے اور حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ وہ بے تکان اور مسلسل بول رہا ہے‘ یہاں تک کہ انگریز جوڑا بھی کبھی ہنستا تھا اور کبھی خوش ہو کر اس سے ہاتھ ملاتا تھا اور مجھ تک اس کا جو ایک آدھ فقرہ پہنچتا تھا‘ وہ گرامر کے لحاظ سے بھی بالکل درست ہوتا تھا‘ بالآخر جب وہ واپس آیا تو میں نے پوچھا اشتیاق! بھئی آج تو تم نے مجھے بھی متاثر کر دیا ہے یہ تو بتاؤ کہ آخر اتنی طویل گفتگو جو کر رہے تھے تو کیا کر رہے تھے؟

”سر جی! پہلے تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ وہاٹ از یور نیم؟ تو میں نے جواب دیا ”مائی نیم از اشتیاق احمد“۔ پھر انہوں نے پوچھا ”وہاٹ از یور فادرز نیم؟“ میں نے فوراً جواب دیا۔ ”مائی فادرز نیم از مشتاق احمد...... ہی از اے شاپ کیپر...... ہی از اے ویری کائنڈ فادر...... ہی از......“ اور اس کے بعد میں نے انہیں ”مائی فادر“ والا پورا جواب مضمون

تین صفحوں کا سنا دیا...... پھر انہوں نے پوچھا کہ ''آر یو گوئنگ فار ہالیڈے؟'' تو میں نے ''سمر ہالیڈے'' والا چار صفحے کا مضمون سنایا...... سر جی مجھے جتنے جواب مضمون آتے تھے' ان کو سنا آیا ہوں۔''

انگریزی بولنے سے مجھے ایک عزیز دوست کی ممانی صاحبہ یاد آ گئیں...... ممانی صاحبہ ماشاء اللہ ماموں جان کی تیسری بیگم ہیں...... پہلی دو بیگمات قضائے الٰہی سے ادھر اپنے گھر سے رخصت ہوئیں اور پھر ماموں کے گھر سے رخصت ہو گئیں...... چونکہ تیسری بیوی کی حیثیت کے لیے رشتہ مشکل سے دستیاب ہوتا ہے خاص طور پر جب پچھلا ریکارڈ اتنا خراب ہو تو موجودہ ممانی صرف چار جماعتیں پاس ہی دستیاب ہوئیں...... ادھر ماموں کا گھرانہ پڑھا لکھا تھا تو ممانی نے بھی انگریزی کی مار دینی شروع کر دی' کوئی لفظ کہیں سے بھی سنا تو فوراً یاد کر کے اگلی بار داغ دیا خاص طور پر ٹیلیویژن کی ماڈرن کمپیئرز سے بہت کچھ سیکھا اور ہر ایک کو چاہے وہ مرد ہو یا عورت...... ''ہائے یو گائز'' کہہ کر مخاطب کرتیں' یہاں تک کہ سسر صاحب کے ساتھ بھی یہی طرز تخاطب تھا...... گڈ بائے کو ہمیشہ گڈ بائی بائی کہتیں...... اگر کوئی ان کی انگریزی درست کرنے کی کوشش کرتا تو بے حد خفا ہوتیں...... کھانا دیتے ہوئے ہمیشہ کہتیں کہ اگلے سیگمنٹ میں بینگن گوشت ہے...... ایک بار مجھے ان کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا تو کہنے لگیں...... آپ کے ہاں بھی لزرڈاں ہوتی ہیں...... میں نے کہا ممانی کبھی غور نہیں کیا...... کہنے لگیں ہم تو بہت تنگ آئے ہوئے ہیں' ہمارے ہاں تو بہت لزرڈاں ہیں' سوچ رہے ہیں ان کو کِل کر دیں...... دوست نے بتایا کہ ممانی نے کہیں سے چھپکلی کی انگریزی سیکھ لی ہے اور چھپکلیوں کو لزرڈاں ہی کہتی ہیں...... چیچوں کو شیونآں بھی کہتی ہیں...... ایک روز ایک دعوت میں لیو ٹالسٹائی کے مشہور ناول ''وار اینڈ پیس'' کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی اور ممانی باقاعدہ اس میں اپنی انگریزی ٹھونس رہی تھیں تو ایک ناواقف نے پوچھا کہ آپ نے یہ ناول پڑھا ہے؟ تو نہایت اعتماد کے ساتھ کہنے لگیں۔ ''نہیں یہ والا تو نہیں پڑھا......'' یعنی یہ ہرگز اقرار نہیں کیا کہ میں انگریزی نہیں جانتی بلکہ یہ تاثر دیا کہ بقیہ لیو ٹالسٹائی تو گویا حفظ ہے' صرف یہ ناول پڑھنے سے رہ گیا ہے...... خاندان میں ایک دادا جان بھی ہیں' ایک روز ان کی کوئی رشتہ دار خاتون انہیں ملنے آئیں' وہ گھر پر نہیں تھے'

جب واپس آئے تو ممانی ان سے کہنے لگیں۔ آپ کی ایک گرل فرینڈ آپ کو ملنے آئی تھی...... ممانی کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ ماموں جان کے لیے چوتھی بیگم کا حصول ممکن نہیں ہے۔

تو ان دنوں انگریزی کا بس اسی قسم کا چل چلاؤ ہے...... پچھلے کچھ عرصے سے وزیروں کو بھی اسی معیار پر پرکھا جا رہا ہے' پہلے تو ان کے بارے میں اطلاع ملتی تھی کہ فلاں وزیر بالکل اَن پڑھ ہیں...... فلاں امور خارجہ کے ایکسپرٹ ہیں اور فلاں مالیاتی امور میں اتھارٹی مانے جاتے ہیں لیکن ان دنوں جس وزیر کے بارے میں پوچھو تو جواب ملتا ہے کہ جناب کیا شاندار انگریزی بولتے ہیں' لہجہ تو بالکل انگریزوں جیسا ہے اور اپنے محکمے کے بارے میں کیا جانتے ہیں' اس کے بارے میں کچھ زیادہ علم نہیں۔

میں بھی ایک عرصے سے سوچ رہا ہوں کہ اردو کالم نویسی ترک کر کے انگریزی میں لکھنا شروع کر دوں اور معاشرے کی نظروں میں معتزز ہو جاؤں لیکن کیا کروں مجھے تیتر' بٹیر' مرغابیوں اور بگلوں کی انگریزی نہیں آتی...... میں تو صرف ''دوئی ہیو مینی برڈز'' ہی کہہ سکتا ہوں۔

پانی پلانے والے بابے کیا ہوئے

شادی کی طرح گرمی کے موسم کی بھی عادت نہیں ہوتی...... بلکہ گرما گرمی تو شادی کے بعد ہی شروع ہوتی ہے۔ ہر برس گرمی کا موسم آتا ہے اور پھر اس موسم میں چند ایک دن ایسے آجاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ کیا پچھلی زندگی میں بھی اتنی شدت کے کوئی دن آئے تھے اور اگر آئے تھے تو ہم جاں بحق کیوں نہ ہو گئے ابھی تک زندہ کیسے ہیں...... ان دنوں کتوں، بھینسوں اور گدھوں پر بڑا رشک آتا ہے کہ ہم یہ کیوں نہ ہوئے۔ کتے کو شدید گرمی لگتی ہے تو زبان باہر نکال کر مزے سے ہانپنے لگتا ہے۔ ہم سرے سے زبان باہر نکال ہی نہیں سکتے کہ سامنے بیگم براجمان ہوتی ہیں۔ بھلا ان کی موجودگی میں ہماری زبان کیسے حرکت میں آسکتی ہے۔ اکثر شادی شدہ مردوں کی زبان میں مسلسل غیر متحرک رہنے سے پھپھوندی لگ چکی ہوتی ہے...... بھینسوں کو بھی جب شدت گرمی ستاتی ہے تو وہ نزدیک ترین جوہڑ میں جا کر اپنے بدن پر کیچڑ کا لیپ لگا کر استراحت فرمانے لگتی ہیں۔ یہ بھی ہمارے بس سے باہر ہے...... البتہ آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ گدھے اس فہرست میں کیسے شامل ہو گئے۔ صرف اس لیے کہ وہ گدھے ہوتے ہیں اور انہیں گرمی لگتی ہی نہیں...... یقین نہ آئے تو کسی نزدیکی گدھے سے پوچھ لیجیے......

میں شاید اس گرمی کا رونا نہ روتا اگر معراج پتھر کی وہ حالت نہ دیکھتا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جیسی میری حالت اب ہے کبھی ایسی تو نہ تھی...... لیکن اس کا تذکرہ کچھ دیر کے لیے اٹھائے رکھتے ہیں۔ اتنی دیر میں ان زمانوں کو یاد کر لوں جب لاہور میں گرمی کی یہ حالت نہ ہوتی تھی اور اگر یہی حالت ہوتی تھی تو محسوس نہیں ہوتی تھی...... لاکھوں کی تعداد میں سیمنٹ اور لوہے کے مکان نہ تھے جو گرمی کو منعکس کر کے آپ کا بدن جلا دیتے

ہیں۔ کھلے علاقے تھے۔ لاکھوں کاروں اور رکشاؤں کے دھوئیں کا زہر نہ تھا...... مال روڈ واقعی ٹھنڈی سڑک تھی اور ایک شخص انارکلی سے چلتا ہوا لاہور کی نہر تک پہنچ جاتا تھا اور اسے دھوپ سے بچاؤ کے لیے چھتری تاننے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ تقریباً ہر چوک میں سبیل ہوا کرتی تھی۔ جانوروں کے لیے بھی اور انسانوں کے لیے بھی...... سبیلیں تو اب بھی اہل ثروت نے ثواب کمانے کی خاطر بنوا رکھی ہیں۔ لیکن ان میں سے بیشتر بغیر پانی کے ہوتی ہیں...... مال روڈ پر مسجد شہدا کے قریب فٹ پاتھ پر ایک بابا جی نے درجنوں مٹکے اور گھڑے ٹھنڈے پانی سے بھر کر سجا رکھے ہوتے تھے اور ہر راہ گیر کو پانی پلاتے تھے اور میں نے کبھی انہیں کسی سے کچھ وصول کرتے نہیں دیکھا ان کا اپنا شوق تھا...... میرے گھر کے قریب ایک بیگم صاحبہ نے اپنی کوٹھی کی دیوار میں ایک بہت بڑا الیکٹرک کولر لگوایا اور بیگمات کے کلب کی میٹنگ میں وہ اس عظیم کار خیر کا تذکرہ مسلسل کرتیں اور یہی کہتیں کہ میاں صاحب تو ریٹائر ہو گئے ہیں۔ محکمہ نہر میں انجینئر تھے اس لیے اللہ نے بہت کچھ دیا تو سوچا کہ ثواب کے کام کرنے چاہئیں...... یہ کولر ایک دو ماہ تو بخوبی چلتا رہا اور پھر بند ہو گیا...... بیگم صاحبہ کا کہنا تھا کہ ایک تو یہ غریب آدمی اور راہ گیر پانی بہت پیتے ہیں اور پھر چھوٹے چھوٹے بچے گھروں سے دیگچیاں لا کر ٹھنڈا پانی گھر لے جاتے تھے جو بہت زیادتی ہے...... اور پھر دوپہر کے وقت اتنے لوگ پانی پیتے تھے اور شور مچاتے تھے کہ ان کے ایئر کنڈیشنڈ بیڈروم میں بھی ان کی آوازیں آتی تھیں...... یہ سب کچھ تو ثواب کے لیے برداشت کیا جا سکتا تھا لیکن بجلی کا بل اتنا زیادہ آنے لگا کہ میاں صاحب نے اعتراض کر دیا کہ بھلی لوک میں نے بڑی مشکل سے اپنے بڑھاپے کے لیے ٹھیکیداروں سے کچھ حق محنت لیا تھا جو تم یوں لٹا رہی ہو...... چنانچہ وہ سبیل بند کر دی گئی...... مجھے مال روڈ والے بابا جی بہت یاد آئے...... لیکن انہیں بجلی کا بل ادا نہیں کرنا پڑتا تھا شاید اس لیے ان کے گھڑے اور مٹکے ان کی موت تک چلے۔

میرے بچے اب بھی اپنے کیتھڈرل سکول کے باہر ان بیٹریوں والے انکل کو یاد کرتے ہیں جنہوں نے اپنی دکان کے برآمدے میں متعدد کولر رکھے ہوتے تھے۔ چھٹی ہونے پر سینکڑوں بچے پیاس سے ہانپتے ہوئے اس دکان پر ہلا بول دیتے۔ انکل کا کاروبار درہم برہم ہو جاتا لیکن ان کے ماتھے پر ایک شکن نہ آتی اور وہ مسلسل کولروں کو ٹھنڈے پانی

سے بھرتے رہتے۔ بچے اب جوان ہو چکے ہیں اور جب بھی سکول کو یاد کرتے ہیں تو گولروں والے انکل کو بھی یاد کرتے ہیں اور انہیں دعائیں دیتے ہیں...... آج کل کے انکلز کو شاید دعاؤں کی ضرورت نہیں رہی اور وہ بچوں کو بھی پانی نہیں پلاتے۔

چنانچہ شادی کی طرح گرمی کے موسم کی بھی عادت نہیں ہوتی۔

یہاں تک کہ معراج پتھر کو بھی نہیں ہوئی تو لاہور میں اور کس کو ہوگی...... اس کالم کے تحریر کیے جانے کا اصل سبب معراج پتھر ہی ہے...... آج دوپہر ہمارا ایک مشترکہ دوست گھبرایا ہوا میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ تارڑ جی ذرا شتابی سے چلیے معراج پتھر نسبت روڈ کی ایک دکان کے تھڑے پر بیٹھا ہے اور عجیب بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے...... کبھی ہنسنے لگتا ہے اور کبھی بالکل چپ ہو جاتا ہے میں فوراً جائے واردات پر پہنچا تو معراج پتھر کو مشترکہ دوست کی رپورٹ کے عین مطابق پایا۔

"معراج کیا ہوا ہے......؟" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

اس نے میری جانب یوں دیکھا جیسے کسی اجنبی کو دیکھ رہا ہو اور پھر کہنے لگا......

"غرمی...... غرمی؟" میں سمجھ نہ سکا۔ "کیا مطلب؟"

"یہ گرمی کو نقاہت کے باعث غرمی کہے جا رہا ہے......" مشترکہ دوست نے بتایا اور یہ بھی بتایا کہ آج صبح سے معراج پتھر پانچ گلاس لسی، تین جگ تخم بالنگاں کا شربت، دو گلاس ستو کا شکر والا شربت، چار گلاس کالی گاجروں کا جوس پی چکا ہے اور اس کی گرمی ختم نہیں ہو رہی اور چونکہ یہ سب کچھ بازاری تھا اس لیے اس کا پیٹ بھی خراب ہو گیا ہے۔

"معراج کچھ ہوش کرو" میں نے اسے تسلی دی۔ "اس طرح گھبرایا نہیں کرتے...... گرمیاں ہر سال آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں۔"

"ناں......" اس نے انگلی کھڑی کر کے کہا۔ "ناں...... پہلے گرمی ہوتی تھی لیکن آج غرمی ہے...... یہ نہیں گزرے گی...... مجھے میانی صاحب بھیج کر ہی گزرے گی......"

میں بھی ذرا گھبرا گیا اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔ "معراج یار میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

"تم مجھ سے ٹھنڈی ٹھنڈی باتیں کرو......"

"ٹھنڈی ٹھنڈی؟"

"ہاں...... یہ جو تم ہر سال پہاڑوں پر جاتے ہو تو وہاں جو برف ہوتی ہے ہائے ٹھنڈی ٹھنڈی اور چشمے ہوتے ہیں اور بارش ہوتی ہے اس کی باتیں کرو یار...... بس یہی میرا علاج ہے۔"

چنانچہ میں اس کا علاج کرنے لگا...... "فیری میڈو میں اس وقت نانگا پربت کی برفوں کی سردی اتر رہی ہوگی۔ جنگل میں یخ پانیوں کے چشمے چل رہے ہوں گے......"

"ہائے ہائے۔" معراج نے دوہائی دی۔ "مجھے نانگا پربت پر لے چلو...... ان چشموں میں ڈبکیاں لگانے دو۔"

"پانی بہت برف سرد ہوتا ہے...... نہانے سے نمونیا ہو جاتا ہے......"

"ہو جائے...... نمونیا ہو جائے تو سردی لگتی ہے...... غرمی تو نہیں لگتی...... اور سناؤ...... اور سناؤ۔"

چنانچہ میں نے کچھ سچی کچھ جھوٹی ٹھنڈی ٹھنڈی باتیں سنائیں...... جھیل صدپارہ، سیف الملوک اور کرومبر کے پانیوں کی یخ بستگی کا احوال سنایا...... وادیٔ سوختر آباد میں جو سرد پانیوں کے تالاب ہیں اور وادیٔ شمشال کے راستے میں جو خنک ندیاں ہیں ان میں نہانے کے لطف کو بیان کیا...... اس دوران وہ مسلسل ہائے ہائے اور غرمی غرمی پکارتا رہا...... اور جب میں نے راکاپوشی سے اترنے والے ننھے آبشاروں کے نیچے اشنان کرنے کا تذکرہ کیا تو حیرت انگیز طور پر اس کی حالت بہتر ہونے لگی۔ اور جونہی میں نے اسے دنیا کی سب سے حیرت انگیز برفانی جھیل "سنو لیک" کے بارے میں بتایا تو وہ باقاعدہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ "یار تم نے تو میرے سینے میں ٹھنڈ ڈال دی ہے...... میں بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں...... اب تم یوں کرو کہ جب تک یہ جہنمی گرمی جاری ہے تم روزانہ میرے پاس آ کر ٹھنڈی ٹھنڈی باتیں کیا کرو......"

میں معراج پتھر کو بحال کر کے گھر آیا تو پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ میں نے صرف یہ جاننے کے لیے کہ کیا لاہور میں کبھی لوگ گرمی کی شدت سے حواس باختہ ہو چکے ہیں اپنے ایک جاننے والے جے جے جمال کو فون کیا۔ "کیوں بھئی جمال گرمی کا کیا حال ہے؟"

نے جڑیں نہیں پکڑیں کہ سیاست کے شعبہ میں ہر نام کا آدمی...... ایک ہی کافی ہے۔ جیسے پٹرول ڈلواتے ہوئے موٹر سائیکلسٹ کہتا ہے کہ...... ایک ہی کافی ہے۔

اداکاراؤں اور مصنفین کو ہم یوں بھی اس قابل نہیں سمجھتے کہ اُن کے ہو بہو ہونے پر فخر کر سکیں...... ہم میں سے...... نہیں ہماری خواتین میں سے کون ہے جو انجمن یا مسرت شاہین ہونا پسند کرے۔ پسند بھی کرے تو اتنا وافر گوشت کہاں سے لائے۔

بہرحال بات شروع ہوئی تھی اُس ٹیلی وژن پروگرام سے جس میں انسان کتے ہو رہے تھے۔ یہ بھی ایک کتا ہو بہو پروگرام تھا۔ اس میں جن خواتین و حضرات نے شرکت کی وہ اپنے ہمراہ اپنے کتے لے کر آئے تھے اور بڑے فخر سے ناظرین کو بتا رہے تھے کہ یہ دیکھئے میرا منہ اور چہرہ میرے ڈارلنگ کتے سے کتنا ملتا ہے۔ ذرا ملاحظہ کیجئے کہ میری کتیا کی ناک اور میری ناک میں کوئی فرق نہیں۔ بعض کے تو کان بھی ایک جیسے تھے۔ ایک ایسے صاحب بھی اپنے کتے کے ہمراہ آئے کہ پروگرام کے میزبان کو بھی کچھ پتہ نہ چلا کہ ان میں سے کون سا کتا ہے اور کون سا انسان ہے۔ جب اُن میں سے کوئی ایک بولا تو معلوم ہوا کہ او ہو یہ والا بھونکتا نہیں بات کرتا ہے تو یہی انسان ہوگا...... یہ وہ باکمال لوگ تھے جنہوں نے ایسے کتے تلاش کئے جو اُن کی شکل کے تھے...... یا پھر انہوں نے کوئی ایک کتا حاصل کیا اور پھر دن رات کی محنت شاقہ کے بعد اپنی شکل اُس جیسی بنالی۔ ایسے لوگ جانے ہمارے ہاں کب پیدا ہوں گے۔

اس پروگرام سے پیشتر میں نے چین میں ہونے والے ایک ہو بہو کی رپورٹ بھی دیکھی تھی لیکن اس میں کتوں کی بجائے بلیاں تھیں۔ ان بلیوں کی ہو بہو چینی خواتین تھیں۔ چینی خواتین کو بلیوں کے ہو بہو ہونے میں یہ آسانی رہتی ہے کہ ان کی ناکیں چپٹی ہوتی ہیں اور آنکھیں بھی ذرا ترچھی ہوتی ہیں۔ اُن میں ایک دو خواتین کی شکل تو ان کی پالتو بلیوں سے اتنی مشابہ تھی کہ شک ہوتا تھا کہ یہ شاید اصل میں بلیاں ہیں جو خواتین کے گیٹ اپ میں ہیں۔ آئندہ اگر کبھی چین جانے کا اتفاق ہوا تو مجھے بے حد احتیاط کرنی ہوگی کہ آپ جس بلی کو "ماؤں بلی ماؤں بلی" کہہ کر پچکار رہے ہیں اور پیار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ بلی نہ ہو۔

ان ہو بہو مقابلوں میں جیتنے والوں کو ہزاروں ڈالر انعام میں بھی ملتے ہیں تو یہ فارن ایکسچینج کمانے کا کتنا نادر موقع ہے جس پر ہم نے کبھی توجہ ہی نہیں کی۔ میرا خیال ہے کہ

ہنگامی بنیادوں پر ایک وسیع پیمانے پر پورے ملک میں ایسے لوگوں کو تلاش کیا جائے جو کسی نہ کسی جانور یا مشہور شخصیت کے "ہو بہو" ہوں۔ ایسے لوگ جو کتے لگتے ہوں۔ گدھ دکھائی دیتے ہوں۔ بلیاں معلوم ہوتی ہوں...... اُلوؤں کے "ہو بہو" بہت آسانی سے مل جائیں گے کیونکہ اس ملک میں تو ہر شاخ پر اُلو بیٹھا ہے۔ شیروں کی بھی کوئی کمی نہیں ہوگی۔ شیر اسلام۔ شیر پاکستان تو مل ہی جاتے ہیں ہم شیر دادو یا شیر صوابی بھی تلاش کر سکتے ہیں۔ اس میں ہمیں خیال رکھنا پڑے گا کہ کہیں ہو بہو کی تلاش میں ہم سچ مچ کے جانور نہ پکڑ لائیں۔ یہ "ہو بہو" قوانین کی سخت خلاف ورزی ہوگی۔ چنانچہ ان "ہو بہو" لوگوں کو تلاش کر کے اُن کا ذخیرہ کر لیا جائے اور جونہی کسی بھی ملک میں کسی بھی قسم کے "ہو بہو" مقابلے کا اعلان ہو تو فوری طور پر اسے ذخیرے میں سے...... ہو بہو نکال کر انہیں مقابلے کے لیے روانہ کر دیا جائے۔ اور وہ یقیناً جیتیں گے کہ پاکستانی گدھوں اور اُلوؤں کا دُنیا بھر میں کوئی اور ثانی نہیں...... بہ فرضِ محال ہم وسیع پیمانے پر ایسے لوگوں کو تلاش نہیں کر سکتے تو پھر ہمیں ملک بھر کے مختلف شعبہ کے لوگوں وغیرہ سے رجوع کرنا ہوگا کہ وہ ملکی ترقی کے لیے آگے بڑھیں اور ایک گدھ، گدھے یا اُلو کا کردار ادا کر کے ہمارا سر فخر سے بلند کر دیں۔ اور اس میں اُنہیں کوئی دشواری نہ ہوگی۔

کسی عظیم سائنس دان کی تھیوری ہے یا شاید میری اپنی ہی تھیوری ہے کہ آپ کسی بھی انسان کو غور سے دیکھتے رہیں تو لامحالہ وہ کسی نہ کسی جانور سے مشابہ ہوگا۔ یہ مشابہت سرسری بھی ہو سکتی ہے کہ ایک صاحب کو دیکھتے جائیے، دیکھتے جائیے اور کوئی ایک لمحہ ایسا آئے گا کہ وہ پل بھر کے لیے اونٹ دکھائی دینے لگیں گے اور پھر فوراً ہی انسان ہو جائیں گے۔ یا پھر یہ مشابہت دائمی بھی ہو سکتی ہے یعنی آپ نے اپنے کسی دوست کے چہرے کو نہایت غور سے دیکھا تو وہ کچھ دیر کے بعد لومڑ دکھائی دیتا رہے گا۔ اگر آپ گہرے دوست ہیں تو آپ اُس کو "ابے او لومڑ" کہہ کر پکار سکتے ہیں۔ اگرچہ اس پکار کے بعد خدشہ ہے کہ دوستی کی گہرائی میں واضح کمی آ جائے گی کہ کون سا ایسا شریف آدمی ہے جو ساری عمر...... ابے او لومڑ کہلانا پسند کرے۔ مجھے شک ہے کہ یہ جو عام طور پر کسی شخص کو "ابے اوگھا مڑ" کہا جاتا ہے یہ بھی ابے او لومڑ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ چنانچہ آئندہ اگر کوئی دوست یا عزیز آپ کو گھامڑ کہے تو فوری طور پر نزدیک ترین آئینے میں اپنے آپ کو ملاحظہ کیجئے کہیں آپ لومڑ سے

مشابہ تو نہیں ہو گئے...... غور سے دیکھنے پر کسی انسان کا چہرہ کسی نہ کسی جانور سے تب مشابہ ہوتا ہے جب آپ کی نیت درست ہو اور آپ صدق دل سے اُس چہرے میں کوئی جانور تلاش کرنا چاہیں۔ اگر آپ کی نیت میں فتور ہے تو پھر یہ تجربہ کامیاب نہیں ہو گا......

اسی تھیوری کو اُلٹا دیجئے تو بھی اس کے حیرت انگیز نتائج نکلتے ہیں۔ یعنی آپ کسی بھی جانور کو تادیر دیکھتے رہیں (اگر وہ جانور آپ کو تادیر دیکھنے کی اجازت دے تو...... وہ حملہ آور بھی ہو سکتا ہے) تو آہستہ آہستہ وہ آپ کے کسی عزیز یا دوست یا کسی مشہور شخصیت میں بدل جائے گا۔ یعنی ایک لومڑ بھی آپ کو اپنا کوئی بیسٹ فرینڈ نظر آنے لگے گا۔ دراز قد اور لمبوترے منہ والے تو اکثر اونٹوں میں نظر آجاتے ہیں...... شتر مرغ بھی اگر آپ غور سے ملاحظہ کریں تو آپ کے سسرال والوں میں سے کسی نہ کسی سے مشابہ ہوں گے۔ ایک مگرمچھ پر غور کرتے ہوئے وہ کسی بڑے صنعت کار کا رُوپ دھار سکتا ہے۔ بھیڑوں میں آپ کو عوام الناس کی جھلکیاں عام ملیں گی بلکہ جب وہ باں باں کریں گی تو واضح طور پر تازہ حکمرانوں کے لیے "زندہ باد زندہ باد" کے نعرے سنائی دیں گے یا پھر وہ احتجاج کر رہی ہوں گی۔ بھیڑوں کے علاوہ عوام الناس کے چہروں کو آپ خرگوشوں میں بھی ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ سب سے زیادہ ورائٹی ادیبوں اور شاعروں میں پائی جاتی ہے۔ ان میں لگڑ بڑ، اود بلاؤ، چمگادڑیں اور اُلو وغیرہ آسانی سے تلاش کیئے جا سکتے ہیں۔

شاعروں کی شکلیں الگ ہوں گی اور صرف مشاعرے پڑھنے والوں اور جشن منانے والوں کے چہرے جدا ہوں گے۔ سب سے زیادہ پرابلم آپ کو سیاستدانوں اور حکمرانوں کے بارے میں ہو گی کیونکہ ان کے چہرے بدلتے رہتے ہیں چنانچہ کبھی آپ ایک نہایت شریف النفس بکرے میں انہیں دیکھتے ہیں اور کبھی کسی بھیڑیے کے رُوپ میں...... یہ آج تک طے نہیں ہو سکا کہ وہ کیا ہیں...... ذاتی طور پر میں آئینہ دیکھتے ہوئے اپنے چہرے پر غور کرنے سے اجتناب کرتا ہوں لیکن مجھے شک ہے کہ میں بھی گیدڑ اور گدھ کے درمیان میں کوئی شے ہوں۔ کاش! میں بھی کوئی مشہور "ہو بہو" ہوتا تو ممالک غیر میں جا کر ایسے مقابلوں میں حصہ لے کر ملک و قوم کا نام روشن کرتا۔

مستنصر حسین تارڑ کی کتابیں

خانہ بدوش (سفرنامہ)
ہنزہ داستان (سفرنامہ)
نکلے تیری تلاش میں (سفرنامہ)
سفر شمال کے (سفرنامہ)
نانگا پربت (سفرنامہ)
اندلس میں اجنبی (سفرنامہ)
کالاش (وادی کافرستان کا رومانی سفرنامہ)
یاک سرائے (سفرنامہ)
سنو لیک (سفرنامہ)
شمشال بے مثال (سفرنامہ)
دیوسائی (سفرنامہ)
کے ٹو کہانی (سفرنامہ)
چترال داستان (سفرنامہ)
کاروان سرائے (کالم)
ہزاروں ہیں شکوے (کالم)
گزارا نہیں ہوتا (کالم)
چک چک (کالم)
بے عزتی خراب (کالم)

نیپال نگری (سفرنامہ)
شتر مرغ ریاست (کالم)
دیس ہوئے پردیس (ناول)
پیار کا پہلا شہر (ناول)
پرندے (ناول)
قلعہ جنگی (ناول)
بہاؤ (ناول)
راکھ (ناول)
قربت مرگ میں محبت (ناول)
جپسی (ناول)
پکھیرو (بچوں کا ناول)
پرواز (ڈرامے)
سورت (ڈرامے)
کیلاش (ڈرامے)
شہپر (ڈرامے)
ہزاروں راستے (ڈرامے)
سیاہ آنکھ میں تصویر (افسانے)
پتلی پیکنگ کی (سفرنامہ)

Rs. 250.00

www.sang-e-meel.com
ISBN 969-35-1479-3
9 789693 514797